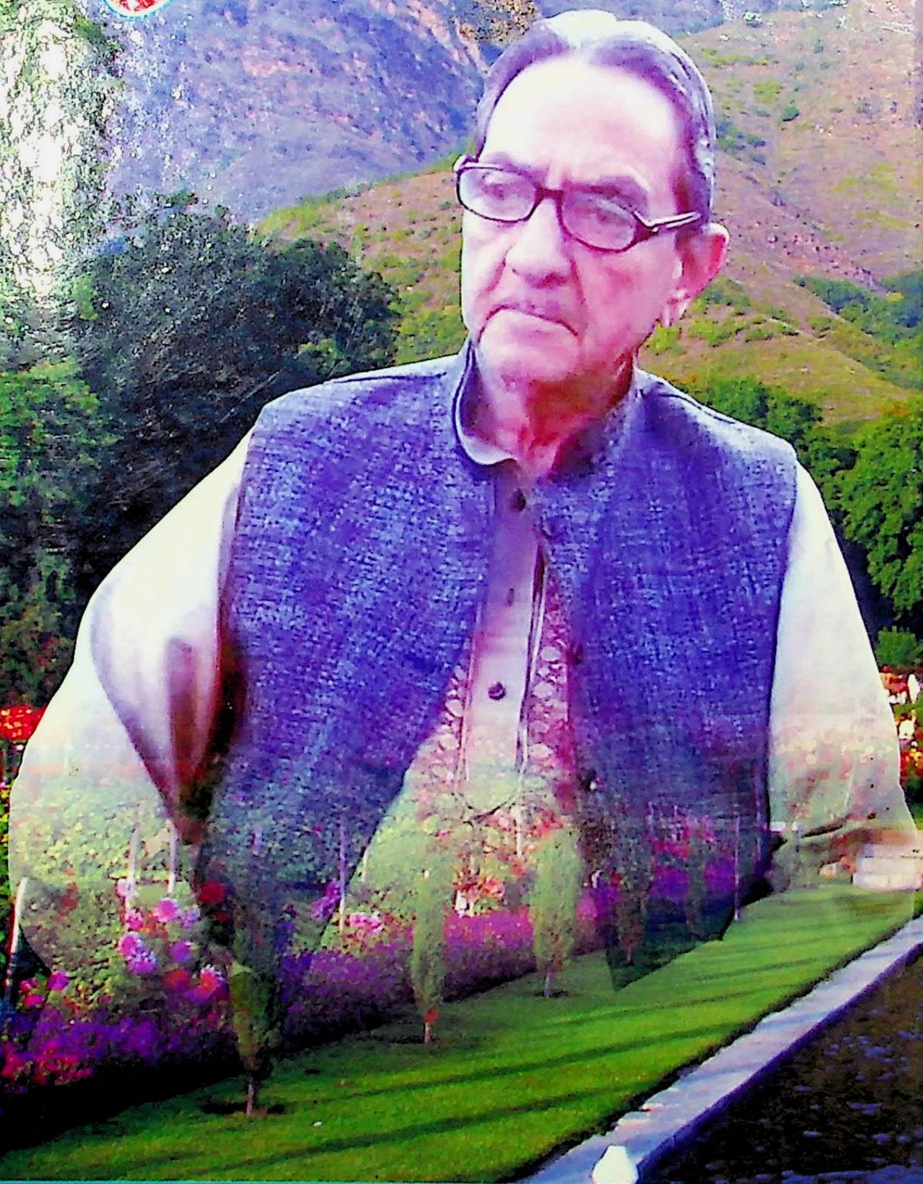
نور شاہ...... فکر اور فکشن



محمد اقبال لون

ISBN-978-93-80691-58-9

نام کتاب : نورشاہ......فکر اور فکشن

مرتب : محمد اقبال لون

سنہ اشاعت : ۲۰۱۷ء

قیمت :۴۵۰ روپیہ لائبریری ایڈیشن ۵۵۰ روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ : ایم۔بشارت احمد بابا

سرورق : عادل اسمٰعیل

ناشر : میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر کشمیر

............●●● ....

Title:- Noor Shah Fikr Aur Fiction

Author:- M Iqbal Lone

Publisher:- Meezan Publishers

Opp. Fire & Emergency Services HQRS, Batamaloo.

Srinagar 190009 Kashmir,

Tel : (O) 0194-2470851: Fax: 2457215

Cell: 9419002212, 8494002212,7006773403

E.mail:- meezanpublishers@gmail.com, rediffmail

انتساب

اپنی پیاری بہن آسیہ جان

اور

اپنے نورِ چشم محمد اسرار

کے نام

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

اقبالؔ

اپنے شفیق ساتھی اور معروف قلمکار جناب سلیم سالک صاحب کی خدمت میں

پیشِ خلوص

محمد اقبال لون

18-08-2017

نور شاہ

فکر اور فکشن

محمد اقبال لون

فہرست

ترتیب

عکس در عکس

نقد و نظر

تحفہ درویش

افسانے

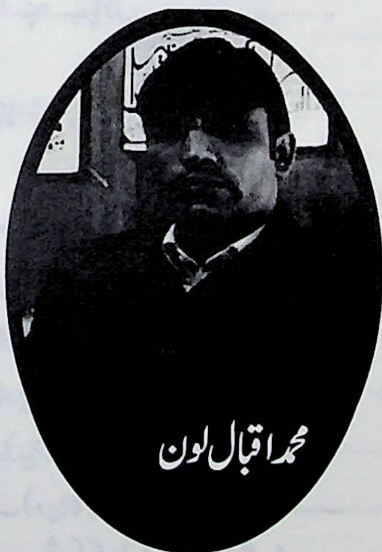
ڈراما

افسانچے

دیگر منتخب تحریریں

...........●●● ....


نورشاہ


محمد اقبال لون

پیش گفتار

نور شاہ کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے نمائندہ فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ناول، ریڈیو ڈرامے، خاکے، بچوں کے لئے کہانیاں، سیریل اور ڈائری بھی لکھی لیکن افسانہ نگار کی حیثیت سے انہیں خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے ہم عصروں میں علی محمد لون، اختر محی الدین، وحشی سعید، عبدالغنی شیخ، وید راہی، پشکر ناتھ، موہن یاور، وریندر پٹواری، حامدی کاشمیری، عمر مجید، تیج بہادر بھان وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ اپنے مواد، موضوعات اور طرز تحریر کے باعث نور شاہ نے اپنا مخصوص مقام پیدا کیا۔ ان کے افسانے اُردو فکشن میں اپنی انفرادیت کا پتہ دیتے ہیں جس کا اعتراف اُردو کے ممتاز ناقدین کو بھی ہے۔

نور شاہ نے جب لکھنا شروع کیا تو اس وقت جموں و کشمیر میں ترقی پسند تحریک کے اثرات کافی حد تک موجود تھے اور جدیدیت کا رجحان پروان چڑھنے لگا تھا۔ ابتدا میں نور شاہ ان تحریکوں سے متاثر تھے اور کچھ مثبت اثرات قبول کئے لیکن ان تحریکوں کو اپنے آپ پر حاوی ہونے نہیں دیا بلکہ اپنی راہ آپ نکالی۔ ریاست میں ان کا شمار افسانہ کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔

ریاست کے افسانوی ادب میں نور شاہ کی شخصیت ایک icon کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابتدا میں ان کے افسانوں پر رومانیت غالب رہی اور ارتقائی مراحل طے کر کے حقیقت نگاری کی طرف گامزن ہوئے۔ انہوں نے افسانوں کے لئے جو لب ولہجہ استعمال کیا وہ نہایت شگفتہ، پرزور اور دلچسپ ہے۔ ان کے افسانوں میں عبارت کی دل آویزی کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی مقصد یا سبق کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ ان کے مطابق اعلیٰ مقصد رومانوی لب ولہجہ اور لطیف

اسلوب میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔نور شاہ کی رومانیت کے حوالے سے پروفیسر قدوس جاوید نے کیا خوبصورت بات کہی:

''نور شاہ کے ابتدائی افسانوں میں تخلیق فن کی عام روش جمالِ فطرت سے قربت، شعورِ جسم (Body of Consicoususes) کی لطافت اور عام قارئین کی پسندیدگی کے سبب نور شاہ کی تخلیقت پر حسن پرستی اور رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور بعض ناقدین کی نظروں میں رومانیت نور شاہ کے فن کی بنیادی شناخت ہے۔''

اس تناظر میں نور شاہ اپنا موقف کچھ یوں بیاں کرتے ہیں۔

''میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں۔میرا سوچنا بجا بھی ہے کہ زندگی حسن وعشق سے عبارت ہے اور نسلِ آدم کی بقا ان ہی سے قائم ہے۔''

نور شاہ کے افسانوں کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں رومانی، سیاسی طنز وتضاد فقرے اور تلخ واقعہ نگاری کا رنگ نمایاں ہے، جس میں زندگی کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اگر ان کے افسانوں کا باریکی سے مطالعہ کریں تو یہ پاتے ہیں کہ نور شاہ کی نظر وہاں تک پہنچتی ہے جہاں عام لوگوں کی نظر نہیں پہنچتی ہے اور عام لوگ اگر اسے دیکھیں بھی تو نظر انداز کردیتے ہیں۔نور شاہ ان مسائل نظر انداز کرتے ہیں، نہ ان پر کوئی ڈھول ڈالتے بلکہ بے باک طریقے سے منظر عام پر لاتے ہیں۔انہوں نے جنس کو عام زندگی سے الگ نہیں کیا بلکہ اس کے پسِ پردہ زندگی کی ناہمواریوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔وہ اپنے افسانے کسی مخصوص نظریئے یا اخلاقی وتہذیبی مصلحت پسندی کے تحت نہیں لکھتے بلکہ ان سے آزادانہ زندگی کو اس کے اصل روپ میں پیش کرتے ہیں۔اس لئے ان کی کہانیوں میں سادگی بیان کے ساتھ جدت وتازگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ خود کو روایت کی جکڑ بندیوں میں بند ہونے نہیں دیتے ہیں۔ان کی افسانوی انفرادیت کے حوالے پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''ریاست میں نور شاہ اہم افسانہ نگار ہیں جو تجربہ پسندی اور جدت کاری کو بروئے کار لاتے

ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ وہ اپنے افسانوں کو روایت کی زنجیروں میں جکڑ بند ہونے نہیں دیتے بلکہ افسانے کے پہلے ہی جملے سے بیان کنندہ زندہ اور متحرک ہو جاتا ہے اور چند ہی جملوں کے بعد اپنے لکھنے والے کی تحکیم اور منشا کو مسترد کر کے خود اپنا راستہ بناتا ہے اور جو افسانہ خلق ہوتا ہے وہ زبان کی شگفتگی، جملوں کی خود تراشیدگی، شعریت آمیزی، طنز اور تضاد سے جمالیاتی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔اس تجربے میں متکلم یا راوی افسانے کی رگ و پے میں لہو کی طرح رواں ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتا ہے۔قاری کے لئے اس نوع کے افسانے کی تفہیم و تحسین کو کارگر بنانے کے لئے خود قرأت کے آداب میں تبدیلی لانا مستلزم ہے۔''

چونکہ افسانے میں عموماً منظر نگاری کی گنجائش نہیں ہوتی اور افسانے کا کینوا اس اتنا مختصر ہوتا ہے کہ زیادہ منظر کشی کے بغیر ہی بات کہی جاتی ہے لیکن نور شاہ نہ صرف یہ کہ منظر نگاری کرتے ہیں بلکہ منظر نگاری میں جزئیات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ان کے درجنوں افسانوں میں جزئیات نگاری کے عمدہ نمونے ملیں گے۔ وہ نہایت گہرائی اور تجرباتی نظر سے کام لیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کے افسانے ''لکیریں'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو جو منظر کشی کی لاجواب مثال ہے:

''ایک چہرہ میرے سامنے تھا۔دودھیا رنگ سے بھرے بھرے بے رنگ سادہ ہونٹ، چھوٹی ناک اور اس چہرے میں پوشیدہ معصومیت ، پاکیزگی اور تقدس ، وہ بچہ جس نے نہ دنیا دیکھی تھی اور نہ ہی دنیاداری، کراس فائرنگ میں اپنی جان کھو چکا تھا، اس کا کتابوں سے بھرا بستہ چھلنی ہو چکا تھا اور کتابیں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔''

افسانہ 'تجربہ' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''وہ دونوں خوب صورت تھے بے حد خوب صورت اور ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر محسوس ہوتا کہ ایک دوسرے کے بغیر ان کا جینا مرنا شاید ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے۔عالیہ کے گلابی گلابی اور ملائم ملائم گال، کشمیری سیبوں کی مٹھاس سے بھرپور سرخ

سرخ ہونٹ، بڑی بڑی بادامی آنکھیں، کالی کالی زلفیں اور گورا گورا سڈول جسم اس کی سندرتا میں اضافہ کرتے تھے۔ اختر علی بھی قد و قامت اور خدوخال سے مالا مال تھا۔ مضبوط توانا جسم، مخمور آنکھیں اور لمبے گھرے سنہرے بال اس کی خوب صورتی کا حصہ تھے.......... ان کی شادی ہوئے اب دس برس ہو چکے تھے اور ان دس برسوں میں شاید ہی ایسا لمحہ گزرا ہو گا جب ان دونوں کی محبت، ان کی شفقت اور ان کے پیار اور اعتماد کو کبھی کوئی ٹھیس لگی ہو لیکن اس بے پناہ پیار اور محبت کی دنیا میں وہ کائنات کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب اہم ضرورت اولاد سے محروم تھے۔"

درجہ بالا اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نور شاہ اپنے افسانوں میں منظر کشی کرنے میں طاق ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں اس طرح کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔ اُردو کے ممتاز افسانہ نگار دیپک بُدکی نور شاہ کی منظر نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اُن کے افسانوں کی ایک اہم خوبی منظر نگاری ہے۔ وہ قاری کے ذہن پر مطلوبہ منظر کا ہو بہو عکس بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اچھا ڈراما نگار ہونے کے سبب ان کے افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔"

نور شاہ ایک ایسے فنکار ہیں جن کا دل گرد و پیش میں ہونے والے ظلم و جبر، مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو دیکھ کر رو پڑتا ہے۔ وہ پیچ و تاب کھاتے ہیں لیکن مایوس نہیں ہوتے۔ وہ ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور روشن مستقبل پر ان کا یقین ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں 'کیسا ہے یہ جنون' اور 'کشمیر کہانی' میں اس نوعیت کی کافی مثالیں ملتی ہے، جہاں عورت اور فطرت کے حسن کی بات نکلتی ہے۔ ان کا قلم روانی سے چلنے لگتا ہے اور وہ حسین الفاظ اور تراکیب کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ وہ بڑی خوبصورت پیکر تراشی کرتے ہیں۔ ان کا قلم شاعری کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔

نور شاہ میں بے پناہ صلاحتیں موجود ہیں۔ وہ بسیار نویس ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی کہنے اور لکھنے کے گُر سے واقف ہیں۔ ان کی کہانی اپنی اچھوتی ساخت کی وجہ سے پہچانی جاتی

ہے۔ان کے افسانوں میں الفاظ کی بندش اور زبردست چستی پائی جاتی ہے۔وہ لمبے لمبے جملوں اور غیر ضروری بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ تفصیل میں جانے کے بجائے اشارے و کنایئے سے باتوں کو مکمل کر دیتے ہیں اور ہمیشہ اپنی کہانیوں کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں نظر آتے ہیں اور تمام تر توجہ کہانی اور کرداروں کی ہم آہنگی پر صرف کرتے ہیں۔وہ کہانی کے مقصدی پہلو کی ترسیل میں کسی بھی رکاوٹ کو حائل ہونے نہیں دیتے۔نور شاہ کہانی کے فنی لوازمات ہر حال میں قائم رکھتے ہیں۔اردو کے قد آور افسانہ نگار پشکر ناتھ نور شاہ کے حوالے لکھتے ہیں:

''نور شاہ ایک ایسی روح ہے جو ازل سے خوبصورتی کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر اس تلاش میں نور شاہ نے من کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔اپنے افسانوں میں نور شاہ نے زیادہ تر توجہ ماحول اور اس کی ترتیب اور کرداروں کے باہمی ربط اور اندازِ بیاں پر دی ہے۔''

افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ نور شاہ ایک باکمال خاکہ نگار ہیں ''کہاں گئے یہ لوگ'' اور ''جموں وکشمیر کے اُردو افسانہ نگار'' میں بہت ساری شخصیات پر خاکے لکھے گئے ہیں جن کا تعلق فلم، سیاست اور اردو ادب سے ہے۔ان خاکوں اور فلمی فیچروں سے نہ صرف ان شخصیات سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ نور شاہ کے پورے عہد کی عکاسی ہوتی ہے۔

محمد یوسف ٹینگ ان کی خاکہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''نور شاہ اردو ادب کے چابک دست، پختہ مشق اور صفِ اوّل کے افسانہ نگار ہیں...... ان کی بول چال اور سبھاؤ میں بڑی سہل پسندی ہے...... نور شاہ کی ان تحریروں میں شخصیات کی زندگی اور ان کے کارناموں کے بارے میں مفید حوالے ملتے ہیں اور ان پر خاص محنت کی گئی ہے۔خود میری معلومات میں بھی ان سے اضافہ ہوا...... شخصیات کے امتیاز کو ابھارنے کے لئے دوسرے اہم قلم کاروں کی مختصر سہی مگر بہت برجستہ آرا اُدرج کی گئی ہیں اور کبھی کبھی تو اس طرح آراء پڑھنے کو ملتی ہیں جنہیں (Quoteabte Quotes) ہی کہا جا سکتا ہے۔''

نورشاہ ایک جنیوئن تخلیق کار ہیں۔ان کی ادبی شخصیت کے کئی گوشے ہیں جن پر سنجیدہ اور ٹھوس کام کرنے کی ضرورت ہے۔نورشاہ ایسے تخلیقی فنکار ہیں جنہوں نے عنفوانِ شباب سے لے کر پیرانہ سالی تک اپنے آپ کو اُردو ادب کے لئے وقف رکھا۔چاہئے اُردو افسانہ ہو یا ناول، ڈرامہ نویسی ہو یا ترجمہ نویسی، بچوں کے لئے کہانیاں ہوں یا ٹی وی سیریل، رسائل وجرائد کی ادارت ہو یا اردو انجمنوں کی سرپرستی، غرض ہر حیثیت میں نورشاہ ایک سرخیل ثابت ہوئے اور ہر طرح اُردو ادب کے گیسو سنوارنے میں مصروف اور پیش پیش رہے۔ یہ سنجیدہ اور شریف النفس تخلیق کار شہرت کا بھوکا ہے اور نہ ہی انعامات و اعزازات کا طلب گار۔ حالانکہ گزشتہ پانچ دہائیوں سے اُردو ادب کی خدمت میں مگن ہیں لیکن المیہ اور ستم ظریفی کا یہ عالم ہے کہ ریاست اور بیرون ریاست میں انہیں خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی اور نہ ہی ہندوستان کی کسی اُردو اکیڈیمی یا ساہتیہ اکادمی کی جانب سے انہیں کوئی ایوارڈ ملا ہے۔خیر جنیوئن قلم کاروں کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور انعامات و اعزازات صرف مخصوص **Lobbyism** اور اثر ورسوخ کے تحت دیئے جاتے ہیں۔حالانکہ یہ ضرور ہے کہ نورشاہ ریاست اور بیرونِ ریاست کے مقتدر رسائل وجرائد میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ان رسائل میں بیسویں صدی، ابجد، شیرازہ، شاعر، ایوان اُردو، تریاق، انتساب، اُردو دنیا، فکر و تحقیق، اردو سنگم بھاشا وغیرہ شامل ہیں۔

الغرض نورشاہ کی افسانہ نگاری کا یہ ایک مختصر جائزہ ہے جس میں ان کے فن اور فکر کے محض چند پہلوؤں پر ہی روشنی ڈالی گئی ہے۔ظاہر بات ہے کہ یہ جائزہ نامکمل ہے۔دراصل ان کے فن کی اس قدر جہتیں ہیں اور طرزِ ادا اور اسلوب اظہار کے اتنے طریقوں سے انہوں نے کام لیا کہ سب کا احاطہ کرنا اس مختصر سے پیش گفتار میں ناممکن ہے۔اس لئے ان پر ایک جامع کام کرنے کی ضرورت ہے۔بہر حال وہ ہمارے عہد کے انتہائی اہم افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اُردو افسانے کو فکر و فن کی نئی بلندیوں سے روشناس کرایا ہے۔

میں اس کتاب کو قارئین کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے میں خاصی مسرت محسوس کر رہا

ہوں۔ یہ کتاب شاید بہت پہلے شائع ہوئی ہوتی ،لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے یہ کام تعطل کا شکار ہوا۔ بہر حال دیر آید درست آید۔آج یہ کتاب طباعت کے مراحل سے گزر کر منظرِ عام پر آئی یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے۔ میں ان تمام قلمکاروں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی تخلیقات اس کتاب کی زینت بنیں۔ میں بالخصوص جناب محمد یوسف مشہور اور ڈاکٹر ریاض توحیدی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں کافی مدد کی۔ اپنے رفیق وشفیق ساتھی سلیم سالک اور سلیم ساغر کا سپاس گزار ہوں کہ جنہوں نے وقتاً فوقتاً کتاب کی ترتیب کے حوالے سے کئی مفید مشورے دیئے۔ میں کمپیوٹر آپریٹر جناب ایم۔ بشارت احمد بابا کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کافی صبر وتحمل اور عرق ریزی سے اس کتاب کی کمپوزنگ کی۔ عزیزی عادل اسماعیل نے اس کتاب کا دیدہ زیب سرورق کافی دلچسپی سے تیار کیا ہے۔ میری شریک حیات بھی خاص طور سے شکریہ کی مستحق ہے جنہوں نے کتاب کو ترتیب دینے میں حتی الوسع تعاون فراہم کیا۔ میں میزان پبلشر کے مالک جناب شبیر ماٹجی صاحب کا ممنون ہوں جو میرے اس مسودے کو چھاپنے کے منتظر تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اربابِ علم وادب اور دانش وبینش میری اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

● ...... محمد اقبال لون

سرینگر، کشمیر

............●●● ....

● ...... محمد اقبال لون

سوانحی خاکہ

اصلی نام : نور محمد شاہ

قلمی نام : نور شاہ

پیدائش : ڈلگیٹ درگہ جن سرینگر کشمیر ،۹/جولائی ۱۹۳۶ء

تعلیم : بی۔اے

شادی:

گھر جنت : شہزادی شاہ

اولادیں : نکہت ، ندیم ، سمی

ملازمت (اہم سرکاری عہدہ جات)

۱۔ ڈپٹی کمشنر (سینٹرل) محکمۂ زراعت و دیہی ترقی (سول سیکرٹریٹ) جموں و کشمیر

۲۔ ڈائریکٹر محکمہ دیہی ترقی (صوبۂ کشمیر)

۲۔ ڈائریکٹر محکمہ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (جموں و کشمیر)

اُردو کے علمی و ادبی اداروں سے وابستگی:

۱۔ جموں و کشمیر رائٹرس ایسوسی ایشن

۲۔ ادارہ فن و ادب (زیرِ قیادت مرحوم سید قیصر قلندر)

۳۔ جواہر ڈرامیٹک کلب

۴۔ اردو اکادمی جموں وکشمیر (رجسٹرڈ)

۵۔ مدیر سہ ماہی اردو اکادمی (اردو اکادمی جموں وکشمیر کی اشاعت)

۶۔ کارڈنیشن کمیٹی (اردو) کشمیر یونیورسٹی

۷۔ کارڈنیشن کمیٹی سٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن

۸۔ اقبال عالمی مرکز، کشمیر

۹۔ کارڈنیشن کمیٹی۔ ادبی مرکز کمراز اور اردو اکادمی جموں وکشمیر

۱۰۔ مجلس ادارت سہ ماہی نگینہ انٹرنیشنل سرینگر

۱۱۔ جموں وکشمیر فکشن رائٹرز گلڈ

۱۲۔ اِکزی کیٹو کمیٹی کشمیر کلچرل کانفرنس

ادارت:

۱۔ مدیر ماہنامہ دیہات سدھار

۲۔ کواڈنیٹر سائنس نیوز

۳۔ کواڈنیٹر پاپولر نیوز　　دوران گورنمنٹ سروس

۴۔ اکزی کیٹو ایڈیٹر ہفت روزہ شہید آزادی۔

۵۔ مدیر اعزازی۔ ماہنامہ تریاق ممبئی (جموں وکشمیر نمبر)

انعام واعزازات:

۱۔ افسانوی مجموعے ویرانے کے پھول کے لئے وزیر اعلیٰ مرحوم غلام محمد صادق کا بیسٹ بک ایوارڈ

۲۔ ہر مکھ لٹریری ایوارڈ　۲۰۰۷ء

۳۔ جموں وکشمیر اردو اکادمی ایوارڈ　۲۰۰۸ء

۴۔ وفا فاؤنڈیشن ایوارڈ　۲۰۱۰ء

۵۔ ڈاکٹر برج پریمی لٹریری ایوارڈ ۲۰۱۰ء

۶۔ ڈاکٹر سی۔ ایل گپتا لٹریری ایوارڈ (ادبی کنج جموں) ۲۰۱۱ء

۷۔ کشمیر ثقافتی ایوارڈ حکومت جموں و کشمیر زیر اہتمام پاکستان ۱۱۔۲۰۱۰ء

۸۔ اردو فاؤنڈیشن ممبئی ایوارڈ برائے افسانہ ۲۰۱۲ء

۹۔ ریڈیو کشمیر سوم ناتھ سادھو ایوارڈ برائے ڈرامہ ۲۰۱۳ء

۱۰۔ بخشی میموریل ایوارڈ برائے فروغ اردو زبان و ادب ۲۰۱۴ء

۱۱۔ سندِ افتخار برائے خدمات اردو ادب (ہوٹل شہنشاہ) ۲۰۱۴ء

۱۲۔ وحشی سید یادگار محبت ایوارڈ۔ ادارۂ تحریک ادب بنارس ۲۰۱۴ء

۱۳۔ کشمیر سپورٹس رجسٹرڈ کشمیر۔ ایوارڈ برائے کالم نویسی ۲۰۱۴ء

۱۴۔ کرشن چندر ایوارڈ برائے افسانہ۔ جموں و کشمیر فکشن رائٹرز گلڈ ۲۰۱۵ء

۱۵۔ سارا و محمد عبداللہ ترنبو ایوارڈ برائے افسانہ نگاری ۲۰۱۵ء

ادبی شروعات:

۱۔ پہلی کہانی..................گلاب کا پھول (ماہنامہ بیسویں صدی، دلی)

۲۔ پہلا ریڈیو ڈرامہ............دل کی روشنی (ریڈیو کشمیر سرینگر)

تصانیف:

افسانوی مجموعے

۱۔ بے گھاٹ کی ناؤ (۱۹۶۰ء) ۲۔ ویرانے کے پھول

۳۔ ایک رات کی ملکہ (۱۹۶۴ء) ۴۔ من کا آنگن اُداس اُداس (۱۹۶۵ء)

۵۔ گیلے پتھروں کی مہک (۱۹۸۲ء) ۶۔ بے ثمر سچ (۲۰۰۵ء)

۷۔ آسمان پھول اور لہو (۲۰۰۹ء)

ناول/ ناولٹ :

۱۔ نیلی جھیل کالے سائے (۱۹۶۱ء)　۲۔ پائل کے زخم (۱۹۶۳ء

۳۔ لمحے اور زنجیریں (۱۹۶۵ء)　۴۔ آؤ سو جائیں (۱۹۷۱ء۔ ناولٹ نمبر شاعر)

۵۔ آدھی رات کا سورج (۲۰۰۸ء)

دیگر تصانیف:

۱۔ انتخاب اردو ادب ریاست جموں و کشمیر (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء) ریاستی کلچرل اکادمی کی اشاعت (۷۴۔۱۹۷۳ء)

۲۔ بند کمرے کی کھڑکی (ڈائری کے اوراق پر مشتمل یادیں)　۲۰۰۷ء

۳۔ نور شاہ کے تین ناولٹ (مرتب روف راحت)　۲۰۰۹ء

۴۔ کہاں گئے یہ لوگ (ادبی خاکے)　۲۰۰۹ء

۵۔ ریاست جموں و کشمیر کے اُردو افسانہ نگار (فن، شخصیت اور مکالمہ) ۲۰۱۱ء

۶۔ کشمیر نامہ (مرحوم عمر مجید کے اخباری تخلیقات کا انتخاب۔ مرتب نور شاہ۔ جاوید ماٹجی ۲۰۱۲ء

۷۔ کشمیر کہانی (کشمیر کے پُر آشوب دور کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں اور ڈراموں کا انتخاب (۲۰۱۴ء)

۸۔ کیسا ہے یہ جنون (افسانے، افسانچے، ڈرامے، فیچر، سیلاب کہانیاں اور ترجمے) ۲۰۱۵ء

ریڈیو ڈرامے:

ستر سے زائد۔ ان میں سے اکثر ڈرامے ریڈیو کشمیری اور ریڈیو جموں سے نشر ہوئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ بچوں کے لئے لکھے گئے ڈرامے ان سے الگ ہیں جو نشر ہوئے اور اکثر

مختلف جرائد میں شائع بھی ہوئے۔

گیتوں بھری کہانیاں:

۱۔ کمرشل براڈ کاسٹنگ سروس سرینگر کے لئے اب تک تیس سے زائد گیتوں بھری کہانیاں قلم بند کی ہیں جو نشر بھی ہوئیں۔

۲۔ کمرشل براڈ کاسٹنگ سروس سرینگر کے لئے کچھ یادیں کچھ باتیں کے عنوان سے فلمی اور غیر فلمی شخصیات کے تعلق سے ہفت روزہ پروگرام کے لئے قلمی معاونت۔

ٹی۔وی سیریل

۱۔ درد کا رشتہ (۱۳ کڑیاں)　۲۔ گل اور بلبل (۱۳ کڑیاں)

۲۔ سکھ کا سپنا ۱۳ کڑیاں)　۴۔ نیلم (۱۳ کڑیاں)

۵۔ زندگی کا سفر (ٹیلی فلم)

۷۔ کشمیر میں اردو (دستاویزی فیچر۔۳۰ فٹ کے لئے)

۸۔ جموں و کشمیر میں شمسی توانائی (۴ قسطیں پرسار بھارتی کے لئے)

۹۔ گل۔رات کا سورج نامی کہانی پر مبنی ٹیلی فلم

نور شاہ کے فن پر لکھے گئے تحقیقی مقالے

۱۔افسانوی مجموعہ گیلے پتھروں کی مہک۔امتیاز علی (جموں یونیورسٹی زیر نگرانی پروفیسر ظہور الدین)

۲۔ نور شاہ اور اس کے افسانے۔سدلیش کمار (جموں یونیورسٹی زیر نگرانی پروفیسر شہاب عنایت ملک)

۳۔ نور شاہ کی ناول نگاری۔نزاکت حسین (جموں یونیورسٹی زیر نگرانی پروفیسر ریاض احمد)

۴۔ آسمان پھول اور لہو۔تنقیدی جائزہ۔سمیر احمد (مولانا آزاد یونیورسٹی حیدر آباد زیر

نگرانی ڈاکٹر مسرت جہاں)

۵۔ نورشاہ کی ادبی خدمات۔اشفاق احمد برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

۶۔ نورشاہ کی افسانہ نگاری۔شیراز احمد (برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال)

۷۔ کشمیر میں اردو افسانہ نورشاہ کے خصوصی مطالعے کے پس منظر میں۔فاروق احمد وانی (دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور۔زیرنگرانی پروفیسر مختار شمیم)

۸۔ جموں وکشمیر کے فکشن نگاروں میں نورشاہ کا مقام۔راکیش کمار (جموں یونیورسٹی زیرنگرانی پروفیسر سکھ چین سنگھ)

پتہ۔۱۴۔لل دید کالونی،غوری پورہ لنک روڈ،راول پورہ سرینگر،کشمیر۔۱۹۰۰۰۵

فون: 09906771363



● ...... محمد اقبال لون

نورشاہ سے ایک گفتگو

محمد اقبال لون ۱: نورشاہ صاحب...... بات چیت کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے ذرا بتا دیجئے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

نورشاہ: میں ۹ رجولائی ۱۹۳۶ء کو شہر سرینگر کی سب سے خوبصورت بستی ڈلگیٹ درگہ جن میں ایک متوسط مگر لکھے پڑھے گھرانے میں پیدا ہوا۔ ڈل جھیل کے کنارے آباد یہ بستی نہ صرف اپنی تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی اہمیت کی حامل ہے بلکہ اپنی خوبصورتی، سندرتا اور دلکش مناظر کے لئے بھی سیاحتی نقشے پر ایک منفرد مقام کا درجہ رکھتی ہے، یہاں کی بے پناہ خوبصورتی اور آب و تاب حساس لوگوں کو شاعر، فنکار اور موسیقار بنا دیتی ہے۔ شکاروں سے خوبصورت ہاوس بوٹوں تک، سر سبز شاداب اور رنگ رنگ کے پھولوں کے باغات سے برف پوش پُر شکوہ پہاڑوں تک ...... یہاں حیرت اور تجسس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہر موسم میں قائم و دائم رہتا ہے۔ اس بستی نے اَن گنت موسیقاروں، شاعروں، قلم کاروں، ادیبوں، صحافیوں، ڈاکٹروں، ماہرین تعلیم، انجینئروں اور صنعت کاروں کو جنم دیا ہے۔ یہ شخصیات اپنی صلاحیتوں کے پس منظر میں ہماری تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ میں اُن کے نام لوں تو میرا جواب طوالت اختیار کرے گا۔

محمد اقبال ۲: کیا آپ کو بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق تھا؟

نور شاہ: جی ہاں بہت شوق تھا، جب میں اسلامیہ مڈل سکول درگہ جن کا ایک طالب علم ہی تھا پڑھنے کی جانب راغب تھا۔

محمد اقبال لون ۳: آپ کو لکھنے کا شوق کیسے ہوا اور اس کے پیچھے کیا اسباب تھے۔ تفصیل سے بتائیں؟

نور شاہ: ہمارا گھر شاید آس پاس کے گھرانوں میں واحد گھر تھا جہاں ہر صبح اردو اخبار آتا تھا۔ میرے لئے میری والدہ صاحبہ کا یہ حکم تھا کہ میں ہر روز اسکول جانے سے پہلے اخبار پڑھوں، اُس کی سرخیاں کاپی پر اُتاروں اور اسکول جا کر سب کو سنانے کی کوشش کروں۔ اِس کے علاوہ لاہور سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ 'پھول' باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ پھر آگے چل کر ابن صفی کو پڑھنا شروع کیا، ہم دو چار دوست پیسہ اکٹھا کر کے ابن صفی کے ناول خریدتے اور باری باری پڑھتے تھے۔ وقت گزرنے کے باوجود بھی میرے لکھنے پڑھنے کے شوق و ذوق میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا، ایک عادت سی بن گئی، لکھنا پڑھنا میرے شب و روز کی ایک ضرورت بن گئی، البتہ ترجیحات بدلتی رہیں۔ ترجیحات کے ساتھ کتابیں بدلتی رہیں، پڑھنے لکھنے کے انداز بدلتے رہے۔

محمد اقبال لون ۴: آپ کی پہلی تخلیق کیا تھی؟ وہ کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

نور شاہ: میری پہلی تخلیق کا عنوان تھا "گلاب کا پھول" اور یہ ماہنامہ بیسویں صدی (دہلی) میں (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوئی۔ آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرا یہ افسانہ ترتیب میں تیسرے نمبر پر تھا۔ میرے نام سے پہلے کوثر چاندپوری (جھوٹا نگ) اور پروفیسر شکیل الرحمن (سہارا) کے افسانے ترتیب میں پہلے اور دوسرے نمبر تھے۔ اس شمارہ میں عادل رشید، رئیس نجمی امروہی، جگدیش بمل اور رضا الجبار کے افسانے بھی شامل تھے۔ رضا صاحب مرحوم کا بھی یہ پہلا افسانہ تھا۔

محمد اقبال لون ۵: آپ نے اپنا ادبی سفر شاہدہ شرین کے نام سے شروع کیا تھا اور اس تعلق سے کئی رنگین قصّے مشہور ہوئے تھے۔ آپ نے یہ حربہ کیوں استعمال کیا؟ اس کی اصل وجوہات کیا تھیں؟

نور شاہ: ہاں، میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک زنانہ نام (شاہدہ شیرین) سے کیا تھا۔ یہ ایک طویل کہانی ہے لیکن میں مختصراً ذکر کروں گا۔ تھوڑے سے مطالعے اور اچھے خاصے مشاہدے کی بناء پر جب میں نے محسوس کیا کہ میں کہانیاں خود بھی لکھ سکتا ہوں تو ایک کہانی اردو دنیا کے ایک نامور مدیر کے نام ارسال کی، بہت دنوں تک جواب نہیں آیا اور پھر جو جواب آیا وہ وہی جواب تھا جو نئے لکھنے والوں کو عام طور سے ملتا ہے یعنی آپ کی کہانی ہمارے رسالے کے معیار پر پوری نہیں اُترتی اور ہم اسے شائع کرنے سے معذور ہیں۔ اپنی کہانی کا یہ انجام دیکھ کر دل ٹوٹ گیا لیکن افسانوی ذہن ایک اور چال چلا۔ میں نے کہانی کا عنوان اور اپنا نام بدلنے کی ٹھان لی۔ کہانی کے شروع کے جملے بدل دیئے۔ بہر حال نئے عنوان اور نئے نام کے ساتھ کہانی مدیر محترم کو بھجوائی اب کے جو خط ملا وہ دلچسپ تھا میری یہ کہانی نسوانی نام سے شائع ہوئی اور اس طرح شاہدہ شیرین کا جنم ہوا۔ بہت سارے خطوط ملے (مجھے یاد ہے کہ اس کہانی کی تعریف میں مجھے جو پہلا خط ملا وہ آنجہانی ٹھاکر پونچھی کا تھا) اُس کے بعد چند ایک کہانیاں اسی نام سے شائع ہوئیں، بہت سارے خطوط ملنے لگے پیار ومحبت سے بھر پور خطوط، عشق ومحبت کی داستانوں کی صورت میں' تحائف بھی ملنے لگے خاص طور سے کتابوں کی صورت میں، اِن سارے خطوط کو میں نے کتابی صورت میں، پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن میرے دوست علی محمد لون (مرحوم) نے ایسا کرنے سے منع کیا کہ ایسے کرنے سے ادبی دنیا کے چند ''بڑوں'' کی رسوائی ہوگی۔ پھر ایسا ہوا، ویدراہی اُن دنوں ماہنامہ یوجنا (ہندی) کے مدیر تھے میری ایک کہانی کا ترجمہ یوجنا میں شائع کیا اور میری تصویر کے نیچے لکھ دیا۔ شاہدہ شیرین کا اصلی روپ نور شاہ اور اس طرح ایک بار پھر شاہدہ شیرین نور شاہ بن گیا۔

محمد اقبال لون ۶: آپ کے تخلیقی سفر کے دوران آپ کی شریک حیات کا کس حد تک تعاون رہا؟

نور شاہ: بقدر ضرورت ان کا تعاون شامل حال رہا اور شاید اس کی وجہ یہ رہی کہ ان کو میری ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں میں مالی فائدہ نظر آتا ہے۔

محمد اقبال لون ۷: ملکی افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں میں آپ کن کن اصحاب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں؟

نور شاہ: دیکھئے افسانہ میری پسندیدہ صنف ہے۔ اس لئے ملکی افسانہ نگاروں میں منٹو، بیدی، انتظار حسین، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر سے کافی متاثر ہوں اور تنقید میں حامدی کاشمیری، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، گوپی چند نارنگ اور خاکہ نگاروں میں ابراہیم جلیس، فکر تونسوی سے حد درجہ متاثر ہوں۔ اس کے علاوہ ابن صفی کے ناولوں کی طرف شروع سے ہی زیادہ مائل رہا۔ میں اے۔ حمید کے افسانوں کا بھی زبردست شیدائی رہا ہوں۔

محمد اقبال لون ۸: آپ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت سے کس حد تک متاثر تھے؟ یا ان تحریکات کو آپ نے کس قدر اپنایا؟

نور شاہ: میں نے جب اردو ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو ترقی پسند ادیبوں اور ادب کا اثر بہت تک باقی تھا۔ اِدھر اُن دنوں اردو ادب کے دروازے پر جدیدیت کی جادوگرنی بھی دستک دے رہی تھی، ترقی پسند ادب سے میں نے کوئی شے شعوری یا غیر شعوری طور پر اگر اپنالی تو وہ ہے ناانصافی اور استحصال کے خلاف بات کرنے کا حوصلہ، جدید ادب کے تکنیکی اور ہیتی تجربوں سے بھی کچھ نہ کچھ اثر میں نے قبول کیا ہے۔ مجھے شور سے پہلے بھی وحشت ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دھیمی آواز میں لہجے کو زیادہ یقین کے ساتھ برتا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی سرگوشیوں میں بھی بات کرنا اچھا لگتا ہے، ویسے بلند آواز میں بات کرنا نہ تو جرم ہے اور نہ ہی غیر قدرتی لیکن ایسا تب ہی ہوگا جب آپ کا مخاطب آپ سے بہت دور ہو چونکہ میری

کہانیوں کے کردار میرے بہت قریب رہتے ہیں اور میں اِن کرداروں سے گُھل مل جاتا ہوں۔
اسی لئے دھیمی آواز میں بات کرنے کا قائل ہوں۔

محمد اقبال لون ۹: ترقی پسند افسانہ، جدید افسانہ یا مابعد جدیدیت افسانہ۔آپ اس تقسیم کے حق میں ہیں؟

نورشاہ: میرا ماننا ہے کہ افسانہ ہر دور میں جدید ہوتا ہے۔

محمد اقبال لون ۱۰: ہمارے یہاں علامتی افسانے کن مرحلوں سے گزرے اور گزر رہے ہیں، اردو میں اس کی ترقی کے کیا امکانات ہیں۔

نورشاہ: چونکہ علامت ایک Device ہے اپنے تجربات، مشاہدات اور خیالات کو پیش کرنے کا۔ اردو میں اس کی کافی اچھی مثالیں ملتی ہیں، جن میں سریندر پرکاش، انتظار حسین، بلراج منیرا، جوگندر پال، انور سجاد وغیرہ شامل ہیں۔ ریاست میں وحشی سعید کے یہاں علامتی افسانوں کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔اُردو میں اس کی ترقی کے مثبت امکانات موجود ہیں۔

محمد اقبال لون ۱۱: آپ کے بہت سارے افسانوں میں اسلوب کی یک رنگی دیکھنے کو ملتی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

نورشاہ: ہاں میں مانتا ہوں اور اِس کا اعتراف بھی کر چکا ہوں کہ شروع شروع میں میری تحریر کردہ بہت ساری کہانیوں کے کردار رومانی ہیں۔ شاید اس لئے کہ زندگی کے اکثر دھارے رومان سے پھوٹتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا کچھ حصہ ڈل جھیل کے کنارے بیتا ہے۔ دور حد نظر تک برفیلی چوٹیاں، نیلا سبز پانی، رنگ رنگ کے پھول اور دوسرے حسین مناظر میرے ذہن میں بسیرا کئے ہوئے تھے (اور شاید آج بھی)۔ چونکہ میری کچھ کہانیوں میں ایسا ہی ماحول ملتا ہے اسی لئے شاید آپ کو یہ یک رنگی اسلوب نظر آتا ہے۔ آپ کو یہ بھی بتادوں کہ رومان کے پس منظر میں لکھے گئے میرے یہ افسانے آج بھی بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں آج بھی ریاست میں جب کبھی افسانوں کے تعلق سے

ادبی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں تو بیرون ریاست سے آئے ہوئے معروف قلم کاراُن کہانیوں کا ضرور ذکر کرتے ہیں اور اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں میرے پڑھنے والے کہتے تھے کہ انہوں نے کشمیر کو نور شاہ کی کہانیوں میں دیکھا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترجیحات بدل گئیں۔ موضوعات بدل گئے ماحول بدل گیا کہانیوں کا رنگ روپ بدل گیا۔

محمد اقبال لون ۱۲: فن اور مواد میں آپ کس کو ترجیح دیتے ہیں؟

نور شاہ: میں دونوں کو لازم ملزوم سمجھتا ہوں۔

محمد اقبال لون ۱۳: کیا افسانے کے لئے قاری اہم ہے؟

نور شاہ: قاری نہ ہو تو افسانہ نگار کس کے لئے لکھے گا افسانہ، ہر کہانی کا رفطری طور پر اپنی شناخت چاہتا ہے اور اگر پڑھنے والا ہی نہ ہو تو افسانہ کس کام کا۔ ایک اور بات بتادوں، آج لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت مشکل سے نکلتا ہے۔ اس لئے طویل افسانے پڑھنے میں قاری کی دلچسپی ختم ہوتی جاری ہے۔

محمد اقبال لون ۱۴: کیا آپ نے جنسی موضوعات پر بھی افسانے لکھے ہیں؟

نور شاہ: جی ہاں، کسی زمانے میں یہ میرا پسندیدہ موضوع تھا، میرا خیال ہے کہ جنسی موضوعات پر لکھنا کوئی جرم نہیں ہے۔

محمد اقبال لون ۱۵: کیا آپ نے بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھی ہیں؟

نور شاہ: جی ہاں، افسانے اور ڈرامے بھی۔ بچوں کے لئے میرے تحریر کردہ چند ڈرامے ریڈیو کشمیر سے بچوں کے پروگرام میں نشر ہوئے ہیں۔ کچھ کہانیاں اور ڈرامے اردو دنیا، امنگ اور سبق اردو میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اِن کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔

محمد اقبال لون ۱۶: آپ ڈرامے بھی لکھتے ہیں؟ ٹیلی ویژن کے لئے سیریل بھی لکھتے ہیں؟

نور شاہ: جی ہاں، میں نے اب تک ریڈیو کے لئے ستر سے زائد ڈرامے لکھے ہیں جو نشر بھی ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ میں ٹیلی ویژن کے لئے سیریل بھی لکھتا ہوں۔ ۲۰۱۱ء میں دوردرشن سے میرے تحریر کردہ دو سیریل 'درد کا رشتہ' اور گل اور بلبل' ٹیلی کاسٹ ہوئے۔ کشمیر میں اردو کے عنوان سے میری تحریر کردہ ڈاکومنٹری بھی حیدر آباد سے ٹیلی کاسٹ ہوئی۔

محمد اقبال لون ۱۷: آپ کی متعدد کہانیاں مختلف جرائدیں چھپ چکی ہیں اور چھپ بھی رہی ہیں، اِن سب کہانیوں کے پلاٹ اتنی پھرتی اور آسانی سے تھوڑے وقفے میں آپ کیسے تشکیل دیتے ہیں؟

نور شاہ: اللہ کا کرم ہے۔ ذہن سوچتا رہتا ہے قدم قدم پر نئے کردار ملتے رہتے ہیں، نئے حالات وواقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جب سوچ، کردار اور حالات وواقعات ایک روپ اپنا لیتے ہیں تو قلم کو حرکت میں آنے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ چونکہ میرا ادبی یا افسانوی سفر ایک لمبے عرصے سے جاری ہے اس لئے ان کہانیوں کی تعداد دیکھ کر آپ کو لگتا ہے کہ میں بڑی آسانی اور پھرتی سے کہانیوں کی تخلیق کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مہینے میں دو سے زیادہ کہانیاں نہیں لکھ سکتا اور کبھی کبھار تین تین ماہ تک بار بار سوچنے کے باوجود کہانی نہیں لکھی جاتی۔ دراصل کہانی کار اپنی مرضی سے کہانی نہیں لکھتا بلکہ کہانی ہی کہانی کار کو کہانی لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

محمد اقبال لون ۱۸: کیا آپ ایک ہی سِٹنگ میں افسانہ لکھ لیتے ہیں؟

نور شاہ: اکثر نہیں۔ میں افسانے تکنیک بدل بدل کر لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

محمد اقبال لون ۱۹: لکھنے کے لئے آپ کو کس قسم کا ماحول پسند ہے؟

نور شاہ: کیفیت جب بھی غالب ہوتی ہے تو ماحول کا احساس نہیں ہوتا لیکن شور وغل سے مجھے ذہنی کوفت ہوتی ہے، بنیادی طور پر میں خاموشی کا قائل ہوں۔

محمد اقبال لون ۲۰: کیا آپ سے ایسی کوئی کہانی تخلیق ہوئی ہے جس میں آپ کی نجی حالات زندگی کے واقعات وحقائق ہو بہو قلم بند ہوں؟

نور شاہ: میری بہت ساری ایسی کہانیاں ہیں جن میں، میں نے دوسروں کا رنگ و روپ اپنا کر اپنی کہانی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمد اقبال لون ۲۱: کیا آپ کو کبھی شعروشاعری کرنے کا خیال آیا۔ حالانکہ آپ کے بہت سارے افسانے صنف نازک کے جمالیاتی موضوعات کے پہلوؤں کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں؟

نور شاہ: شعر کہنا میرے بس کی بات نہیں، ایک شاعر کے لئے صرف صنف نازک کے جمالیاتی موضوعات کافی نہیں ہیں۔ شاعری کی تاثیر میں وزن، آہنگ کے ساتھ ساتھ الفاظ کے سُر اور موسیقی کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ البتہ چند برس قبل میں نے کچھ نثری نظمیں لکھی تھیں جن میں سے چند ایک شائع بھی ہوئیں۔ اچھا شعر سُن کر خوشی محسوس کرتا ہوں، اصل میں کوئی بھی صنف آسان نہیں، وہ شاعری ہو، افسانہ ہو، تنقید یا تحقیق ہو یہ تو سب آپ کے تخلیقی سفر پر منحصر ہے کہ آپ کون سی صنف اپنانے کے قابل ہیں۔

محمد اقبال لون ۲۲: آپ کی تحقیق کے مطابق ریاست کے اردو فکشن نگاروں میں پہلا افسانہ نگار کون ہے؟

نور شاہ: افسانہ جس نے بھی پہلے لکھا ہو لیکن ہر صورت میں پریم ناتھ پردیسی ریاست کے پہلے اردو افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے کہ اُن کے افسانوں میں فنی اور ہیئتی عناصر کا بھر پور شعور ملتا ہے۔

محمد اقبال لون ۲۳: برصغیر میں اس وقت پانچ سات سطروں کی افسانہ نگاری فروغ پا رہی ہے، اس تعلق سے آپ کا تخلیقی وفکری نظریہ کیا ہے؟

نور شاہ: اب تو ایک سطری افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا

ہے کہ چھوٹی کہانیاں اتنی چھوٹی نہیں جتنی نظر آتی ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ منی کہانیوں میں کوئی فنکاری نہیں ہوتی ہے۔ بہر حال میں آپ کے سوال جواب میں کہنا چاہوں گا اگر کوئی افسانہ نگار واقعی چند جملوں میں اپنے موضوع سے انصاف کرسکتا ہے تو اس کی تعریف کی جانی چاہئے۔

محمد اقبال لون ۲۴: موجودہ دور کی بے راہ روی، ظلم و جبر، ناانصافیوں اور محرومیوں کے تعلق سے بھی کوئی کہانی تحریر کی ہے؟

نور شاہ: پچھلے بیس پچیس برسوں سے کشمیر جس پر آشوب دور سے گزر رہا ہے۔ کشمیر کے لوگ جن اذیت ناک حالات سے دوچار ہو رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس کا اثر میرے ذہن پر بھی پڑا۔ میری سوچ بھی متاثر ہوئی، میرے قلم نے بھی ایک نیا رُخ اپنالیا۔ میں نے اِن حالات و واقعات کو اپنی کہانیوں میں اپنے انداز اور اپنے رنگ میں قلم بند کیا ہے۔ میرے یہ افسانے میرے پہلے لکھے گئے افسانوں سے بہت مختلف ہیں، اِس نوعیت کے بہت سارے افسانے میرے افسانوی مجموعوں 'آسمان، پھول اور لہو، کشمیر کہانی' اور ''کیسا ہے یہ جنوں'' میں شامل ہیں۔

محمد اقبال لون ۲۵: دورِ حاضر میں ریاست کے اُبھرتے نوجوان قلمکاروں میں چند ایک ناموں سے آگاہ کریں جو آپ کی دانست میں خوب لکھتے ہیں اور کیا اِن قلم کاروں میں آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

نور شاہ: ہماری ریاست میں میری عمر کے افسانہ نگار بھی اپنے آپ کو نوجواں قلم کاروں میں شامل کرتے ہیں، میں اُن کا نام نہ لوں تو ناراض ہوجائیں گے۔ ہاں اگر آپ چالیس برس کی عمر سے کم قلم کاروں کی بات کرتے ہیں تو بہت سارے نام میرے ذہن میں ہیں لیکن یہ بات کہنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا کہ اِن میں سے بہت سارے نوجوان اور اُبھرتے کہانی کاروں کو روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' کے ادب نامہ نے متعارف کرایا۔ دراصل نئی نسل ہم سے زیادہ حساس ہے، ذہین ہے، زیادہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ ذہنی طور پر بالغ ہے، ہماری نئی نسل کے قلمکار، افسانہ نگار، شاعر، ادیب اور صحافی ہپوکریٹ نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ریاستی

ادیبوں کے تئیں جو بے اعتنائی برتی گئی یا برتی جارہی ہے۔اس کا احساس باہر اتنی شدت سے نہیں جتنا کہ یہاں موجود ہے اور نتیجہ کے طور پر یہاں کا قلم کار اپنے آپ کو نظر انداز کیا ہوا محسوس کر رہا ہے۔اس کے باوجود تخلیقی عمل جاری ہے اور اس کارواں میں نئے نئے ساتھی شامل ہو رہے ہیں۔ اس لئے میں بغیر نام لئے کہنا چاہوں گا کہ ہماری نئی نسل کا ہر افسانہ نگار بھرپور صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔

محمد اقبال لون ۲۶: ریاست جموں وکشمیر میں تنقید وتحقیق کی کیا صورتحال ہے؟

نور شاہ: تحقیق وتنقید کے تعلق سے ریاست جموں کشمیر میں حامدی صاحب کے علاوہ کچھ اور بھی شخصیات ہیں۔ کچھ قلم کار ہیں جن کے ذہین تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔

محمد اقبال لون ۲۷: کچھ نام لیجئے؟

نور شاہ: پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر ظہور الدین، پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر اشرف آثاری، ڈاکٹر الطاف انجم، ڈاکٹر محی الدین زور وغیرہ۔ پروفیسر اکبر حیدری، پروفیسر مجید مضمر اور ڈاکٹر فرید پربتی اب حیات نہیں ہیں لیکن وہ تحقیق وتنقید کے میدان میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ڈاکٹر آثاری افسانے بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔

محمد اقبال لون ۲۸: کیا آپ کے خیال میں اُردو ادب میں جمود طاری ہے اگر ہے تو اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں اس جمود کو توڑنے کے لئے کیا کیا جائے؟

نور شاہ: کسی حد تک جمود ہے لیکن جمود کے ذمہ دار ہم ہی ہیں کیونکہ تخلیقی عمل میں تعطل پیدا ہونا اس چیز کی عکاسی کرتا ہے کہ تخلیق کار کو کچھ ذہنی اور نفسیاتی مسائل ومصائب درپیش ہیں۔ اس لئے جمود توڑنا اور تخلیقی عمل کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنا ہماری ذمہ داری ہے حالانکہ اس وقت بھی تخلیقی ادب میں اضافہ کرنے کے لئے بہت لوگ مصروف کار ہیں۔

محمد اقبال لون ۲۹: شاہ صاحب۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ اُردو میں موجودہ

تخلیقی ادب کی رفتار اطمینان بخش ہے؟

نور شاہ: اطمینان بخش نہیں ہے انفرادی اور اجتماعی سطح پر کچھ کوششیں ہو رہی ہے لیکن کلہم صورتحال مایوس کن ہے۔ نئی نسل اُردو کے تئیں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

محمد اقبال لون ۳۰: نئی نسل کی کیا خصوصیات ہیں؟

نور شاہ: نئی نسل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عقیدوں اور توہمات کی گراں باری سے نجات پا چکی ہے اور اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ خارج سے کنارہ کش ہو کر اپنے وجود میں پناہ لینا چاہتی ہے اور انتشار کی شکار ہے۔ اُردو کے تعلق سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ نئی نسل سے وابستہ لوگ اُردو کو روزگار کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ضروری ہے لیکن نئی نسل کا غالب رجحان مادیت کی طرف ہی ہے، اس لئے اُن سے اُردو زبان و ادب کے فروغ کی اُمید رکھنا عبث ہے۔

محمد اقبال لون ۳۱: اپنی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ بتائیں؟

نور شاہ: نور شاہ سے شاہدہ شیرین اور پھر شاہدہ شیرین سے نور شاہ ہونا میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔

محمد اقبال لون ۳۲: شاہ صاحب اُردو ادب میں گروہ بندیاں (Lobbyism) زیادہ ہیں۔ انہیں کے مطابق اعزازات اور ایوارڈ دیئے جاتے ہیں۔ آپ کو اس ضمن میں کوئی شکایت ہے؟

نور شاہ: انکار نہیں جا سکتا ہے اُردو میں گروہ بندیوں کا کچھ زیادہ ہی چلن ہے، میں خود اس کا شکار ہوا ہوں، دہرانے کی گنجائش نہیں ہے۔

محمد اقبال لون ۳۳: آپ کو اپنے کریئر کے دوران کس چیز کی کسک محسوس ہوتی رہی یا جو کچھ آپ کر سکتے ہیں، نہیں کیا، اس کا پچھتاوا ہے؟

نور شاہ: جو کچھ کر سکا، اس پر مطمئن ہوں۔ حال اور مستقبل میں بھی اپنے ادھورے

سپنوں میں رنگ بھرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔

محمد اقبال لون ۳۴: اردو زبان کو ملک میں بالعموم ختم کرنے اور اس کے رسم الخط کے خلاف سازشیں زوروں پر ہیں اس کے تحفظ کے لئے ہمیں کس طرح کی حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے!

نور شاہ: اُردو زبان کے رسم الخط کے تحفظ کے حوالے سے ہمیں ایک ریاست گیر مہم چلانی چاہیئے اور ہر وہ ممکن اقدامات اُٹھانے چاہئیں جس سے اُردو زبان کا رسم الخط کا تحفظ یقینی ہو۔ چاہیئے سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر۔ ریاست کی تمام غیر سرکاروں تنظیموں کو اس حوالے سے صف آراء ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

محمد اقبال لون ۳۵: آپ برصغیر کے مؤقر رسائل میں گزشتہ پانچ دہائیوں سے مسلسل چھپتے رہتے ہیں اس کے برعکس ریاست کے جوان تر افسانہ نگار یا ادیب شاذ و نادر ہی چھپتے ہیں اس کی کیا وجوہات ہیں؟

نور شاہ: دیکھیئے اس کے لئے Consistency کی ضرورت ہے، مسلسل کوشش کا نام عمل ہے ۔ اس حوالے سے میں نئے قلم کاروں کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ معیار اور Content پر توجہ دیں۔ آپ کی تخلیقات ریاست کے رسائل میں ہی نہیں بلکہ برصغیر کے رسائل میں جگہ پا سکتی ہیں۔ گزشتہ چند برسوں سے بیرونِ ریاست کے رسائل میں ریاست کے قلم کاروں کی تخلیقات دیکھنے کو ملتی ہیں جو کہ ایک خوش آئند بات ہے۔

محمد اقبال لون ۳۶: ریاست میں تخلیق ہونے والے ادب سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

نور شاہ: ریاست میں ادبی ماحول کافی حد تک سازگار ہے اور ہمارے لکھنے والوں کی ایک اچھی جماعت سنجیدگی سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہے اور میرے خیال میں معیاری فن پارے تخلیق ہو رہے ہیں۔

محمد اقبال لون ۳۷: ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان و ادب کے مستقبل کے حوالے سے آپ کی کیا رائے ہیں؟

نور شاہ: مجھے لگتا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اُردو زبان کا مستقبل روشن اور تابناک ہے بشرطیکہ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر اُردو زبان کے فروغ اور ترویج کے حوالے سے ٹھوس اور عملی اقدامات اُٹھائے جائیں۔ سکولوں اور کالجوں میں اُردو زبان و ادب کی تدریس کی طرف خاطر خواہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

محمد اقبال لون ۳۸: شاہ صاحب آخر پر آپ نئی نسل کے تخلیق کاروں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

نور شاہ: میں نئی نسل سے وابستہ قلم کاروں کو اس بات کی تلقین کرتا ہوں کہ خوب مطالعہ کریں (بقول چیخوف تخلیق کار کے لئے مطالعہ و مشاہدہ آب حیات کی مانند ہے۔) خوب مشق کریں اور اپنے تخلیقی کام کو نکھارنے کے لئے اپنے مشاہیر کے ساتھ مشورے کیا کریں اور ساتھ ہی اردو زبان کو اپنی طبیعت کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔ ان ہی چیزوں سے علمی، ادبی اور ذہنی راہیں روشن ہوتی ہیں اور تخلیق کار کے لئے ان عوامل کا ہونا ناگزیر ہے۔

محمد اقبال لون ۳۹: اور کشمیر زبان کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

نور شاہ: کشمیری زبان ہماری شناخت ہے اور ہماری پہچان ہے!

محمد اقبال لون ۴۰: بہر حال ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اتنا وقت دیا اور بغیر کسی تکلف کے ہم سے باتیں کیں۔ شکریہ

نور شاہ: شکریہ!!!



● ...... علیم صبانویدیؔ

نورانی عطا۔نور شاہ

(ایک سانیٹ جناب نور شاہ کے نام)

نقشہ بدل کے رکھ دیا ہے نور شاہ نے
اوراقِ گلستاں میں مہک نور شاہ کی
افسانوی ادب میں چمک نور شاہ کی
کتنا عجب سفر کیا ہے نور شاہ نے

اپنی الگ اک راہ بنائی ہے شاہ نے
الفاظ کو دیا نیا پیراہن کہیں
سوچوں کو دی ہے ایک نئی انجمن کہیں
کشمیر کی بہار دکھائی ہے شاہ نے

خامہ میں ان کے گوہرِ اظہار کا جمال
تحریر ان کی حاصلِ کشمیر کی بہار
اوراق ان کی سوچ پہ کرتے ہیں جاں نثار
احساس میں ہے ان کے نئے دور کا کمال

ہاں نور شاہ وقت کی نورانی دَین ہیں
تاریخِ فکرو جذبہ کی رحمانی دَین ہیں

............●●● ....

● ...... نور شاہ

میری پہلی تحریر

میں اکثر اپنے ذہن کی کھڑکی کھول کر اپنے ماضی میں جھانکتا رہتا ہوں، میرا ماضی اَن گنت یادوں سے بھرا پڑا ہے، مٹھاس، کڑواہٹ اور تلخیوں سے بھرپور یادیں پیار و محبت کی دولت سے مالا مال یادیں، جلن، نفرت اور خود غرضی کے پس منظر میں بھوکی اور پیاسی یادیں، علمی ادبی سفر کی راہ پر بکھرتی ہوئی کچھ سندر رسندر سی، گلابی مہک سے بھرپور یادیں اور کچھ کانٹوں کے بوجھ سے جھکی جھکی سی بے ثمر یادیں...... یادوں کا کیا ہے، میری یہ یادیں تو میری زندگی...... لمحہ لمحہ زندگی کا احاطہ کئے ہوئی ہیں۔ بچپن اور لڑکپن کی یادیں، نوجوانی اور جوانی کی یادیں۔ تعلیمی زندگی سے وابستہ یادیں، ملازمت کے دوراں تجربوں اور مشاہدوں سے حاصل ہونے والی بہت ساری تلخ و شیریں سی یادیں، حاکمانہ اور محکومانہ یادیں، لامکانی کے حدود میں خود کو کبھی پانے اور کبھی کھونے کی یادیں، دیر و حرم اور مخالفوں کی یادیں، حسن و عشق، عبادت و عقیدت، رسم و رواج، بدنامی اور نیک نامی کے گرد گردش کرتی یادیں، جھیل جھرنوں، دریاؤں، ندی نالوں کی گہرائیوں سے ابھرنے والی اور برفیلے پہاڑوں پر پرواز کرنے والی یادیں، سانس لیتی ہوئیں اپنے شہر کی یادیں، کشمیر کے پُر آشوب دور کی یادیں، اپنوں سے بچھڑنے کی یادیں اور ہاں علم و ادب اور خاص طور سے افسانوی ادب سے وابستہ گذشتہ پچاس برسوں سے زائد عرصے کی ڈھکی چھپی، چھوٹی بڑی، کامیاب ناکام یادیں،، درد و کرب کی لہر میں لپٹی یادیں، چاند کی چاندنی، سورج کی تمازت اور اندھیری راتوں میں پلنے والے خوف و ڈر کی یادیں۔ میری ان یادوں کی داستان بہت طویل ہے۔ اس داستان کے ایک ایک لفظ، ایک ایک ورق پر میری نظریں ٹھہر سی گئی ہیں۔ بس ہوا کے ایک جھونکے کی آمد کا

انتظار ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میرے ذہن کی کھڑکی پر لٹکے ہوئے پردے میں سرسراہٹ سی آ گئی ہے۔ میر الاشعور شعور میں آ کر کروٹیں بدل رہا ہے اور میں اپنے ذہن کے سلیٹ پر اپنی پہلی تحریر کو دیکھ رہا ہوں، پڑھ رہا ہوں...... میری پہلی تحریر اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ ایس۔ پی ہائی سکول سرینگر۔ اپنی اسکولی زندگی کی پہلی تحریر کو میں نے اسکولی کاپی کے سہارے قلم بند کیا تھا، جی ہاں چار آنے والی اسکولی کاپی۔ یہ ایک ڈرامہ تھا، کاپی کے دس صفحات پر پھیلا ہوا۔ اس ڈرامے میں صرف تین کردار تھے، ایک عورت، ایک نوکر اور ایک سنار اور آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ میں نے اپنی پہلی تحریر اردو میں نہیں بلکہ کشمیری زبان میں لکھی تھی۔ جی ہاں میں پھر دہراتا ہوں کہ میری تحریر...... میری پہلی تحریر کشمیری میں تھی۔ ہمارے گھر میں لکھنے پڑھنے کا ماحول تھا اور اس ماحول کو پروان چڑھانے میں میری والدہ محترمہ کا ہاتھ تھا۔ جب انہوں نے میری تحریر دیکھی اور پڑھی تو مجھے لون صاحب کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ جی ہاں میں مرحوم علی محمد لون کی بات کر رہا ہوں، میرے محلے دار، میرے ہمسایہ، میرے بڑے بھائی۔ ہمارے اور ان کے گھروں کے درمیان صرف ایک چھوٹی سی دس فٹ لمبی گلی کا فاصلہ تھا (یہ دوسری بات ہے کہ آنے والے دنوں میں لون صاحب میرے بہترین دوستوں میں شمار ہونے لگے یا میں نے اُن کے دوستوں کی صف میں قدم رکھا) میں ڈرا ڈرا سا، سہما سہما سا لون صاحب کے ہاں گیا اور کاپی اُن کے حوالے کر دی۔ میری والدہ اُن سے بات کر چکی تھیں۔ دوسرے تیسرے روز وہ اپنے بائیں ہاتھ میں کاپی لئے ہمارے ہاں آ گئے اور مجھ سے کہا ''اب تم یہ ڈرامہ اردو میں لکھو''۔ جب میں نے کاپی واپس لینے کی کوشش کی تو انہوں نے دینے سے انکار کیا اور کہا ......

''مجھے ترجمہ نہیں چاہیئے بلکہ اپنی یاداشت سے یہی کہانی یا یہی ڈرامہ اردو میں لکھو۔ کہانی تم جانتے ہو کرداروں سے تم واقف ہو کوشش کرو اور لکھو...... لیکن جلد بازی سے نہیں، آرام اور سلیقے سے......''

''پھر کیا ہوگا''میں نے جاننا چاہا۔

''پھر......وہی ہوگا جو منظورِ اللہ ہوگا۔''

اور میں نے اس کہانی ۔ تین کرداروں پر مشتمل کہانی کو ڈرامائی روپ دیا...... اردو زبان میں اور لون صاحب کو دے آیا۔

کئی شب و روز بے نام گزر گئے ۔ نہ لون صاحب نے کچھ کہا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی جرأت کی لیکن ایک دن صبح صبح وہ ہمارے گھر آ گئے ۔ ہم کچن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، وہ بھی بیٹھ گئے اور نمکین چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

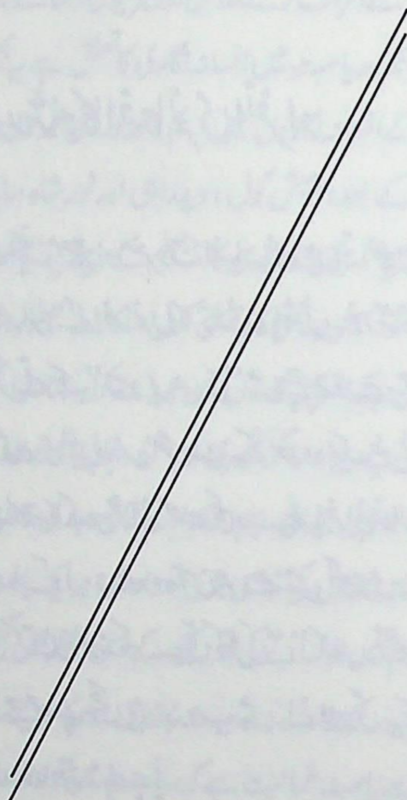
'' لکھنے کے لئے پڑھنا ضروری ہے اور پڑھنے کے لئے کتابوں کا ہونا ضروری ہے۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا......اور......!

''اور کیا''

''تم کشمیری کی بجائے اردو میں لکھنے کی کوشش کرو۔''

اور پھر میں نے اردو زبان میں لکھنا شروع کیا اور آج تک اردو میں ہی لکھتا آرہا ہوں۔ حالانکہ مجھے اِس بات کا بھر پور احساس ہے کہ کشمیری زبان میری پہچان ہے، میری شناخت ہے اور مجھے اپنی پہلی کشمیری تحریر پر فخر ہے۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ سوچوں میں بھی بدلاؤ آجاتا ہے۔ وقت کی نزاکت نکھر جاتی ہے۔ لون صاحب خود اردو کی بجائے کشمیری زبان میں لکھنے لگے اور جو کچھ بھی لکھا خوب لکھا۔ اِسی خوبی کی وجہ سے آج بھی اُن کا نام ریاست کے ادبی حلقوں میں ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے لیکن میں لکھنے کے تعلق سے کشمیری زبان کی جانب لوٹ نہ سکا.......... یہ دوسری بات ہے کہ میں نے بہت ساری کشمیری زبان میں تحریر کردہ کہانیوں کو اردو کا روپ دیا۔ میرے یہ ترجمے شائع بھی ہوئے اور پسند بھی کئے گئے۔





عکس در عکس

●......پروفیسر حامدی کاشمیری

نور شاہ کا افسانوی انفراد

نور شاہ ریاست کے ایک معتبر اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے کئی افسانوی مجموعے شائع کیے ہیں، میں برابر ان کے افسانوں کا قاری رہا ہوں۔ نور شاہ لگ بھگ میرے ساتھ ہی پشکر ناتھ سمیت ایک عرصے تک ''بیسویں صدی'' میں چھپتے رہے، جموں کے قیام کے دوران ان سے میری ملاقاتیں بھی رہی ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک طویل عرصے تک خانہ نشین ہو کے رہ گئے، مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ وہ خرابی صحت کی وجہ سے یا خرابی حالات کی بناء پر خانہ نشین ہو گئے۔ بہر حال کوئی بھی وجہ کیوں نہ ہو، وہ اس عرصے میں لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ اس کا ثبوت ان کی کتابیں ''بند کمرے کی کھڑکی''، ''کہاں گئے وہ لوگ''، ''آسمان پھول اور لہو''، ''بے ثمر سچ'' ہیں جو چھپ چکی ہیں۔ جب میں نے ان کی یہ کتابیں دیکھ لیں تو انکشاف ہوا کہ یہ وقفہ incubatory وقفہ رہا ہے۔

اس وقت ان کا افسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ'' میرے سامنے ہے۔ 'بے ثمر سچ' کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ نور شاہ کا تخلیقی ذہن انفرادی اظہار کا متقاضی ہے۔ ملکی سطح پر پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر، راجندر سنگھ، بیدی، منٹو ہوں یا رومانی افسانہ نگار مثلاً سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ ساتھ ریاستی سطح پر پریم ناتھ پردیسی اور ٹھاکر پونچھی بھی افسانے کی بے کم و کاست روایتی تکنیک سے کام لیتے رہے، وہ پلاٹ، کردار نگاری، فضا سازی، واقعہ در واقعہ اور نقطۂ عروج کے بنے بنائے فریم ورک میں مختلف سماجی،

سیاسی، نفسیاتی مسائل کو سموتے رہے۔ افسانے کی اس نوع کی روایتی ہیئت اور تکنیک تقسیم تک جاری رہی۔ تقسیم کے فوراً بعد سریندر پرکاش، غیاث احمد گدی، انور سجاد، بلراج ہنرا اور رشید امجد نے روایتی تکنیک سے انحراف کر کے علامتی اور تجریدی افسانے لکھے۔

جہاں تک ریاست میں افسانہ نگاری کا تعلق ہے یہ بھی روایتی آداب ولوازم کی پابند رہی۔ اس نوع کے افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ در، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، آنند لہر، موہن یاور، اور سنتوش کے بعد، امیش کول، ویدراہی اور نور شاہ سامنے آئے۔ علی محمد لون کا افسانہ ''مونچھوں والی گڑیا''، تیج بھادر بھان کا ''جہلم کے سینے پر''، پشکر ناتھ کا ''گلوان''، نور شاہ کا ''بے گھاٹ کی ناؤ''، مخمور حسین بدخشی کا ''نیل کنول مسکائے'' بطورِ مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے بعد نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں ہردے کول بھارتی، شمس الدین شمیم، مالک رام آنند، وجے سوری، کلدیب رعناء ساگر کشمیری، ریاض پنجابی، ظہور الدین، عمر مجید، وریندر پٹواری، آنند لہر، فاروق رینزو، انیس ہمدانی، زاہد مختار اور مشتاق مہدی قابل ذکر ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو کے افسانہ نگاروں کی خاصی بڑی تعداد میں ہر ایک افسانہ نگار کے لئے اپنی شناخت تسلیم کروانا آسان کام نہیں، افسانے کی قدر سنجی کے پسِ منظر میں گنتی کے چند نام ہی ہیں، جو افسانے کی ہیئت اور تکنیک کے حوالے سے جدت پسندی سے کام لیتے رہے ہیں۔

یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ ریاست میں نور شاہ اہم افسانہ نگار ہیں جو تجربہ پسندی اور جدت کاری کو بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ وہ اپنے افسانوں کو روایت کی زنجیروں میں جکڑ بند ہونے نہیں دیتے بلکہ افسانے کے پہلے ہی جملے سے بیان کنندہ زندہ اور متحرک ہوجاتا ہے اور چند ہی جملوں کے بعد اپنے لکھنے والے کی تحکیم اور منشا کو مسترد کر کے خود اپنا راستہ بناتا ہے اور جو افسانہ خلق ہوتا ہے وہ زبان کی شگفتگی، جملوں کی خود تراشیدگی، شعریت آمیزی، طنز اور تضاد سے جمالیاتی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس تجربے میں متکلم یا راوی افسانے کی رگ و پے میں لہو کی طرح رواں ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتا ہے۔

قاری کے لئے اس نوع کے افسانے کی تفہیم و تحسین کو کارگر بنانے کے لئے خود قرأت کے آداب میں تبدیلی لانا مُلتزِم ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر نور شاہ کے افسانے روایتی تکنیک و ہیئت سے انحراف کرتے ہیں، تو ان کو فن کے کس خانے میں رکھا جائے گا، اس سوال کا جواب دینے سے قبل یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ افسانے یا شعر کے جو لوازم و آداب رائج ہیں وہ وقت کے تغیر کے ساتھ نئی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی میں مغربی فکشن میں جو افسانوی تکنیک چارلس ڈکنز نے برتی، وہ بیسویں صدی میں جیمز جوئس نے مسترد کی اور یولے نے جیسا ناول لکھا جس میں مرکزی کردار بلوم ایک دن کے واقعات کی تجسیم کرتا ہے۔

نور شاہ نے ''بے ثمر سچ'' کے افسانوں میں افسانہ نگاری کی منقلب اور جدت پسند تکنیک سے کام لیا ہے۔ یہ افسانے روایتی کردار سازی سے ہٹ کر کسی ایک کردار کی ذہنی، جنسی، جذباتی یا نفسیاتی کیفیت کو وقوع پذیر ہونے دیتے ہیں اور وہ اس کیفیت کو مرکز توجہ بناتے ہیں، کردار کسی واقعے سے متصادم ہوتا ہے اور پورا افسانہ ایک شعاع کی طرح ابھرتا ہے اور قاری کے ذہن کو روشن کرتا ہے یہ گویا بجلی کے کوندنے کا عمل ہے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

ایک کامیاب افسانہ نگار کسی وضاحت، تکلم اور خیال آرائی سے کام نہیں لیتا یہ کام وہ قاری کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ نور شاہ کے افسانے بھی کسی آغاز، اختتام، اینٹی کلائمکس، خیال آرائی یا وضاحت کے محتاج نہیں ہوتے، یہ افسانوی تکنیک میں ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔ ادھر جابر حسین اپنے افسانوی مجموعے ''ریت پر خیمہ'' میں کسی واقعے کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں اور اس پر نقد و تبصرہ کو انشائیہ کی صورت عطا کرتے ہیں۔ یہ انشائیہ نما افسانہ، افسانوی ادب کی ایک نئی جہت کو اجاگر کرتا ہے۔

میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ نور شاہ کے تازہ افسانوں میں بھی جنس

کا موضوع حاوی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ادب میں جنس کبھی شجر ممنوعہ نہیں رہا ہے۔ ہمارے باوا آدم اور حوا جنت میں رہ کر بھی اس سے دور نہ رہ سکے اور دنیا میں بھیجے گئے، اور یہاں بھی جنس کی بنیادی جبلّت سے روگردانی نہ کر سکے۔ فرائڈ کے نظریہ جنس سے بین الاقوامی سطح پر کتنے ہی فنکار متاثر ہوئے ہیں اور اسے جمالیاتی آب ورنگ میں پیش کر چکے ہیں۔ نور شاہ کے بعض افسانے ایسے ضرور ہیں جہاں جنس رومانیت اور حسن پرستی میں بدل چکا ہے۔ چونکہ میرا مطالعہ نور شاہ کے افسانوں میں موضوعات جن میں جنسی موضوع بھی شامل ہے، کی تلاش وتعین نہیں ہے۔

''بے ثمر سچ'' میں شامل افسانہ 'لکیریں' کو لیجئے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمارا موقف یہ نہیں ہے کہ اس میں کیا پیش ہوا ہے بلکہ یہ کہ کس طرح پیش ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانے میں مواد، تھیم یا معنی ومطلب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، ان کی اگر کوئی جگہ ہے تو وہ افسانے کے باہر ہے۔ چنانچہ نور شاہ کے افسانے میں غیر ضروری description اور طولانی تفصیلات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

''لکیریں'' کا پہلا ہی جملہ قاری کو افسانے کی فرضیت کی دنیا میں باریاب کراتا ہے:

''اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پرسکون ماحول ایک ڈراونے اور بدصورت روپ میں بدل گیا''۔

اس جملے میں لفظ ''اور'' متکلم کے بیان کردہ واقعے سے قبل کسی نا معلوم واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے، ''اور'' کے بعد ''دیکھتے ہی دیکھتے پرسکون ماحول بے حد ڈروانے اور بدصورت روپ میں بدل گیا''۔ اس شروع کے جملے کے بعد امن وسکون کے ماحول میں کسی شئے کے پھٹنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور پھر گولیاں چلنے کی آواز، اور پھر کثیف بادل اٹھ کر بکھر جاتے ہیں۔ ''بچو اور بچاؤ'' کی آوازیں آتی ہیں اور پھر دھویں میں ایک ''معصوم چیخ'' سنائی دیتی ہے، اور پھر سناٹا اور گولیاں چلنے کی آوازیں بند ہوگئیں، گردو پیش کے لوگوں کے ساتھ متکلم بھی جائے وقوع پر پہنچا، وہاں پہنچ کر متکلم تفکیری لہجے میں کہتا ہے:

''احساسات وخیالات موت اور زندگی کی پیچیدگیوں میں کھو گئے''

اور پھر

''میری نگاہوں کے سامنے وقت کا تیز لاوا بہا اور بے سبب جم گیا''۔

اسکے بعد متکلم مقتول بچے کے بارے میں کہتا ہے:

''ایک چہرہ میرے سامنے تھا، دودھیا رنگ سے بھرے بھرے بے رنگ سادھے ہونٹ، چھوٹی ناک اور اس چہرے میں پوشیدہ معصومیت، پاکیزگی اور تقدس، وہ بچہ جس نے نہ دنیا دیکھی تھی اور نہ ہی دنیاداری، کراس فائرنگ میں اپنی جان کھو چکا تھا، اس کی کتابوں سے بھرا بستہ چھلنی ہو چکا تھا، اور کتابیں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں''۔

لوگوں نے کہا کہ اسے ہسپتال لے چلو، ہسپتال کا نام سنتے ہی میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، لیکن اس کے دائیں ہاتھ کی لکیریں اس کی بے وقت موت پر بے تحاشا ہنس رہی تھیں.....''

اور افسانے کے اختتامی جملے.......

''ہاں وہ مر گیا لیکن اسے کس نے مارا، کس قصور میں مارا، کیا مارنے والا کوئی نقاب پوش تھا یا کوئی وردی پوش یا اپنی مٹھی بھر سیاسی دنیا کو سجانے والا کوئی کھدر پوش..... کوئی تو تھا!

زمین جب اپنی زبان کھولتی ہے تو اتہاس کی کڑیاں مل جاتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ اتہاس کی یہ کڑیاں کتابوں میں دفن ہو جاتی ہیں، ہم سب کی لمبی لکیروں کی طرح..... لکیریں!''

اس مختصر افسانے میں یوں تو ایک واقعہ رونما ہوتا ہے، یعنی پرسکون اور پرامن ماحول میں اچانک کراس فائرنگ میں ایک بچے کی موت واقعہ ہوتی ہے، مگر بات سے بات نکلتی ہے متکلم دوسرے لوگوں کے ساتھ سڑک پر لڑکے کی لاش دیکھتا ہے، خون میں لت پت، اس کی نظر اس کے دائیں ہاتھ کی عمر کی لکیروں پر پڑتی ہے۔ اس کو لگا کہ وہ ''لکیریں اس کی بے وقت موت پر بے تحاشہ ہنس رہی تھیں''۔ اس طنزیہ جملے کے بعد اختتام میں جو مفکرانہ ردِعمل سامنے آتا ہے، اس سے متکلم کے تدبر و تفکر کا اندازہ ہوتا ہے۔

''زمین جب اپنی زبان کھولتی ہے تو اتہاس کی کڑیاں مل جاتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ اتہاس کی یہ کڑیاں کتابوں میں دفن ہو جاتی ہیں، ہم سب کی لمبی لکیروں کی طرح.... لکیریں!''

افسانہ میں جس ماحول میں گولیوں سے ایک لڑکے کی جان لی جاتی ہے اسے نہ صرف سیاسی غارتگری اور خون ریزی کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ ایک عالمگیر انسانی المیہ کی نمود بھی ہوتی ہے۔

الغرض یہ افسانہ بظاہر ایک ہی واقعے پر مبنی دکھائی دیتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، افسانے کے مرکزی واقعے سے چند در چند محجوب و نیم محجوب وقوعوں کی طرح بھی توجہ جاتی ہے۔

۱) معصوم بچے کی بے وقت موت اور اس کی کتابوں کے بستے کے چھلنی ہونے اور ''کتابوں کا سڑک پر بکھرنے'' کا متاثر کن وقوعہ اپنی انفرادی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس پر مستزاد ''اس کے ہاتھ کی لمبی لکیر کا بے تحاشا ہنسنا'' طنزیہ صورت کو اجاگر کرتا ہے۔

۲) افسانے کی سیاسی جہت ''نقاب پوش، وردی پوش اور کھدر پوش'' سے اخذ ہوتی ہے۔

۳) افسانہ حقیقت نگاری کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے اور فرضی صورت حال کو پیش کرتا ہے یہاں تک کہ افسانے میں کراس فائرنگ سے معصوم بچے کی موت کسی خارجی واقعے کے طور پر دکھائی نہیں دیتی، یہ لسانی برتاؤ سے داخلی واقعہ میں بدل جاتی ہے۔

۴) افسانہ پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی سوچے سمجھے مواد یا موضوع کو پیش کرتا ہے اس کا مرکزی واقعہ افسانوی ہے اور اس سے جڑی ہوئی ہر چیز اور مظہر افسانوی ہے۔

۵) افسانہ صرف ایک کردار یعنی متکلم کے عمل اور ردِ عمل پر مرتکز ہے، وہ دردمند، حساس، مفکر اور خود آگاہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

افسانے کا بظاہر خاتمہ ''لکیریں'' پر ہوتا ہے.... اس سے پورا منظر نامہ لکیروں میں بدل جاتا ہے، یہ ایک سریلی منظر ہے۔ افسانوی دنیا میں خاتمے پر لکیریں ہی لکیریں رہ جاتی ہیں اور زندگی اشاریتاً لایعنیت میں بدل جاتی ہے۔



●...... پروفیسر شکیل الرحمان

نور شاہ کی کہانیوں کا تذکرہ

نور شاہ ایک معروف تخلیقی فنکار ہیں، ان کے افسانے موضوع اور تکنیک کی ہم آہنگی کی وجہ سے قاری کے احساس اور جذبے کو فوراً چھو لیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کی تین خصوصیات توجہ طلب ہیں ایک یہ کہ ان کی رومانیت ماحول اور فطرت کے باطن پر اتر جاتی ہے اور پھر کرداروں کے احساس اور جذبے تک پہنچ جاتی ہے۔ ماحول کے حسن و جمال اور کرداروں کے رویوں اور اُن کے عمل میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے جو متاثر کرتی ہے۔

دوسری خصوصیات یہ کہ تخلیقی فنکار ''سیکس'' یا جنسی جذبے میں ایسا ہیجان پیدا کرتا ہے کہ روح اور جسم دونوں کی لذت ایک ساتھ ملنے لگتی ہے بلاشبہ بدن اور اس کے لہو میں جنسی ہیجان سے جو تپش پیدا ہو جاتی ہے وہ زندگی کے سچے جنون کی دین ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ افسانہ نگار اقدارِ زندگی کے پیش نظر اظہار خیال میں بڑا توازن رکھتا ہے اور یہی اُس تخلیقی فنکار کی کامیابی ہے۔ ''خوشبو کا سفر'' ''صلیب'' ''آخری دن کی تلاش'' وغیرہ عورت کی نفسیات کی گرہیں کھولتی ہیں تو افسانہ نگار کی عمدہ فنکاری کی پہچان ہوتی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ کہ چند افسانے ایسے ہیں جو زندگی کی ٹریجڈی کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کے کلیجے پر چوٹ پڑتی ہے۔ ''وہ ایک شخص تھا'' ''ہیلنگ ٹچ'' ''زمین کھولے گی زبان اپنی'' ''لکیریں'' ''ٹوٹتے لمحوں کا بیان'' زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھری کہانیاں

ہیں۔ افسانہ نگار نے حالات اور ماحول کے المیے کی گہرائیوں میں اُترنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان افسانوں کے کردار مثلاً آمنہ کا بڑا بھائی (ہیلنگ ٹچ) خان بابا (وہ جو ایک شخص تھا) چتر کار (پرندے) وغیرہ علامتوں کی حیثیت رکھتے ہیں، جھانکئے تو یہ علامتیں بہت گہری نظر آئیں گی۔

نور شاہ کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے پہلے افسانہ نگار قاری کو لطیف اور لطیف تر رومانی ماحول اور فضا میں کھینچنے کی کوشش کرتا ہے پھر اُس کے بعد زندگی کے سچائیوں اور عورت اور مرد دونوں کی نفسیات کی پیچیدگیوں کو ذہن پر نقش کرتا ہے۔ حسن پسندی اور حسن پرستی میں تخلیقی فنکار کی گہری نظر کا علم ہوتا رہتا ہے مثلاً:

> ''مستی میں ڈوبی دو بڑی بڑی آنکھیں کتابی چہرہ اور اُس چہرے پر نکھرا سرخ و سفید رنگ، نمکین چائے کے رنگ کی شلوار اور اُسی رنگ کی چست قمیض، جسم کا ایک ایک انگ، ایک ایک قوس عیاں دو موٹی موٹی گولائیوں کے درمیان پسینے کے ننھے ننھے قطروں سے ابھرنے والی دھیمی دھیمی خوشبو...... جی چاہتا ہے کہ ان قطروں کو گھول کر پی لیا جائے یا اُن کے عطر بنا کر جسم پر مل لیا جائے۔'' (بے معنی سفر)

حسن کے احساس میں جو تازگی ہے اُن کا لطف ہی دگر ہے۔ نور شاہ کا احساسِ جمال کشمیر کے رنگ و نور کی دین ہے، حسن کا مشاہدہ کرنا اور پھر حسن میں ڈوبتے جانا تخلیقی ذہن کا وہ کارنامہ ہے جو برسوں کی لذت عطا کر جاتا ہے۔ یہاں کشمیری نمکین چائے کا لطف وہی لے سکتے ہیں جو اِس چائے کے رنگ اور اس کی لذت سے کبھی آشنا رہے ہوں۔

نور شارہ کی عمدہ فنکاری کا ثبوت وہاں بھی ملتا ہے جہاں وہ جسم کے حسن کے ساتھ اس جسم کی تشنگی کا نقش احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال ''رات کا سورج'' کے ابتدائی جملوں سے مل جاتی ہے۔

> ''کبھی کبھی میں اپنی بھرپور نظروں سے اپنے جسم کو دیکھتی ہوں اور لاتعلق انداز میں اپنے حسن کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اپنی سُندرتا کے خدوخال سنوارتی ہوں میری یہ حرکت میرے شہوانی

جذبات کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اس سے میرے جمالیاتی احساس کو تسکین ملتی ہے میری اس حرکت سے شاید نرگیست جھلکتی ہو شاید تب ہی میں اپنے ہونٹ آئینے کی ٹھنڈی گداز سطح پر دیکھ کر اپنے ہی عکس کا بوسہ لیتی ہوں۔ اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں عمر بھر پیار کے لئے ترستی رہی ہوں اس جذبے کی تلاش میں جہاں جہاں گئی اندھیرا ہی پایا اور اب کیا میری زندگی کا صرف اندھیاروں سے گزر ہوگا، ان اندھیاروں کا یخ ٹھنڈا دھواں کبھی کبھی مجھے ایک حسین سپنے کی یاد دلاتا ہے۔ یہ سپنا پہلے میری آنکھوں میں جاگا تھا پھر میرے خشک لبوں پر کسی معطر شگوفے کی طرح کھل اُٹھا......

(رات کا سورج)

یہ ابتدائیہ خود ایک مکمل کہانی ہے ایک ایسے کردار کی کہانی جو اپنی نفسیات میں اُلجھا ہوا ہے۔

نور شاہ کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کہانی کی ابتداً قاری کے ذہن کو فوراً اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ رات کا سورج، اس کی عمدہ مثال ہے۔ ''صلیب'' کی ابتدا بھی اسی طرح پر کشش ہے۔

میں تنہا ہوں......!

میرے آنگن میں چنار کا درخت سفید برف میں دبا ہوا بے حد اُداس کھڑا ہے۔ آکاش کی جانب اپنی ننگی باہیں پھیلائے دیکھ رہا ہے۔ ہر شاخ ایک صلیب ہے اور ہر صلیب پر نڈھال عیسیٰ کو خُدا کی تلاش ہے۔ (صلیب)

نور شاہ ایک صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اُن سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ اسلوب کے حُسن کی انفرادیت کے پیش نظر یہ مثال بھی دیکھئے۔

''چاند ایک بوڑھا سوداگر ہے جو ہر چاندنی رات کو اپنی کرنوں کی ایک سیڑھی دھرتی پر پھینکتا ہے اور اس سیڑھی پر سے آہستہ آہستہ اُترتی ہوئی ایک بلی میرے کمرے میں چلی آتی ہے اور اپنی نیلی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگتی ہے اور جب تک کرنوں کی یہ سیڑھی اس دھرتی پر لٹکی

رہتی ہے وہ کبھی میرے کیمرے میں بچھے قالین پر اور کبھی کبھی میرے بستر پر لوٹتی رہتی ہے اور جب یہ سیڑھی چاند کی طرف اُٹھنے لگتی ہے بلی گھبرا کر میرے کمرے سے نکل جاتی ہے اور پھر صبح کی روشنی ساری بستی کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور اس روشنی میں میں اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول کر بستی کو اپنی بھرپور نظروں سے دیکھنے لگتا ہوں مگر میری نظریں صرف سامنے کی حویلی پر ہی جم کر رہ جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ کاش ایسا ہو جائے کہ ایک بار صرف ایک بار اِس حویلی کی ساری عورتیں بلیاں بن کر میرے کمرے میں گھس آئیں میرے جسم کو نوچ کر ڈالیں تا کہ میرے وجود پر لٹکا ہوا زہریلا سانپ جو آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر ان سب عورتوں کو ڈس لینا چاہتا ہے بے موت مر جائے......!(دروازے)

غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ اِس پر اسرار لہجے کے ساتھ ہم آہستہ آہستہ کہانی کے اندر داخل ہونے لگتے ہیں یہ منفرد اسلوب ہمیں کہانی کے باطن میں اُتار دیتا ہے تب احساس ہوتا ہے کہ فنکار کا اسلوب کتنا ظالم ہے۔

کشمیری ماحول کے پس منظر میں ایک بہت ہی تلخ سچائی کا ذکر نور شاہ نے جس فنکارانہ سطح پر کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میرا اشارہ ان کے افسانہ ’’میلنگ پچ‘‘ کی جانب ہے۔ ان جملوں کو پڑھنے سے ایک عجیب سا سناٹا ذہن کو گرفت میں لے لیتا ہے۔’’رات اندھیری ہے نہ چاند کی نرم وسبک روشنی ہے اور نہ ہی ستاروں کی چمک دمک، ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک سیاہ بادلوں کا دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ خلقت سے بھری یہ بستی خالی خالی سی نظر آتی ہے اور میں اپنے بند کمرے میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ اس مختصر سی داستان کا اختتام کب کہاں اور کیسے ہوگا۔ دور بہت دور گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں شاید کراس فائرنگ ہو رہی ہے ان آوازوں سے ان سناٹوں میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے اب تو یہ سناٹے نہ صرف میری بلکہ ہم سب کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔‘‘



● ...... محمد یوسف ٹینگ

ایک دلنشین کولاج

نور شاہ اُردو کے چابکدست، پختہ مشق اور صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں، میں اُن کو نصف صدی سے زیادہ عرصے سے جانتا ہوں۔ اُن کی بول چال اور سبھاؤ میں بڑی سہل پسندی ہے یعنی وہ فوراً گھل مل جاتے ہیں اور دوست بنا لیتے ہیں اُن کے افسانوں کے موضوع بھی زندگی آمیز اور زندگی آموز ہوتے ہیں اور اُن کا بیانیہ بہت رواں دواں، مشکل الفاظ کے بوجھل پتھروں سے آزاد اور جاذب نظر ہوتا ہے۔ اسی لئے اُن کے دوست بہت ہیں اور اُن کو پسند کرنے والے بے شمار، میں بھی اُن کا ایک خاموش مداح لیکن چست قاری رہا ہوں۔ زیر نظر کتاب افسانوں کی نہیں ہے اُن کے افسانوں کے کرداریوں تو زندگی کے بہت قریب ہوتے ہیں لیکن زیر نظر کتاب با قاعدہ گوشت پوست اور اپنے خاص نام اور کام رکھنے والے انسانوں کے خاکوں پر مشتمل ہے، کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ میں ایسے زندہ، تابندہ اور درخشندہ ہم عصروں کے جلوس کا ایک اہم قدم بن گیا ہوں جو یا تو نور شاہ کی طرح میرے بھی دوست تھے نہیں تو جاننے والے رہ چکے ہیں یا جن کے اچھے کاموں اور جن کی کارکردگی کو میں بھی اُن ہی کی طرح دیکھتا رہا ہوں اور اس پر سر دھنتا رہا ہوں۔ نور شاہ نے اچھے سچے لوگوں کے اس مختصر کولاج کو بڑے سلیقے سے سجایا ہے اور یہ ہر حال میں اپنی دلکشی اور شریں نگاری کا قائل کرتے ہیں۔ میں نے اُن کی گنتی کرنا چاہی تو لگا کہ ایک چہرے کے پیچھے اور بہت سے چہرے اُبھرتے جاتے ہیں۔ کچھ ہمارے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں، کچھ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے اور ہمارے راز فاش کرتے ہیں، کچھ

ہماری بانہوں میں بانہیں ڈال کر ہمیں بچپن اور جوانی کی جولانیوں میں لے جاتے ہیں پروفیسر محی الدین حاجنی اور مرزا کمال الدین شیدا، دینا ناتھ نادم اور پروفیسر پرتھوی ناتھ پشپ ہمارے اندر آج بھی تعظیم و تکریم کے جذبات اُبھارتے ہیں۔ کیسر سنگھ مدھوکر، ہنسی نردوش، عابد مناوری نظروں کے سامنے آتے ہیں، اُن کے ساتھ دلچسپ گپ شپ، کھیل تماشوں اور شوخیوں و شرارتوں کی یادیں سلگنے لگتی ہیں۔ نور شاہ کے ان خاکوں میں تفصیلات کا وفور نہیں ہے کہ اُن سے ہماری توجہ ہٹتی بٹتی رہے۔ یہ چند سطروں میں مذکورہ شخص کا آدم قد مرقع کھڑا کر دیتے ہیں، ان کی سہل پسندی اور دلنوازی پر یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ اُنہیں محنت اور مشق کی کوئی کمی ہے، ان کا کینواس ضرور چھوٹا ہے مگر یہ بسوہلی کے میناتور (Miniature) کی طرح دلچسپ، تسکین بخش اور جُرعے میں پیاس بجھانے والی ہیں۔ ان میں پیچ داری بھلے ہی نہ ہو مگر ضرب قلم کا ایسا زور ہے کہ چند نقوش (Strokes) ہی جیتن داس کے پنسل خاکوں کی طرح شخصیت کا جادو جگاتے ہیں ان خاکوں کا بڑا گُن یہ ہے کہ اپنے اختصار اور پھر اپنی کشش کی وجہ سے انہیں قاری چند نظروں میں ہی پڑھ جاتا ہے، میری اطلاعات کے مطابق ان خاکوں کو شائع کرنے والے اخبار کے بہت سے شائستہ مذاق قاری اخبار میں پہلے نور شاہ کے کالم کو پڑھ کر اپنے ذہن شاداب کرتے ہیں اور پھر فرصت سے دوسرے کالموں کو دیکھتے ہیں۔

نور شاہ کی ان تحریروں میں شخصیات کی زندگی اور اُن کے کارناموں کے بارے میں مقید حوالے ملتے ہیں اور اُن پر خاص محنت کی گئی ہے، خود میری معلومات میں بھی ان سے اضافہ ہوا اور بعض دفعہ اتنا کہ مجھے اپنے حوالوں کی ڈائری میں کچھ باتوں کو ٹانک دینا پڑا۔ شخصیات کے امتیاز کو اُبھارنے کے لئے دوسرے اہم قلم کاروں کی مختصر ہی سہی مگر بہت برجستہ آرائیں درج کی گئی ہیں اور کبھی کبھی تو کچھ ایسی سطریں پڑھنے کو ملتی ہیں جنہیں Quoteable Quotes ہی کہا جا سکتا ہے اُن کی چاشنی کا اندازہ کرنے کے لئے صرف دو ایک نمونے........!

☆ وہ انقلابی سپاہی کی بندوق اور موسیقار کے ستار تھے۔

☆ اردو زبان کا ایک نام صابر دت ہے۔

☆ ستیارتھی دنیا بھر کے لوگوں کے لئے لوک گیتوں کو جمع کر کے خود ہی ایک لوک گیت بن گیا ہے

☆ انارکلی بار بار پیدا ہو سکتی ہے لیکن مدھو بالا نہیں۔

کتاب میں ہر درجے اور ہر سطح کی شخصیات سے ہماری ملاقات ہوتی ہے کچھ ایسے کہ وہ ہماری ذہنی تفریح کے جادوئی پٹارے کا حصہ ہیں جیسے ملکہ ترنم نور جہاں، فلم شعلے کا گبر سنگھ یعنی امجد خان، گلوکار محمد رفیع اور موسیقار اعظم نوشاد علی وغیرہ۔ کتاب کی ہر سطر ایک گلی بنتی ہے، جانے پہچانے چیزوں کی آوازیں ہماری توجہ کو مبذول کرتی ہیں اور اس کا ہر صفحہ ایک بازار، جس میں ہمارے دیکھے سُنے ہوئے بڑے لوگوں کے چہرے بشرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نور شاہ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے ان سب کو ہمارے حافظے کے بھولے بسرے طاقچوں سے نکالا ہے، اُنہیں نئی پوشاکیں پہنائی ہیں اور طرح طرح کی خوشبوؤں میں شرابور کرنے کے بعد اُنہیں ہمارے سامنے لایا ہے، اتنی خوش اندازی سے ہم اُن کو پہچاننے اور اُن کے اچھے کام یاد کرنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتے، یہ خاکے مقامی مگر موقر روزنامے ''کشمیر عظمیٰ'' میں ایک عرصے سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں نور شاہ کبھی کبھی ان خاکوں کی توسط سے ایک پورے تہذیبی منظر کو کھولتے ہیں مثلاً لتا منگیشکر کے حوالے سے ہندوستانی فلموں کے سرساگر کی اور دینا ناتھ نادم کی معرفت سے کشمیر کے ادبی اور تہذیبی منظر نامے کی۔

اس کتاب کی یہ خوبی مجھے اچھی لگی کہ یہ آج کے چھوٹے موبائل فون سیٹ کی طرح یوں تو چھوٹی سی لگتی ہے مگر اس سوئچ بورڈ کے نیچے بہت سی مسرتوں اور معلومات کے سُر چھپے ہوئے ہیں۔ کتاب کو ہاتھ میں لے کر پڑھنے ہی کی نہیں پی جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ ہمارے اُردو کے سکڑتے ہوئے حلقہ قارئین کو بڑھانے کے دم خم بھی رکھتی ہے۔ اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سال اور اس سے زیادہ لمبے عرصے میں ہمارے یہاں ابھرنے اور جدا ہونے

والے اچھے لوگوں کو اُن کی آن بان کے ساتھ پھر ہمارے سامنے لایا گیا ہے اور وہ ہمارے کمزور حافظوں میں پھر ستاروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔

ان خاکوں کی خوبی کی بات تو ہو چکی لیکن ان کے متعلق اگر کسی قاری کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اس میں سارے کے سارے کردار تاباں اور درخشاں، سچے اور اچھے ہی نظر آتے ہیں حالانکہ ہم مٹی کے ماتے اکثر صورتوں میں اچھے اور برے دونوں طرح کے اطوار اور کردار رکھتے ہیں اور انسان کے قالب میں چھپا ہوا نور اسی کے پہلو میں چھپے ہوئے نار سے الگ نہیں کیا جاسکتا تو اس کے معقولیت کو ٹالا نہیں جاسکتا مگر میں سمجھتا ہوں کہ گزرے ہوئے دوستوں کی بھلائی کو اُبھارنا اخلاق اور آداب کا ایک اہم حصہ ہے اور پھر یہ نور شاہ کی تہذیب نفس کے علاوہ خوب گوئی کے تقاضوں کی بھی بازگشت ہے اکثر مقامات پر قاری کی زبان پر ہمارے مشاعروں کا وہ خوبصورت نعرہ آجاتا ہے......مکرر ارشاد...... باقی رہا ان شخصیات کی کچھ کمزوریاں ہماری زبان تو اس معاملے میں قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے اور سارا حساب برابر کرتی ہے......!!!



● ...... ویدراہی

نور شاہ کی کشمیر کہانی

میں نے پہلی بار دیکھا ہے کہ کسی افسانہ نگاری کی افسانہ نگاری نے اپنے پچاس سال کے سفر کے بعد ایک نیا موڑ لیا ہو، یقیناً یہ ایک مثبت اور قابلِ ستائش روّیہ ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے آپ کو روکا نہیں اور لاشعور کا کہا مانتے ہوئے زمینی حقیقت کو اپنا لیا۔

میں یہاں کشمیر کے معروف افسانہ نگار نور شاہ کی بات کر رہا ہوں۔ کئی برس پہلے اُنہوں نے اپنے ایک افسانوی مجموعہ کا پیش لفظ لکھتے ہوئے کہا تھا، مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے کوئی تامل نہیں کہ میرے افسانوں کے اکثر و بیشتر کردار رومانوی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں۔ دراصل وادی کے جس حصے میں، میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا ہے اور جوانی کے ایام جیئے ہیں وہ ڈل جھیل کے آس پاس کے کچھ حصے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہاڑ، پانی، اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے اس جگہ میرے احساسِ جمال کی پرورش ہوئی ہے اور حسن جو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے لاشعوری طور پر میری کہانیوں میں منعکس ہوتا ہے۔ یہاں کہنا چاہوں گا کہ کثافت ماحول میں ہو، اطراف میں ہو یا کرداروں کے ذہن و دل میں میری چشمِ وا اُن سب کو قبول کرنے سے کتراتی ہے۔''

یہ وقت کی ستم ظریفی ہے کہ نور شاہ کے تازہ افسانوی مجموعہ ''کشمیری کہانی'' میں وہ رومان کہیں نظر نہیں آتا جو ڈل جھیل کی روح پرور شاداب فضاؤں نے اُن کی سائیکی میں ڈھالا تھا۔ تقریباً ان تمام افسانوں میں اُس سنگینی حالات کی عکاسی ہے جس میں سے یہ بدنصیب وادی

پچھلی ایک چوتھائی سے گزر رہی ہے۔ ان افسانوں میں نہ گلپوش وادیاں ہیں نہ سبزہ اور نیلی جھیلیں ہیں نہ خواب بھرے غزار، نہ سرخی مائل چنار، نہ لانبے لانبے سفیدے، نہ لمحوں کو معطر بنانے والی فضائیں۔ اب ان افسانوں میں وجود کی دَلدل ہے، بے پروبال بوڑھے عقاب ہیں، سڑکوں پر بہتی ہوئی خون کی لکیریں ہیں۔ بے نام قبروں پر سسکتے ہوئے پتے ہیں، بکتے ہوئے خواب ہیں، درد و کرب سے بوجھل فضائیں ہیں، مجروح ابابیلیں اور ہڈیوں کے سوداگر ہیں۔

میں دم بخود ہوں ان افسانوں کو پڑھ کر۔ وہ افسانہ نگار جس کی سائیکی میں رومان تھا، جس نے کہا تھا کہ اُس کی چشم واکسی کثافت کو قبول نہیں کرتی، اب اُس نے زندگی کی تلخ ترین حقیقتوں کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ میں سوچتا ہوں نور شاہ کے رومانی رجحانات نے کیسے اس شکست کو تسلیم کرلیا۔ کیا وہ صرف خود فریبی تھی۔ میرا خیال ہے یہ تبدیلی ایک ایماندار مصنف کا احساس خود شناسی ہے۔ ایک حقیقی افسانہ نگار کا حسن فن ہے کہ اُس نے اپنے عہد کی نبض کو پہچانا اور اپنی قلم کو وقت کا نباض بنا دیا۔ اُسے احساس ہوا ہے کہ کہانی صلیب پر لٹک گئی ہے۔ تو اُسے بھی صلیب اُٹھانے میں کوئی عار نہیں۔

''کشمیر کہانی'' میں بیس افسانے ہیں اور تین ڈرامے۔ ڈراموں کے موضوعات بھی کشمیر کے موجودہ حالات کے عکاس ہیں۔ ''کوئی رونے والا نہیں'' افسانہ کی آخری سطروں میں اُس کے ایک کردار ڈاکٹر کا بیان یہاں درج کرنا چاہتا ہوں۔

''میں ابھی ابھی پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آیا ہوں۔ آپریشن ٹیبل پر جس لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ وہ بھی گینگ ریپ کی شکار ہوئی، پولیس ابھی آرہی ہوگی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لینے کے لیے۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے میرا فرض بنتا ہے کہ پوسٹ مارٹم کرتے سمے جو ثبوت میرے ہاتھ آئے ہیں میں اُنہیں پولیس کے حوالے کروں۔ سوچ رہا ہوں میرے ایسا کرنے سے کیا اُن کے لمبے ہاتھ مجرموں کو چھو سکیں گے؟ ہاں میں جانتا ہوں اور مجھے احساس ہے کہ ایسا کرتے ہی کسی اَن دیکھی بندوق سے گولیاں اُگلیں گی جو میرے وجود کو لہولہان

کردیں گی۔ پھر مجھ پر بھی رونے والا کوئی نہیں ہوگا''۔

اس اقتباس سے کہانی تو کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے لیکن کشمیر کا اندرونی کرب پوری طرح عیاں ہوتا ہے اور ہمیں بے چین کر دیتا ہے۔ اُداس کر دیتا ہے۔ ہم دور تک سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر اس المیہ کی جڑ کہاں ہے؟ کیا ہم اُس خطہ ارض کو فردوس بر روئے زمین کہہ سکتے ہیں جہاں خوب صورت لڑکیوں کو اس طور درندگی کا شکار ہونا پڑتا ہے؟

ایک اور افسانہ ''یہی سچ ہے'' کا یہ اقتباس دیکھئے۔

''اجنبی کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ میں حلیمہ ہوں۔ ماں کے ساتھ اپنے رشتہ داروں کے ہاں دعوت پر جارہی تھی۔ بس اسٹینڈ پر جانے کیا ہوا۔ کسی نے گرینیڈ پھینکا۔ کسی نے گولیاں چلائیں۔ ہم ماں بیٹی خون میں لت پت ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوگئیں۔ بہت محبت کرتی تھی میں اپنی ماں سے جانے میرا چھوٹا بھائی کہاں ہے۔ کیسے ہے۔ تم جانتے ہو اُسے؟ تم نے اُسے دیکھا ہے کیا وہ سکول جاتا ہے؟ کیا کوئی اُسے پیار کرتا ہے''۔

اسی افسانے کی چند سطریں اور دیکھئے۔

''اب ہر طرف سناٹا ہے۔ قبروں کے منہ بند ہو چکے ہیں۔ فضا میں اُبھرتی ہوئی سرد آہیں خاموش ہیں اب میرے سوا کوئی اس قبرستان میں نہیں۔ میرے سامنے کی زمین اندر دھنستی جارہی ہے میں جہاں کھڑا ہوں وہاں نہ سر پر آسمان ہے نہ قدموں کے نیچے زمین۔ دونوں طرف خلاء ہے۔ ایک وسیع خلاء مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں بھی اس خلاء میں ہمیشہ کے لیے پوشیدہ ہو جاؤں گا اور پھر اس قبرستان میں ایک اور بے نام قبر کا اضافہ ہو جائے گا۔ میں زور زور سے قرآن کریم کی آیتیں پڑھنے لگتا ہوں۔''

افسانہ ''کرب ریزے'' کی یہ گفتگو سنیئے:

''ابو''

''کہو بیٹا''

''میں اپنے بھائی کی قبر دیکھنا چاہتی ہوں''

'بیٹا ان لاتعداد قبروں میں کیسے ڈھونڈو گی اپنے بھائی کی قبر'

''کیا؟''

''ہاں بیٹا وہاں بہت ساری بے نام قبریں ہیں۔''

''میں وہاں جا کر اُن سبھی بے نام قبروں پر اپنی عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کرنا چاہتی ہوں۔ اُس مٹی کو چھونا چاہتی ہوں جس نے میرے بھائی جیسے اَن گنت معصوموں کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا ہے۔''

''سرخ بستی'' انتہائی دلسوز افسانوں میں سے ایک ہے جسے پڑھ کر دل گرفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک جوان ماں اپنے دو ننھے بیٹوں کو لے کر ایک پل کے درمیان کھڑی ہے خودکشی کے ارادے سے بیٹوں کو ساتھ لے کر دریا میں کودنا چاہتی ہے۔ وہ مسلسل سوچے جارہی ہے میرے یہ دونوں بیٹے زندگی سے بھرپور ہیں میں کیسے انہیں موت کو سونپ دوں، ان کی چیخیں جہلم دریا کا سینہ چیر دیں گی۔ ہواؤں کے قدم رُک جائیں گے۔ فضائیں جم جائیں گی، کائنات کا دم گھٹ جائے گا۔ یہ چیخیں قیامت تک ہر اُس ماں کو سنائی دیں گی جو اس پل پر سے گزرے گی۔ سوچوں کی شدت سے گھبرا کر وہ بچوں کو لے کر گھر لوٹ آتی ہے اُس کے دونوں بیٹے صابر اور سلمان اُس سے پوچھتے ہیں۔

''امی اب تو بتاؤ کہ ابو کہاں گئے ہیں؟''

''تمہارے ابو اب ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اسی گھر میں۔ مگر تم اُنہیں دیکھ نہیں سکتے۔''

''کیوں؟ کیوں امی''

اب کوئی اُنہیں کیسے سمجھائے کہ کشمیر کی سُرخ بستی میں ان گنت بے نام قبروں کی تلاش کرنا اُس کے لیے ممکن نہیں۔

ہوش وحواس گم کردینے والے اور افسانے بھی ہیں۔

''آسمان، پھول اور لہو'' اور ''لمبی عمر کی لکیریں'' ایسے ہی افسانے ہیں جنہیں پڑھ کر لگتا ہے انسانیت ان حادثوں کو کیسے برداشت کرتی ہے۔

''لمبی عمر کی لکیریں'' میں کراس فائرنگ کے دوران بے وقت کی موت مرنے والے کو سہارا دیتے ہوئے ایک شخص کی نظر اُس کی ہاتھ کی لکیروں پر پڑ گئی۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوئی کہ اُس ہاتھ پر اُس کی عمر کی لکیریں کافی لمبی تھیں۔ پھر وہ کیوں کر مرا؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا لکیریں جھوٹی تھیں؟ جس گولی سے وہ مرا ہے کیا اُس کی طاقت ان لکیروں سے زیادہ تھی؟ اور پھر وہ مرا ہی کیوں، وہ نہ اس طرف تھا نہ اُس طرف؟ پھر وہ شخص اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ اُسے یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کیوں اُس کے لیے اتنا اُداس ہے۔ اُس نے تو پہلے کبھی اُسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر اُسے خیال آتا ہے نہیں اُس کا اُس مرنے والے سے کوئی رشتہ ضرور ہے۔ اُس سے کچھ تو قربت ہے جو اُس کے لیے اتنا سوچ رہا ہے۔ آخر اُس کو کس نے مارا؟ کیوں مارا؟ اُس کا کیا قصور تھا؟ کیا مارنے والا کوئی نقاب پوش تھا؟ کوئی وردی پوش تھا یا مٹھی بھر سیاسی دنیا کو چمکانے والا کوئی کھدّر پوش یا ٹوپی پوش؟ کوئی تو تھا۔

نور شاہ کی کہانیوں میں سوال تو بہت ہیں مگر جواب ندارد ہیں۔ سوال اُٹھانا ہی ادب کا فریضہ ہے۔ جواب تو وقت کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ وقت ہی وقت آنے پر وہ پردے اُٹھاتا ہے۔ اُسے ہی اتہاس کہا جاتا ہے۔

افسانہ نگار نور شاہ نے مکمل طور پر اپنے حسیاتی تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر حقیقتوں کی پردہ کشائی کرتے ہوئے فنی ردّ و بدل کیے ہیں۔ ہیئت کی چابکدستیوں کی بجائے اصلیت پر زیادہ توجہ دی ہے۔ بہت جگہوں پر افسانے کا آکار چھوٹا کر دیا ہے۔ بعض افسانوں میں نقطۂ عروج کی تندی، تیزی سے انحراف کیا ہے۔ عام طور پر وقائع نگاری پر سپاٹ بیانی کو ترجیح دی ہے۔ اپنی رومانیت کے ساتھ اُنہوں نے جو ایک لمبا سفر طے کیا ہے اُسے وہ کہیں راستے میں چھوڑ آئے ہیں۔

اس مجموعہ میں مجھے جو سب سے اچھی کہانی لگی ہے وہ ہے ''درد آئے گا دبے پاؤں'' یہ

ایک علامتی افسانہ ہے اسے رومان کا المیہ کہہ سکتے ہیں اس افسانے کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ اس افسانہ کی علامت اس کے مرکزی خیال سے روایتی ساخت کو رڈ کرتی ہوئی اپنے رنگ و روپ کو خود اُجاگر کرتی ہے۔ اس کا علامتی ہونا ضروری تھا۔ ورنہ وہ بات باہر نہ آتی جس نے افسانہ نگار کو یہ افسانہ لکھنے پر مجبور کیا۔ اسی لیے اس میں کہیں کوئی ابہام نہیں۔ افسانے کی بلیغ بنت بہت فصیح ہے۔ وادی سے ہجرت کر گئی آشارانی کا استعارا دھوپ ہے اور ایک شکستہ دیوار ہجرت نہ کرنے والے نوجوان کی تصویر شکست ہے۔ دھوپ آتی ہے، جاتی ہے اور دیوار ایک ہی جگہ قائم ہے جب دھوپ کبھی آ کر دیوار سے ہم آغوش ہوتی ہے تو دیوار کانپ اُٹھتی ہے۔ دونوں کے درمیان کچھ اس طرح کی گفتگو سنائی دیتی ہے۔

''اپنی مٹی اپنی مٹی ہوتی ہے، یہاں جو بھی ہوا جس وجہ سے بھی ہوا کیا صرف یہیں ہوتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہاں سے باہر کی دنیا میں بھی دیوانگی ہے، بندوقیں ہیں گولیاں ہیں، بھوک ہے، مجبوریاں ہیں۔''

'یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں جو کہہ رہی ہوں وہ ایک حقیقت ہے۔ کہاں ملتے ہیں اُن ریگزاروں میں کشمیری نغمے جن میں شیرینی ہے نکہت ہے، نیلگوں پانی کا نور ہے، خواب آلودہ راتوں کی مہک ہے، بزرگوں کی عظمت کا اعتراف ہے''۔

''میں من ہی من میں سوچنے لگا کاش جانے والے لوٹ آتے اپنی دھرتی کی گود میں کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سایہ بن کر ڈھل جائیں۔ مجھے احساس ہے صبح صادق اگرچہ ابھی دور ہے لیکن تنگ راستوں پر گمنام روشنی پھیل رہی ہے۔''

''کشمیر کہانی'' میں تین ڈرامے بھی ہیں شاید اُنہیں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اُن کا نفسِ مضمون بھی افسانوں کی مانند آئینہ عصر ہی ہے۔ ''سفر زندگی کا'' بہت اچھا ڈرامہ لگا مجھے۔ واقعات کا تار پود بہترین ڈھنگ سے بنا گیا ہے۔ آمنہ اور شکیل کے پاپا کی سرشت میں بد باطنی ہے جس

کی وجہ سے اُس کی بیوی نے اپنی جان دے دی تھی۔ آمنہ اور شکیل کی پرورش میں پڑوس کی ایک ہندو عورت دُلاری آنٹی کا بڑا تعاون ہے۔ جب حالت بگڑے تو دلاری کے گھر کے سبھی افراد ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن دلاری گھر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔اُس کے خاندان کے سبھی افراد اُسے اکیلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ آمنہ اور شکیل کا پاپا دلاری کے مکان پر قبضہ جمانے کی سازش بنا چکا ہے لیکن شکیل اُسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ باپ اور بیٹے کا تصادم بڑی ہنرمندی سے اس ڈرامے میں اُبھرا ہے ڈرامے کا اختتام شکیل کے ایک خط کی صورت میں ہے۔دیکھئے۔

''پاپا آپ جانتے ہیں پچھلے چند برسوں میں یہاں کے حالات نے کیسا رُخ اختیار کیا ہے۔خوف کی تلوار سر پر لٹکی رہی کتنے لوگ گھر سے بے گھر ہوئے۔ کتنے لوگ اپنے ہی گھروں میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کرتے رہے۔ کتنے بچے یتیم ہوگئے۔ کتنی مائیں، بہنیں بیوہ ہوگئیں۔ روزگار کے راستے مسدود ہوگئے۔ تعلیمی اداروں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ کچھ غرض کے دیوانوں نے اس صورت حال کا ناجائز فایدہ اُٹھایا۔اپنی چالاکی اور شاطرانہ چالوں سے لوٹ مچائی۔ پاپا میری باتوں کا برا نہ مانیں...... میں آپ کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ آپ میری بات مان لیں۔ آمنہ کو grow ہونے کا موقع دیں..... اور ایک بات دُلاری آنٹی کہیں نہیں جائے گی وہ اپنے گھر میں ہمیشہ کی طرح رہے گی۔انہوں نے ہمیں ماں کا پیار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پورے ماحول میں اُن کی حیثیت ایک پل کی سی ہے۔ایک ایسے پُل کی جو دو کناروں کو آپس میں ملاتا ہے''۔

اس ڈرامے میں ایک راست بغاوت بھی ہے اور دردمندی بھی۔نورشاہ کی سوچ میں غضب کا توازن ہے۔اُن کی ایمانداری قاری پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔اُن کا قلم ہنگامہ گیری سے بچ کر چلتا ہے۔اُن کی تحریر میں انسان دوستی کا جذبہ ہے۔اُن کے افسانے اُن مظلوموں کی زبان بن گئے ہیں جن کا پُرسانِ حال کوئی نہیں۔جن کی آواز کو حاشئے پر ڈال دیا گیا ہے۔

''کشمیر کہانی'' کے بیشتر افسانوں کو پڑھ کر تقسیم ملک پر لکھی گئی کئی کہانیوں کی یاد آتی ہے۔ جیسے منٹو کی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' راجندر سنگھ بیدی کی ''لاجونتی''، اشفاق احمد کی ''گڈریا'' اے۔حمید کی ''پتر اناراں دے'' بھیشم ساہنی کی ''امرتسر آگیا'' وغیرہ، میرا خیال ہے نور شاہ کے افسانوں نے رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف جو پیش قدمی کی ہے وہ بہت ہی نیک شگون ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہانی کا فن وقت کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا اور کئی منزلوں پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ دے گا



●......پروفیسر قدوس جاوید

نورشاہ: کشمیر، کرب، کہانی

بیانیات (Narratology) کے تقاضوں کے مطابق، افسانے کا افسانہ ہونا ضروری ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے افسانے کا متن رومانی ہے یا حقیقت پسندانہ، سادہ و سہل ہے یا علامتی واساطیری اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے، لیکن اس کلیے کا اطلاق اسی افسانہ نگار کے افسانوں پر ہوسکتا ہے جو افسانہ لکھتا نہیں، اپنے پورے وجود کے ساتھ افسانہ ''جیتا'' ہے، کیوں کہ افسانہ/ ناول محض لسانی وادبی اظہار نہیں، فکشن نگار کے وجود کے اندر اور باہر کی زندگی اور زمانہ کے مضمرات و امکانات کو اپنے تمام تر تخلیقی اور دانشورانہ امکانات کے ساتھ جینے کا فنی و جمالیاتی وسیلہ ہوتا ہے۔ اسی لئے آج کی تاریخ میں، دیگر اصناف کے مقابلے میں سب سے زیادہ ''سماج مرکز'' افسانہ اور ناول ہی ہیں، ہاں، چونکہ افسانہ/ ناول کی بھی اپنی شعریات ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر معتبر افسانہ نگار کے یہاں (جیسا کہ نورشاہ ہیں) جینے کے کسی بھی عمل اور انداز کے بیان میں اس شعریات کے احترام کے ساتھ اس کی تخلیقیت (Creativity) کے انفراد وامتیاز کا چھڑکاؤ بھی لازمی طور پر سامنے آتا ہے۔

نورشاہ نے کم وبیش نصف صدی سے زائد عرصے کو محیط اپنے ادبی سفر کے دوران کتنے افسانے لکھے یہ غالباً نورشاہ کو بھی یاد نہیں ہوگا لیکن تقسیم ملک کے آس پاس سے لے کر آج ۲۰۱۳ء تک نورشاہ کی جو تحریریں تواتر کے ساتھ سامنے آرہی ہیں ان سب کو ذہن میں رکھیں تو معلوم ہوگا کہ ابتدا میں نورشاہ نے ''بیسویں صدی'' جیسے رسالوں کے لئے جو افسانے لکھے، ان میں سے

بیشتر کو ''مشقِ سخن'' کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔ گرچہ اس ابتدائی دور کے بھی بعض فسانے یاد گار ہیں، لیکن خاص طور پر ماہنامہ کتاب لکھنؤ، شب خون (الہ آباد) کے علاوہ نقوش، ادبِ لطیف (پاکستان) وغیرہ رسالوں میں نور شاہ کے جو افسانے شائع ہوئے وہ بطور خاص کشمیر کی روحِ عصر کے مؤثر ترجمان ہیں اور ان کے طفیل ہی خود نور شاہ کا شمار ایک عرصہ سے اُردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

نور شاہ کے ابتدائی افسانوں میں تخلیقِ فن کی عام روش، جمالِ فطرت سے قربت، شعورِ جسم (Body Conciousness) کی لطافت اور عام قارئین کی پسندیدگی کے سبب نور شاہ کی تخلیقیت پر حسن پرستی اور رومانیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور بعض ناقدین کی نظروں میں رومانیت نور شاہ کے فن کی بنیادی شناخت ہے۔ نور شاہ نے اپنے افسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ'' میں ''اپنی بات'' کے عنوان سے اپنے تخلیقی محرکات اور میلانات پر روشنی ڈالتے ہوئے خود بھی لکھا ہے!

''میرے افسانوں کے اکثر کردار رومانوی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے ہی پھوٹتے ہیں...... زندگی حسن و عشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان ہی سے قائم ہے۔''

نور شاہ نے اشاراتی انداز میں یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے جوانی کے ایام سرینگر کے ڈل جھیل کے آس پاس اس حصے میں گزارے ہیں جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے، وادی کے اسی حصے میں میرے احساسِ جمال کی پرورش ہوئی۔

دراصل یہ ایک نفسیاتی سچ ہے۔ مشہور ساختیاتی مفکر رولاں بارتھ (Barth Rolland) کا قول ہے کہ ''کوئی بھی جینوین فنکار خواہ جتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے اپنے معاشرہ اپنی ثقافت کی جانب سے آنکھیں بند کر کے عمدہ فن پارے کی تخلیق نہیں کرسکتا۔ ژولیا کرسٹیو (Julia Kristeva) نے بھی اپنی تحریر (The Desire of Language) میں کسی بھی متن، لفظ یا نظام (System) کی تشکیل کے ضمن میں انسانی ذہن کے تخلیقی رویوں سے بحث کرتے

ہوئے لاشعور کی کارکردگی سے متعلق فرائیڈ کے بیان کردہ دو مرحلوں (Displacement) اور (Condensation) میں اپنی جانب سے ایک تیسرے مرحلے Passage ہے کی نشاندہی کی ہے اور کہا ہے کہ لاشعور کا یہ مقام Passage کسی بھی فنکار کے فن کے رنگ، رجحان، مزاج او رمیلان کو سمت عطا کرتا ہے اور اسی کے سبب کسی کی تخلیق، رومانی یا حقیقت پسندانہ، انقلابی، مذہبی، اصلاحی یا ثقافتی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ Passage ٹھوس اور جامد نہیں، سیال اور تغیر پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ نور شاہ ایک عرصہ تک فطرت پسندی حسن پرستی اور معاملاتِ عشق کے حوالے سے جسم و جان کے رومانی اسرار میں الجھے رہے اور عام قارئین کی پذیرائی، شہرت اور مقبولیت کے سبب ایک عرصہ تک انہوں نے رومانیت کا حصار توڑنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی بلکہ بعض افسانوں میں نور شاہ کا رومانی مزاج شعور کے حوالے سے ''غیر ضروری طور پر'' جنسیت'' کی حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے، مثلاً

''......دونوں نیم عریاں جسم فرش کی سطح پر اور بھی پھسل جاتے ہیں۔ حسن بہکنے لگا ہے، دھڑکنیں سلگنے لگی۔ سانسوں سے آگ برسنے لگی ہے...... میرا جسم برف کا ڈھیر ہے...... میرے جسم کی ساری گرمی پریا کے جسم میں منجمد ہو چکی ہے۔''

لیکن جنسیت کی ایسی چند ایک مثالوں کے باوجود منٹو کی طرح نور شاہ کو بھی جنس نگار نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی نور شاہ اپنے عمومی سیاق و سباق میں جنسیت کو فروغ دینے سے دلچسپی رکھتے ہیں حالانکہ اولادِ آدم کی سرشت میں جنس ایک لازمہ ہے لیکن تہذیب و توازن شرط ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمن نے نور شاہ کے اس طرح کے افسانوں کے حوالے سے کہا ہے۔ ''بلاشبہ بدن اور اس کے لہو میں جنسی ہیجان سے جو تپش پیدا ہو جاتی ہے وہ زندگی کے سچے جنوں کی دین ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر بڑا افسانہ نگار اقدار زندگی کے پیش نظر اظہار خیال میں توازن رکھتا ہے اور یہی اس تخلیقی فن کار (نور شاہ) کی کامیابی ہے۔''

لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہر جینوین شاعر یا ادیب کسی مخصوص موضوع، اسلوب اور

میلان کا مستقل پابند نہیں ہوتا، ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ ہر عہد کے اپنے تقاضے Episteme ہوتے ہیں جن سے چاہتے ہوئے بھی شاعر یا ادیب منہ نہیں موڑ سکتا۔ دراصل آزادی/تقسیم ملک کے آس پاس سے ہی ادب بالخصوص فکشن میں جذبہ واحساس اور تخیل وتصور پر محسوس یا نا محسوس طور پر ارضیت کے حوالے سے فکر و دانش، تجربہ و مشاہدہ اور تجزیہ و تحلیل کا غلبہ شروع ہو گیا تھا۔ کشمیر میں ۴۸-۱۹۴۷ء (تقسیم ملک) ۱۹۵۳ء (شیخ عبداللہ کی گرفتاری)، ۷۲-۱۹۷۱ء (قیام بنگلہ دیش کے بعد شیخ عبداللہ کی اقتدار میں واپسی) اور ۱۹۸۹ء (عسکریت کا آغاز) کے حوالے سے کشمیر کی سماجیات، سیاست، معاشیات اور ثقافت میں جو غیر متوقع اتار چڑھاؤ پیدا ہوئے اس کے سبب ساٹھ سال کے عرصے کو محیط کشمیر کا یہ پورا زمانہ گویا رنج والم، جبر و زیادتی کا گواہ بن گیا۔ گھٹن سے بھرے سیاہ دنوں اور خونبار راتوں میں در و دیوار سے رونے اور سسکنے کی آوازیں آتی ہیں کچی پکی جوانیوں کی فصلیں اس طرح کاٹی جاتی رہیں گویا پوری کشمیری قوم پیدا ہی ہوئی ہے مرنے کے لئے، محبت و اخوت کی کوئی شاخ ہری نہیں رہی۔ زمانے کی گردش نے ایک پر اسرار خاموشی پسار دی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کشمیر، کشمیر نہیں نامساعد حالات کی ایک کال کوٹھری ہے جس کے اندر کشمیری قوم سلاخیں تو گن سکتی ہے، اس سے باہر نہیں نکل سکتی کیونکہ آزاد فضا کی طرف کھلنے والے دروازوں پر تو قفل ہیں یا سنگین بردار کالے دیوؤں کے سائے۔ ان حالات میں یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ نور شاہ شرافت، انسان دوستی اور فرقہ وارانہ یکجہتی کے مثالی پیکر گھروں، دروں، دلوں اور چہروں پر پھیلی ہوئی ویرانیوں کو نظر انداز کر دیتے اور اُن کے پیچھے کی مہیب سچائیوں کو اپنی تخلیقیت اپنی دانشوری کا حصہ نہ بناتے۔

ایک وقت تھا جب دوسروں کی طرح نور شاہ کے لئے بھی کشمیر بہشت تھا، جہاں ہر چہار طرف زندگی امن و آشتی اور حسن و عشق سے عبارت تھی۔ بیسویں صدی کے اخیر تک نور شاہ کے اکثر و بیشتر افسانوں میں جس احساس جمال کے مرقعے یہاں وہاں نظر آتے ہیں وہ ان کے رومانی اور جمالیاتی مزاج (Aesthetic Passage) کا پرتو ہیں:

''کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف ہے۔ ہری بھری شاداب وادی، سندر دھرتی ...... پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جہاں بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے، سبز ہے۔ یہاں پھولوں سے جڑی ہوئی مرگیں ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں سے سجے سنورے تختے ہیں جن کی خوشبو میں سیاحوں اور یاتریوں کی سانسیں رچی بسی ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام ہے یہ شالیمار ہے اور یہ نشاط ہے نور جہاں کے خوابوں کا باغ...... یہ کل کل کرتی ندیاں، ...... بید کے پیڑوں کی قطاریں، چنار کے پتوں کا لال رنگ...... سفیدے کے لمبے لمبے پیڑ......''

افسانہ۔ اندھیرے اُجالے

''سامنے کی کھڑکی کھول دو تو جھیل کے پانیوں سے ہنستے کھیلتے کنول کے پھول...... ہاؤس بوٹوں کی لمبی قطاریں، ڈوبتے اُبھرتے سورج کا منظر نگاہوں میں اُتھل پتھل مچا دیتا ہے خاموش راتوں کی چاندنی میں پری محل کے کھنڈرات سے ان دیکھی پریوں کے گیت سنائی دیتے ہیں۔''

افسانہ۔ بے جڑ پودے

لیکن جیسا کہ جون توسا (Jahn Tusa) نے اپنی تحریر Art Matters میں کہا ہے'' سچے ادیب کا فن منجمد اور یک رنگ نہیں ہوتا۔ وقت زندگی اور زمانہ کے تغیرات کے ساتھ اس کے فن میں بھی روانی، تازگی اور تہہ داری پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اپنے گرد و پیش کی آوازوں کو گرفت میں لینا، گزرے ہوئے تجربوں کو یاد رکھنا اور ہجوم کی بے چہرگی، بے سمتی اور کٹر پن (Dogmatism) کو تحلیل کرتے ہوئے اپنی فنکارانہ انفرادیت کو برقرار رکھنا ادیب کی عظمت کی دلیل بھی ہے اور مجبوری بھی کہ یکسانیت ادب میں ہو یا زندگی میں، بہر حال اُکتاہٹ پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ جب کشمیر کے مقدر میں ویرانیوں کی دراندازی ہوئی، جہلم اور ولر کے پانی کا رنگ سرخ ہوا اور فضاؤں میں سیبوں اور ناشپاتیوں کی خوشبوؤں کی جگہ بارود کی بو نے گھیر لی تو زندگی کی طرح ادب کے تخلیقی اور فکری سروکاروں اور اظہاری رویوں میں بھی تبدیلیاں رونما

ہوئیں جس کے سبب رومانیت اور تصوریت کے دلدادہ نور شاہ کا فن بھی گرینیڈ دھماکوں، قتل وخوں ، آبرو ریزی اور عدمِ تحفظ کے زائیدہ کشمیر کے نئے ڈسکورس کے حوالے سے بیانیہ (Narration) کے ایک نئے سانچے میں ڈھل گیا اسے حقیقت پسندانہ سماجی و ثقافتی بیانیہ (Realistic Socia.cultural Narration) کہہ سکتے ہیں، ان میں فنی و جمالیاتی عناصر موجود ہیں جو افسانہ کو افسانہ بناتے ہیں البتہ انہیں اگر ''ٹریجڈی کی جمالیات'' کا نام دیا جائے تب بھی نور شاہ کی ایسی افسانویت پر حرف نہیں آئے گا۔ ''خواب بھی بکتے ہیں''، ''کرب ریزے''، ''سوداگر''، ''کوئی رونے والا نہیں''، ''دِل ویراں میں کیا غم'' وغیرہ افسانے اس کی مثالیں ہیں۔ چند اقتباسات دیکھئے:

''..........اس دوران یہ جنت دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ رُک رُک کر ایک نیا روپ اختیار کرگئی......جہنم کا روپ......آگ شعلے، قتل وغارت، آبروریزی، ناانصافی......اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ لگاتار بہت سے نوجوان لاپتہ ہوگئے۔ بسیار تلاش کے بعد ان کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ملی۔ پھر ایک ہنگامہ ہوا، لوگ متحرک ہوگئے اور حراستی ہلاکتوں کے خلاف سڑکوں پر آگئے۔ تلاش شروع ہوئی۔ کئی بے نام قبروں کی نشاندہی کی گئی اور کئی مسخ شدہ بے نام لاشیں ان قبروں سے برآمد کی گئیں......''

افسانہ ''خواب بھی بکتے ہیں''

''اور پھر ایک دن صبح سویرے لوگوں کو اخبار کے فرنٹ پیج پر ایک ساتھ دو تصویریں دیکھ کر کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ حیرانی شاید اس لئے نہیں کیوں کہ اب ایسی تصویریں روز ہی اخباروں کی زینت بنتی ہیں۔ کبھی ایک روپ میں، کبھی دوسرے روپ میں یہ دو تصویریں بھی کچھ ایسی ہی نوعیت کی تھیں۔ ایک طرف آمنہ کے بڑے بھائی کی خون سے لت پت لاش تھی اور دوسری طرف سرکار کا ایک اعلیٰ آفیسر آمنہ کے بھائی کو ہیلنگ ٹچ کے نام پر نوکری کا حکم نامہ دے رہا تھا لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہ کی گئی تھی کہ آمنہ کے بھائی کو کس جانب سے گولی لگی تھی۔ کیا وہ گولی وردی میں تھی یا وردی کے بغیر اور ملی ٹنسی سے اس کا کیا تعلق تھا، وہ تو صرف اپنے بہنوں کا بھائی تھا۔

پھر وہ ملی ٹنٹ کب اور کیسے بنا اور کیسے ملی ٹنسی کا شکار ہوا لیکن آمنہ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ صرف اپنی بہن کو روزگار دلانے کے لئے اُس کے بھائی نے ایک نیا روپ اپنا لیا تھا......"

افسانہ۔ "ہیلنگ ٹچ"

"مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے ہر کوئی رو رہا ہے، ہر کوئی چیخ رہا ہے لیکن آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر کوئی اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ان دیکھی آگ کی تپش میں جھلس رہا ہے......دن کی روشنی میں بھی مہیب سناٹوں کا احساس ہوتا ہے۔"

ایک بات بتادوں؟۔ہاں بتادیجئے۔

اب ہر چیز کے ساتھ آپ کو "تھا" "تھی" جوڑنا پڑے گا۔

کیا مطلب۔

جیسے۔یہاں امن "تھا" بھائی چارہ "تھا"۔ محبت اور چاہ "تھی" ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد "تھا"......سب کچھ نظر بد کا شکار ہو گیا۔" افسانہ۔ "کرب ریزے"

ہاں یہ بات تو صحیح ہے کہ لڑکی نے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا، یا یوں کہئے کہ خودکشی کر لی، مگر......مگر کیا ڈاکٹر خان؟"

یہ زخم اس بات کے گواہ ہیں کہ لڑکی نے بڑی جدوجہد کی ہے۔"

"اپنی زندگی بچانے کیلئے"

نہیں ڈاکٹر اسلم۔اپنی آبرو بچانے کے لئے......

" It is a case of gang Rape"

افسانہ۔ "کوئی رونے والا نہیں"

"آمنہ بی بی جو روز قبل اپنی بیٹی خالدہ کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے سرینگر سے بارہمولہ جا رہی تھی اور بس اسٹینڈ کے قریب ایک گرینیڈ پھٹنے کے دوران شدید زخمی ہوئی تھی۔کل رات زخموں کی تاب نہ لا کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ان کی دس سالہ بیٹی خالدہ

موقع پر ہی جاں بحق ہوگئی۔" افسانہ۔"آسمان پھول اور لہو"

"میں جب اپنے گھر کی کھڑکی سے اس کھلے کھلے وسیع قبرستان کی جانب دیکھتا ہوں تو مجھے ان کچی پکی قبروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جن پر لکھی ہوئی عبارتیں اب لفظ اور دائروں میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ یہ مٹتے ہوئے الفاظ جیسے کوئی کہانی دہرا رہے ہوں...... دور سے کچھ لوگ ہاتھوں میں مشعلیں لئے قبرستان کی جانب بڑھ رہے ہیں شاید ان لوگوں کی تلاش میں جو کل تک ان کے ساتھ تھے۔ ان کے اپنے تھے۔ ان کے وجود کا حصہ تھے لیکن آج قبروں میں لفظوں کی طرح سمٹ سمٹ کر دائرے بن گئے ہی۔" افسانہ۔"یہی سچ ہے"

دراصل کوئی بھی معتبر، مشاق اور جینوین فنکار اپنی تخلیقیت اور اپنی بصیرتوں کا اظہار خالصتاً اپنی منشا سے نہیں "وقت" کے دباو اور مطالبات کی بنا پر بھی کرتا ہے۔ رولاں بارتھ کا یہ قول (Writing writes not author) زبان کے مروجہ لسانی نظام اور اظہاری رویوں کے تناظر میں درست ہوسکتا ہے کہ لیکن ایلس مزوکو، جس طرح جنوبی اونٹاریو کے لوگوں کے دکھ درد، غربت وافلاس پر مبنی کہانیوں کے مجموعے (I meaning to tell have been something) پر ۲۰۱۳ء کا نوبل انعام دیا گیا اور اس کے جو اسباب بتائے گئے ہیں ان کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ Time writes not authors تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ نور شاہ نے ایک Rational افسانہ نگار کے طور پر وقت کے رواج، مزاج اور مطالبہ کے مطابق شعور وسرورِ بدن اور رومانیت پر مبنی افسانے ضرور لکھے، ایسے افسانوں میں حسن وعشق کی سحر کاری ہے۔ الفاظ وتراکیب، تشبیہات و استعارات کے انتخاب اور برتاؤ کا ماہرانہ سلیقہ ہے۔ موضوع، واقعہ اور کردار کے حوالے سے متنوع اور موزوں ترین فقرے تراشنے کی غیر معمولی خاصیت ہے۔ بیان میں منٹو کی جیسی وہ Irony ہے جس میں شگفتہ معنوی تہہ داری بھی ہے اور جارحانہ نشتر زنی بھی۔ نور شاہ کسی مخصوص سیاسی نظریہ، سماجی تصور کی حمایت یا مخالفت نہیں کرتے۔ ادب کے کسی گروہ سے بھی وابستہ نہیں۔ (اور غالباً اسی لئے ابھی تک انہیں کسی بڑے انعام سے نوازا نہیں گیا ہے) نور شاہ کے فنی و

جمالیاتی لسانی وفکری امتیازات اتنے روشن اور امکانات سے پر ہیں کہ معاصر اُردو افسانہ نگاروں میں غالباً چند ایک کو ہی نور شاہ کے مدِ مقابل رکھا جاسکتا ہے۔اور ایسا نہیں ہورہا ہے تو غالباً اس وجہ سے کہ نور شاہ نام نہاد ادبی مراکز سے دور کشمیر کے افسانہ نگار ہیں۔لیکن کشمیر کا افسانہ نگار ہونے کے حوالے سے بھی نور شاہ، اپنی کشمیر کی کہانیوں کے ذریعے ادب میں سچ اور صرف سچ کے ایماندارانہ بیان کا ایک نیا رجحان بھی پیدا کیا ہے اُسی طرح جس طرح مہاراشٹر میں دلت ادب کے معمار نامدیو ڈھسال نے مراٹھی ادیبوں میں بے خوف سچائیوں کے ادبی اظہار کا رجحان پیدا کیا ہے لیکن ایلس منرو، نامدیو ڈھسال یا پھر منٹو کی طرح نور شاہ کی کشمیر کی کہانیاں بھی دہشت، خوف یا منافرت کے جذبات متحرک نہیں کرتے بلکہ امن و آشتی محبت واخوت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام پر زور دیتے ہیں۔آج کے کشمیر کے حوالے سے گزشتہ صفحات پر درج نور شاہ کے افسانوں کے اقتباسات پر غور کیجئے۔یہ اقتباسات ایک افسانہ نگار کے قلم سے وجود میں آنے والے مرقعے ہی نہیں۔دل پُرخوں سے ٹپکے ہوئے ایسے قطرے ہیں کہ ہر قطرے میں آج کے کشمیر اور کشمیری قوم کے کرب واندوہ کا دجلہ دکھائی دیتا ہے۔آج کے تناظر میں یہی نور شاہ کے انفرادو امتیاز کا پورا سچ ہے۔



●...... پروفیسر مجید مضمر

نور شاہ......ایک دلچسپ شخصیت

شاعر یا ادیب کو اپنی تخلیق بڑی عزیز ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی یہ تمنا کسی تعجب کا باعث نہیں کہ ہر کوئی اس کے بلکہ اسی کے بارے میں لکھے۔ تعجب تو جب ہوتا جب وہ خود دوسروں کے خصوصاً اپنے معاصرین کے بارے میں لکھے اور اُن کی سراہنا بھی کرے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تخلیق کاروں کے تئیں ادبی مورّخین و ناقدین قارئین کا روّیہ اس قدر خاموشی کا ہو کہ یہ تخلیق کار کو خود ہی تنقید و تحقیق کا بھی بار اُٹھانے کی غیرت دلائے۔ کشمیر میں اُردو شعر و ادب کے ساتھ کچھ ایسی ہی واردات گزری ہے۔ اگر عبدالقادر سروری دکن سے یہاں آکر ''کشمیر میں اُردو'' تصنیف نہ کرتے تو یہاں کے نہ جانے کتنے شاعر اور ادیب قصر گمنامی میں پڑے ہوتے اور ان کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔ سروری مرحوم کی تصنیف کے تحقیقی استناد اور تنقیدی اعتبار سے متعلق بحث کی گنجائش ہو سکتی ہے اور ہے لیکن اسے اب تک کشمیر کے اُردو شاعروں اور ادیبوں کے پہلے اور آخری مبسوط تذکرے کی حیثیت حاصل ہے۔ سروری کا یہ مخلصانہ تحقیقی کام ہمارے لئے ترغیب و تشویش کا باعث بننا چاہیے تھا لیکن اس کے لئے ان ہی کے جیسے جذبے خلوص اور جنون کی حد تک لگن کی ضرورت تھی۔ آج کی تاریخ میں اگر یہ جذبہ اور لگن کسی کے پاس ہے تو وہ نور شاؔہ ہیں اور اس کا ثبوت ہے ان کی کتاب ''جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار''۔

نور شاؔہ ہماری ریاست کے نامور اور معتبر افسانہ نگار ہیں۔ صنفِ افسانہ کے ساتھ

پردیسی، در، ٹھاکر پونچھی اور پشکر ناتھ جیسے ادیبوں کی وابستگی کے باعث ریاست میں اُردو افسانے کی جو روایت پروان چڑھی، نور شاؔہ اس کے سب سے بڑے امین ہیں، کم از کم اس معنی میں کہ انہوں نے افسانے کے ساتھ اپنی وفاداری کو بشرط استواری نبھایا۔ افسانے کے میدان میں وہ شاہدہ شرین کے فرضی نام سے اترے تھے اور ہمارے طالب علمی کے زمانے میں اس واقعے کے تعلق سے کئی رنگین قصے مشہور تھے لیکن نور شاؔہ کے کام کو ہم ان کے اصلی نام سے ہی جانتے اور مانتے ہیں۔ رومان سے حقیقت تک کے سفر میں نور شاؔہ کا تخلیقی برتاؤ ریاست میں اُردو افسانے کو ہیئتی اور موضوعاتی سطح پر کئی نوع کے تجربات سے آشنا کرتا رہا اور اُردو افسانے کے مجموعی/ عالمی سرمائے میں یہاں کے خارجی اور داخلی منظر کے حوالے سے اسے ایک انفراد عطا کرتا رہا۔ بے گھاٹ کی ناؤ سے لے کر آسمان پھول اور لہو تک ان کے چھ افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ بند کمرے کی کھڑکی کے نام سے ادبی ڈائری اور کہاں گئے وہ لوگ کے ناموں سے خاکوں کے مجموعے کے علاوہ ان کے چار ناول بھی منظر عام پر آچکے ہیں اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ ان کا تخلیقی سفر پہلے کی طرح جاری ہے۔ ریاست میں اُردو زبان کو اپنا آئینی اور جائز حق دلانے کے سلسلے میں جو کوششیں پچھلے چند برسوں سے جاری ہیں نور شاؔہ ان میں پیش پیش ہیں۔ سرکاری وعدوں کے باوجود جب اُردو کے لئے الگ سے اکادمی کے قیام کی صورت نہ نکلی تو نور شاؔہ نے چند ادیبوں اور ادب دوستوں کو ساتھ لے کر خود ہی غیر سرکاری سطح پر اُردو اکیڈیمی کا قیام عمل میں لایا جو ریاست میں اُردو زبان کے حق میں ایک نئی تحریک کا حکم رکھتی ہے۔

ادھر ایک عرصہ سے ایک مقامی اُردو اخبار میں ''جموں و کشمیر کے اُردو افسانہ نگار'' عنوان کے تحت نور شاؔہ کا مستقل کالم شائع ہوتا رہا جسے وہ کتابی صورت میں منظر عام پر لا رہے ہیں۔ اس میں ریاست کے اُردو افسانہ نگاروں کا مختصر مگر جامع تعارف بھی ہے اور ان کے فن پر تبصرہ بھی۔ اس کا سبب غالباً وہی غیرت ہے جو ادبی مورّخین اور ناقدین کی خاموشی کے نتیجے میں تخلیق کار کو خود ہی مورّخ اور ناقد بننے پر مجبور کرتی ہے اور جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا جا چکا

ہے۔ ریاست کی اُردو شاعری سے متعلق چند اچھی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں لیکن اُردو افسانے کے سفر یا افسانہ نگار کے تعلق سے اب تک کوئی کام ایسا نہیں ہوا ہے جو ریاست کے اُردو افسانے کی تاریخ یا تذکرے کا حکم رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے نور شاہ کی یہ کتاب ایک قابل قدر کوشش ہے۔ اس کی ایک دستاویزی اہمیت بھی ہے کہ یہ شروع سے اب تک کے افسانہ نگاروں کی تصویروں کی ایک نمائش ہے۔ ہر تصویر منفرد ہے...... اپنے الگ رنگ اور اپنے جدا پس منظر کے ساتھ۔ تصویروں کا یہ البم ریاست کے اُردو افسانے کے پیچ وخم کو بھی ظاہر کرتا ہے اور افسانہ نگاروں کے احوال وکوائف سے بھی واقف کراتا ہے۔ میرے خیال میں کل کے ادبی مورّخ کے لئے یہ دستاویز ایک اہم سرچشمہ ثابت ہوگی۔

..........●●● ....

●...... ٹھاکر پونچھی

شاہدہ شیرین بنامِ نور شاہ

نور شاہ (شاہدہ شیرین) ایک پھول کی مانند افسانہ نگاری کے گلشن میں کھِلا اور کھلتے ہی اپنے تعطر اور لطافت سے دوسروں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ ایک میں دو وجود، دو روحیں، جو گلاب کے پھول میں سمٹ کر اُردو ادب میں نمایاں ہوئیں۔ شاہدہ شیریں نور شاہ کا قلمی نام ہے۔ اس نام کو اپنانے میں کون سی مصلحت ہے۔ یہ تو نور ہی بہتر جانتا ہوگا کہ اُسی کے نورانی تخیل کا پرتو ہے۔ ہوسکتا ہے نسوانی خدوخال اور چال ڈھال کا عکس جمیل آئینے میں دیکھا ہو اور اُس میں اپنے خیالوں کی محبوبہ کا سیمیں جسم منعکس پایا ہو۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن نام کی مناسبت برحق ہے کہ ظاہر و باطن کی نفسیاتی باریکیوں کی حامل ہے۔ قریبی احباب کا کہنا ہے کہ اِس اپنائیت کا ایک گہرے المیہ سے تعلق ہے اور شاہدہ شیرین نام سے نور کے ماضی کی چند تلخ چند شیریں یادیں وابستہ ہیں جن کی بدولت اندھیری کھوکھلی فضاؤں میں ایک متحیر سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ خلاؤں میں جھانکنے والی ایک ایسی نگاہ تجسس جو ماضی کے کھنڈروں میں ہر وقت ہر گھڑی کسی گم شدہ لمحے کی تلاش میں منہمک رہتی ہے۔

گُل پوش سرسبز و شاداب وادی نے اب تک اُردو ادب کی پُرخار راہ میں ہمیں رنگا رنگ پھولوں سے نوازا ہے اور اُن پھولوں میں نور شاہ کی صورت میں ایک اور حسین نکہت ریز گل کا اضافہ ہوا ہے۔ نور زعفراں زار وادی کی ایک دلنشین کُنج میں سرینگر کے متوسط طبقے میں پیدا ہوا۔ وہیں پرورش و پرداخت ہوئی۔ احساسات میں جو زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ اندازِ بیان میں جو شگفتگی رچاؤ اور موسیقی ہے۔ وہ کچھ تو حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت وجلال کی دین

ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہینِ مِنّت۔ ایسے ماحول میں جہاں بہت کچھ پایا۔ وہاں بہت کچھ کھویا بھی۔ پانے کا تعلق شعور سے تھا۔ کھونے کا تعلق دل سے۔ وقت کے ساتھ ماحول کی چھاپ گہری ہوتی گئی، تو دل کا زخم ناسور بنتا گیا، حتیٰ کہ نور شاہ سے شاہدہ شیریں ہو گیا۔ جب کوئی جذباتی اور رقیق القلب اپنی ذات اپنا غم اپنا احساس شعوری اور غیر شعوری طور پر عمر کے مخصوص ایام میں، اپنی دیکھی یا ان دیکھی محبوبہ کے وجود میں مدغم کر دیتا ہے اور یوں اپنی جستجو کی تکمیل کر لیتا ہے، تو وہ میرا جی بن جاتا ہے۔ شاہدہ شیرین بن جاتا ہے اور مجروح تمناؤں کی ساری تلخیاں اور محرومیاں اپنے دہکتے ہوئے سینے میں چھپا کر بچی کھچی خوشیاں غیروں میں لُٹا کر ایک اجنبی سی مسرت ایک انوکھی سی تسکین حاصل کرتا ہے۔

نور شاہ سے میرا تعارف ایک خط سے ہوا۔ جو میرے ایک افسانے سے متعلق تھا۔ کہیں توارد تھا یا موضوع مِلتا جُلتا تھا۔ خط کی تحریر میں تناؤ اور تیکھا پن تھا۔ تنقید اور توصیف کے ملے جلے جملے لئے خطوط تو اپنے محبوب مداحوں سے ملتے ہی رہتے ہیں۔ ہر خط کا جواب دینا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میرے لئے یہ رشتہ مقدّس اور اہم ہے۔ طرزِ تخاطب مختلف سہی لیکن ایسے خطوط کا جذبہ ایک ہوتا ہے۔ کوئی بھائی بن کر لکھتا ہے۔ تو کوئی بہن یا محبوبہ کا روپ دھارن کر کے۔ اندازِ تحریر اور طرزِ تخاطب کی نوک پلک سامنے رکھ کر حسب ضرورت مختصر یا مفصل جواب دیتا ہوں۔ چوں کہ اپنے کشمیر سے اپنی نوعیت کا پہلا خط تھا۔ جس میں مہربان محبت کا اظہار تھا اور اخلاقی جرأت کا ثبوت مانگا گیا تھا اور وہ بھی زوردار الفاظ میں۔ لہٰذا اخلاقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے تحریر کیا...... آپ کے مطالعہ اور مشاہدہ کی قدر کرتا ہوں۔ ایک بات یاد رکھیئے کہ شعر یا افسانے میں مفہوم یا پلاٹ کا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کا مطلب خدارا یہ کبھی نہ لیجئے کہ شاعر یا افسانہ نگار نے چوری کی ہے کیونکہ چھوٹے بڑے مستند فنکار کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ قارئین کا حلقہ وسیع ہے اور پختہ شعور اور بالغ نظر بھی..........''

میرے جواب نے سلسلۂ خط و کتابت کی بنیاد ڈالی اور کشمیر کے ناطے خط و کتابت

جاری رہی ۔نور نے میرے افسانوں اور ناولوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ مجھ سے بے حد متاثر دکھائی دیتا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین چار خطوط پڑھنے کے بعد ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ جہاں تحریر میں ستھرا پن ہے۔ نِکھری سنوری ہوئی زبان ہے۔ ایک رچا ہوا انداز بیان ہے وہاں جواں فکری بھی ہے اور دور نظری بھی اور مشاہدہ زندگی و مطالعہ نفس گہرا ہے۔ نوعمر ہوتے ہوئے بھی نوعمر زندگی کے سنگین حادثات سے انتہائی پختہ ہو چکی ہے۔ خطوط کی تحریر میں جو چھبن تھی۔ تڑپ اور کُرید تھی۔ اُس میں ایک کہانی کار کی تشکیل پنہاں تھی جو کسی وقت بھی عالم وجود میں آسکتا تھا۔ عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی جسے کسی ایسے راہنما کی تلاش تھی، جو مناسب وقت پر اُس ڈگر پر چھوڑ دے ۔ جہاں سے اپنے سہارے قدم بہ قدم چلتے بڑھتے اپنی اُس منزل کو پالے ۔ جو مضطرب خیالوں میں ابھی سے منہمک رہی تھی۔ راہنما ملا یا نہیں لیکن حالات ہموار اور سازگار ملے اور آج ذراسا کہانی کار لگن و محنت اور جہد پیہم و عزمِ مستحکم کے سہارے بے گھاٹ کی ناؤ لئے اپنی منزل کی دہلیز پر کھڑا نازاں و شاداں نگاہوں سے اُن پُر خار پیچیدہ راہوں کو پہچان رہا ہے جنھوں نے اپنے کانٹوں سے اُس کے پاؤں چھلنی کیئے۔ لیکن قدموں کو بلندیوں اور وسعتوں کی سمت بڑھنے کا راستہ اور حوصلہ بخشا۔ شاہدہ شیریں ہو یا نور شاہ یا کوئی اور آخر نام میں کیا رکھا ہے، موجودہ افراتفری اور بے راہ روی کے دور میں غیر معمولی ذہانت اور شعوری پختگی کے بل بوتے پر ہی اپنا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔ نور شاہ نے ایک قلیل عرصہ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے زور پر اپنے آپ کو منوایا اور آج نئے اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں اپنے مخصوص رنگ میں رنگے ہوئے ایک نمایاں مقام پر پہنچ چکا ہے اور اُس کا شمار نوجوان فنکاروں میں ہونے لگا ہے جن کے قلم میں جان اور شعور میں افسانہ نگاری کا صحت مند رجحان موجود ہے۔ جو نئے لکھنے والوں میں آتے ہیں لیکن جن کی فنی پختگی اُن کے نئے پن کو مشکوک بناتی ہے۔

بے گھاٹ کی ناؤ کے افسانوں کی تخلیق و ترتیب کی تہہ میں ایک کہانی ہے۔ نگاہ تجسس کی کہانی ۔جس کا محور آج کا انسان ہے۔ انسانی زندگی کے سوز و ساز کا زیر و بم ہے۔ مجبوریاں اور

ناکامیوں کی خلش ہے اور رستے ہوئے ناسوروں کا ذکر بھی کہ اِسی محور کے گرد آج کی دُنیا آج کا ماحول اور آج کا سماج گھوم رہا ہے، چھوٹے بڑے غریب امیر کی تفریق پیدا کر رہا ہے اپنی بقا کے لئے زندگی انسانوں کو پیش رہا ہے۔ اِن افسانوں میں نور نے سماج کے غیر انسانی توازن پر آنسو بہائے ہیں، جس میں غریب و نادار کا کوئی وزن نہیں، کوئی قیمت نہیں۔ اُس نے شعوری طور پر انسانی ادب کو اپنایا ہے جس میں اُس کے آنسوؤں کی مسکراہٹ اور خون کی سُرخی شامل ہے۔ اُن کے افسانوں کا غم واندوہ حقیقت سے اتنا قریب ہے کہ مصنف کے تجربات ہمیں اپنے تجربات معلوم ہوتے ہیں۔ نورؔ نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور فنکارانہ انداز سے اُس کی عکاسی کی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے اِردگرد کے حالات کا خوردبین نگاہوں سے مطالعہ کر کے لکھا ہے اور انسانی دل کی تمام کیفیات کو اپنی کہانیوں میں سمویا ہے۔ اِسی لئے یہ کہانیاں جہاں انسانی زندگی کے نشیب وفراز کا آئینہ ہیں وہاں اِن میں زندگی کی ہولناکیوں اور مسرت آفرینیوں کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

نور کے افسانوں میں شعور وفکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ زبان اور اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے کہ دھیمے سُریلے سروں میں اپنی بات کہنے کا قائل ہے۔ تحریر میں جہاں شگفتگی اور بے تکلفی ہے، وہاں غضب کی روانی اور بے ساختگی بھی ہے۔ پہاڑی ندی جیسا تسلسل اور رچاؤ ہے چنچلتا اور گہرائی ہے۔ نور کے یہ افسانے شدید احساس کے مرہونِ منت ہیں۔ ایک معمولی سا واقعہ بھی اُس کے ایک خوبصورت افسانے کی اساس بن جاتا ہے اور انسان کے کردار حقیقی زندگی کے کردار معلوم ہوتے ہیں۔

نور انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں میں رومان کے پھول بھی ملیں گے اور مقصدیت کے کانٹے بھی کہ زندگی میں سوز وساز قدم بقدم اور دوش بدوش ہیں کہیں کہیں سماجی بے اعتدالی اور بے راہ روی پر دردمندی کے ساتھ طنز بھی کیا ہے۔ اُس کی نگاہیں ماحول کی پُرفریب سطح کو چیر کر تہہ میں حقیقت کو ڈھونڈتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ مطلوبہ تاثر اُبھارتی ہیں۔

''بے گھاٹ کی ناؤ'' کے افسانوں پر علاحدہ علاحدہ اظہار خیال مقصود نہیں۔ کیونکہ تمام افسانے ایک ہی معطر پھول کی مختلف بکھری ہوئی پتیاں ہیں جن کا حقیقی رنگ اور تعطر مجموعی تاثر میں پنہاں ہیں۔ اُسی انداز سے اُنہیں سمیٹ کر نگاہوں کے سامنے اُجاگر کرنا ہے۔ کیونکہ مختلف کردار مشترکہ حرکت سے ایک ماحول کو جنم دیتے ہیں اور اُس رنگارنگ ماحول میں ہی انسانی سماج کی روپ ریکھا دیکھی جاسکتی ہے۔ بے گھاٹ کی ناؤ، کا مجموعی تاثر ہی ہمیں ان افسانوں کی دھڑکنوں کے قریب لے جاسکتا ہے۔

چند نئے پرانے افسانہ نگاروں نے نئے کشمیر کی جو روپ ریکھا اپنی تخلیقات میں اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ اُس میں جاگیردارانہ ماضی کی برچھائیاں تو ہوسکتی ہیں لیکن وہ آج کے نئے ماحول نئے عوامی دور کی صحیح تصویر نہیں۔ خوش آئند مستقبل کی جھلک نہیں۔ میری خواہش ہے کہ نور اپنی جنت کی مقدس اور پُر خلوص کہانیاں اپنے انداز میں لکھے اور اپنی زعفرانی دھرتی کی حقیقت افروز نقوش پیش کرے جو نہایت ہی پاکیزہ حسین اور صحت مند ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ نور شاہ اپنی دھرتی کے تابندہ ذروں کو نا اُمید نہیں کرے گا اور اردو ادب میں اُس کی آمد نئے ادیبوں کے لئے راہ ہموار کرے گی۔ حوصلہ افزا پیغام لائے گی'' بے گھاٹ کی ناؤ'' نور کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے اور ہر لحاظ سے کامیاب اور مکمل ہے۔ اگر اُس نے اپنی دھرتی کا دامن نہ چھوڑا اور اپنی کہانیوں کا خمیر اپنی مٹی سے ہی اُٹھاتا رہا تو ایک دن اُس کا شمار اُن سرکردہ افسانہ نگاروں میں ہوگا جو حقیقی معنوں میں کشمیر کے نمائندہ اور منفرد ادیب کہلانے کے مستحق ہیں۔ اپنے موہن یاور، حامدی کاشمیری، وید راہی اور پشکر ناتھ جیسے جموں وکشمیر کے اُردو افسانہ نگاروں کی صف میں نور شاہ کی شمولیت قابلِ فخر اور باعث ستائش ہے۔ افسانہ نگاروں کی صف میں اُس کا خیر مقدم ہونا چاہیئے۔



●...... ڈاکٹر شمع افروز زیدی

نور شاہ ۔۔۔ ایک عہد ساز شخصیت

نور شاہ سرینگر میں پیدا ہوئے ۔ کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں کھیل کود کر جوانی کی منزلیں طے کرنے سے قبل کہانیاں بننے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے اس شوق نے جنون کی کیفیت اختیار کرلی۔عمر بڑھنے کے ساتھ مزاج میں پختگی آتی گئی، ساتھ ہی فن میں بھی نکھار آتا رہا اور جب نور شاہ کو یقین ہو گیا کہ وہ کہانی کہنے کے فن سے کسی حد تک واقف ہو چکے ہیں تو پہلی کہانی ''گلاب کا پھول'' ماہنامہ بیسویں صدی میں اشاعت کے لیے بھجوادی۔ حسنِ اتفاق کہ کہانی شائع بھی ہوگئی، بس پھر کیا تھا ان کے شوق کو مزید جلا ملی اور یوں وہ کہانیاں لکھنے لگے۔ پھر ان کا قلم ایسا رواں ہوا کہ آج تک نئے نئے فن پارے تخلیق کر رہا ہے۔

ماہنامہ بیسویں صدی ایسا رسالہ ہے جسے ہر عمر کے لوگ پڑھتے رہے ہیں۔اب یہ تیسری نسل کے ذہنوں کی آبیاری کر رہا ہے۔ میرے بچپن میں بھی تو یہ رسالہ ہمارے گھر میں آتا تھا اماں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتی تھیں۔جب میں آٹھویں کلاس میں تھی نور شاہ کی کہانی پڑھی (نام ذہن میں نہیں) اور پھر یوں ہوا جب جب ان کی کہانیاں پڑھتی تصور کی آنکھ سے انہیں دیکھتی، خود ان کی کہانیوں میں انہیں تلاش کرتی ۔ یہ تلاش اس دن ختم ہوئی جب پہلی بار ۱۹۸۱ء میں دفتر بیسویں صدی دریا گنج میں وہ نیّر صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ سادگی ومتانت کا مجسمہ، بات کرنے کا دھیما دھیما انداز محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی فنکار ہے

جس کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر میں نے شعور کی منزلیں طے کی ہیں۔ مزاج میں بے حد انکساری رچی ہوئی تھی۔ دورانِ گفتگو انہوں نے بتایا ''ماہنامہ بیسویں صدی میں تخلیق کا شائع ہو جانا کسی بھی فنکار کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھا گویا اس میں شائع ہونے کے بعد مستند ہونے کی مہر لگ جاتی تھی۔

نور شاہ ایسے ادیب ہیں جن کا تخلیقی سفر ۶۰ دہائیوں پر محیط ہے۔ تا حال ان کا یہ سفر اسی انداز میں رواں دواں ہے۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ ایک خاص مدت کے بعد فنکار خود کو دہرانے لگتا ہے لیکن نور شاہ کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ ان کی تحریروں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ تخلیقی سوتے اسی طرح سرسبز و شاداب ہیں۔

نور شاہ کا ذہن بے حد زرخیز اور خلاق ہے۔ پیدائشی کشمیری ہونے کے سبب وہ کشمیر کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ وہاں کے ہر گوشے پر ان کی نگاہ ٹھہرتی ہیں۔ انہوں نے کشمیر کے ہر موسم کو دیکھا اور لطف اٹھایا ہے وہاں کی صحت بخش ہواؤں اور چشموں کے ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں سے اپنی روح کو سیراب کیا ہے۔ اس لیے اس کا قلم وہاں کی خوبصورتی اور حسن کو نہایت روانی سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ دراصل ''حسن'' ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس سے کوئی بھی انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور نور شاہ کے یہاں اس کا اظہار بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حسن ان کے فن، ان کی زندگی اور ان کے ماحول کا حوالہ بن کرشمہ پاروں کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ نور شاہ کی کہانیوں میں ان کی محبوبہ اس لیے اہم نہیں کہ وہ حسن پرستی کی تسکین کرتی ہے یا اس کی دلنواز ادائیں من کو موہ لیتی ہیں بلکہ اس کا وجود حسن کی تخلیق کا باعث بنتا ہے اور پھر وہی حسن ان کے افسانوں میں جا بجا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حسن پسندی میں نور شاہ کی گہری نگاہ ''بے معنی سفر'' میں ملاحظہ کیجیے:

> ''مستی میں ڈوبی دو بڑی بڑی آنکھیں کتابی چہرہ اور اس چہرے پر سرخ و سفید رنگ، نمکین چائے کے رنگ کی شلوار اور اُسی رنگ کی چست قمیض، جسم کا ایک ایک انگ، ایک ایک قوس عیاں ہے''۔

مجھے برسوں قبل ان کے تحریر کردہ بعض افسانے یاد آرہے ہیں جو کہانی پن کے ساتھ ہی شاعرانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں کشمیر کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں، پُرشور دریاؤں کی گونج، سبک روندیوں کے نغمے، چناروں کے دہکتے پھول، مرغزاروں، وادیوں، چشموں، شالیمار اور نشاط باغ کے دلکش مناظر اتنی خوبصورتی سے سموئے ہوئے ہیں جنہیں صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ڈل جھیل، کنول، زعفران کے پھول، انار کی کلیاں، بادام کے شگوفے، شفتالو، چشمے کا ٹھنڈا پانی، پری محل، گل مرگ، سونا مرگ، ٹنگ مرگ، پہلگام وغیرہ ایسی علامتیں بن کر ابھری ہیں جو ان کی تحریروں کا اہم عنصر بن گئی ہیں۔ کشمیر کی خوبصورتی، وہاں کے دلنواز مناظر، حسین وادیاں، ہرے بھرے مرغزار، روح پرور فضائیں، آبشار، سڑکیں، دریا، آسمان، درخت، جنگل، پہاڑ، جھرنے غرض وہاں کے گوشے گوشے کا حسن کشید کر کے نور شاہ نے اس خوبی سے کہانیوں کے قالب میں ڈھالا ہے کہ قاری ذہنی طور پر کشمیر کی وادیوں کی سیر کرنے لگتا ہے اور وہاں کے حسن اور روح پرور مناظر کو اپنی مشامِ جاں میں سمونے کے لیے بے چین ہو اٹھتا ہے۔ پر تولنے لگتا ہے وہاں کے حسین نظاروں کی دید کے لیے۔ ان کے افسانے ''اندھیرے اُجالے'' میں کشمیر جنت نظیر کی تصویر کی تصور ملاحظہ کیجیے:

''کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف ہے۔ ہری بھری شاداب وادی اور سندر دھرتی، بھانت بھانت کے لوگوں کا گھر، پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جن پر بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے، سبز ہے، یہاں پھولوں سے جڑی ہوئی مرگیں ہیں، رنگ برنگے پھولوں سے سجے سجائے تختے ہیں۔ یہ گلمرگ، سونا مرگ، پہلگام، یہ شالیمار ہے، یہ نشاط ہے، نور جہاں کے خوابوں کا باغ، جہانگیر کی جوانی کی یادگار، یہ ڈل جھیل ہے اور اس پر چلتی پھرتی ننھی ننھی کشتیاں اور دلہن کی طرح سجے سنورے ہاؤس بوٹ، یہ لدرنالہ ہے، یہ کل کل کرتی ندیاں اور ان کے کنارے بید کے پیڑوں کی قطاریں، چنار کے پتوں کا لال رنگ کھیتوں میں پکے ہوئے اناج کی

سرخ بالیاں....''

ایسا ہی ایک منظر افسانہ ''بے جڑ پودے'' میں محسوس کیجئے:

''سامنے کی کھڑکی کھول دو تو جھیل کے پانیوں سے ہنستے کھیلتے کنول کے پھول نظروں کے سامنے بکھر جاتے ہیں۔ ہاؤس بوٹوں کی لمبی قطاریں گھوم پھر جاتی ہیں۔ ڈوبتے اُگتے سورج کا منظر نگاہوں میں اُتھل پتھل مچا دیتا ہے۔ خاموش راتوں کی چاندنی میں پری محل کے کھنڈرات سے ان دیکھی پریوں کے گیت سنائی دیتے ہیں''۔

دراصل زندگی کی بساط پر نور شاہ کا رویہ اور ان کا احساس روشن ہے اس لیے یہ کہانی اتنے خوبصورت انداز میں پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے ''اندھیرے اجالے'' ایسے بے لوث جذبوں کی کہانی ہے جسے نور شاہ ہی قلم بند کر سکتے تھے۔ اس کہانی میں فنکار نے انتہائی مہارت کے ساتھ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ایکتا کی بہترین مثال پیش کی ہے۔

اس کہانی میں نصیب کور پنجاب کے گاؤں کی الھڑ اور سادہ لوح عورت ہے۔ جب وہ امجد کے بابا کو اپنا خون دیتی ہے تو اس کا بلڈ گروپ امجد کے بابا کے گروپ سے میچ کر جاتا ہے۔ امجد کے بابا کو خون دینے کے پس پشت ان کی زندگی بچانے کے لیے اس کے ذہن و دل میں انسانیت کا جذبہ ہی تو کارفرما ہے، پھر وہ امجد کو راکھی باندھ کر اپنا بھائی بھی بنا لیتی ہے۔ یہ کہانی ایسے معصوم جذبوں کی کہانی بن گئی ہے کہ اس کی اہمیت اور افادیت ہر عہد میں برقرار رہے گی۔

نور شاہ کی کہانیوں کی ایک اور خوبی بہت اہم ہے وہ ابتدائی جملوں سے ہی قاری کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے ہیں۔ ذرا ''صلیب'' کہانی کی ابتدائی ملاحظہ کیجئے:

''میں تنہا ہوں۔ میرے آنگن میں چنار کا درخت سپید سی برف میں دبا ہوا بے حد اُداس کھڑا ہے۔ آکاش کی جانب اپنی ننگی بانہیں پھیلائے دیکھ رہا ہے۔ ہر شاخ ایک صلیب ہے اور ہر صلیب پر نڈھال عیسیٰ کو خدا کی تلاش ہے! میں کس کا بیٹا ہوں؟''

نور شاہ لفظوں، رنگوں، موسیقی کی دلکش تان، بانسری کی مدھر لے، وائلن کی دھن اور

جسم کے آہنگ کے ذریعے انتہائی لطیف انداز میں اپنے احساسات کو واضح کرتے ہیں لیکن خوبصورتی اور حسن کے ساتھ ہی وہ زندگی کی سنگلاخیت کا ذکر بھی اسی شدومد سے کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ موجودہ کشمیر پہلے جیسا جنت بے نظیر رہا بھی تو نہیں۔ اب وہاں نہ بانسری کی مدھر لے ہے، نہ دلوں کو موہ لینی والی وائلن کی سُریلی تان گونجتی ہے، نہ ہی دلنواز مناظر دل کو کھینچتے ہیں، نہ وہاں کے حسین موسم کہانی کہتے محسوس ہوتے ہیں، نہ ڈل جھیل کے ٹھنڈے پانی کی سرد لہر جسم میں سرایت کرتی ہے، نہ چنار کے درختوں کی چھاؤں پُرسکون لگتی ہے پھر بھی یادِ رفتگاں کے طور پر نور شاہ اپنے ماضی کے کشمیر کو تلاشتے ہوئے ضرور محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے ماحول میں کہانی کار لکھے تو کیا لکھے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جو روح کی بالیدگی کا سامان مہیا کر سکے۔ فنکار صرف یہ ہی سوچتا رہتا ہے کہ حسن و محبت اور امن کا وہ دیوتا کہاں کھو گیا ہے۔ حسین مرغزاروں اور حسن کی یہ بستی کس طرح اور کیونکر اجڑ گئی ہے۔ اس کیفیت کو ''کوئی رونے والا نہیں'' کہانی میں محسوس کیجئے:

> ''یہ اب سے سات سال پہلے کی بات ہے اور ان سات سالوں میں یہ دھرتی اور بھی اجڑ کر رہ گئی، باغبانوں نے اپنے ہی مرغزاروں کو جلا دیا، سائبان بن کر اپنے ہی گھروں کو مسمار کر دیا، وہ ساری رونق جو ہماری زندگی کے رنگوں سے بندھی ہوئی تھی جانے کہاں کھو گئی، ہماری کھل کھلاتی بستیاں اور لہلہاتی کھیتیاں کس نے چھین لیں، کیوں اور کیسے صحرا کا روپ اپنا چکی ہے ہماری یہ شاداب زمین..... اور تو اور ڈاکٹر خان خود کسی نامعلوم بندوق بردار کی گولی کا نشانہ بنتے بنتے ابدی نیند سو گئے..... کیا قصور تھا ان کا..... اور ایک رات احمد فواد جرنلسٹ کے آفس میں آگ نمودار ہوئی اور آناً فاناً اس کی زندگی کا سارا اثاثہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا..... اس کی تحریریں تو سچائی کی ترجمانی کرتی تھیں!!''

''رات کا سورج''، ''میری کہانی کا سچ'' اور ''عکس'' بظاہر ان کی سیدھی سادھی کہانیاں ہیں لیکن ان کہانیوں کے ذریعہ انہوں نے عورت کی نفسیات کو بڑی مہارت سے اُجاگر کیا ہے۔

''اشرف المخلوقات''، ''ایک لمحے کی جنت'' اور ''انجانے اتہاس کی کڑیاں'' کہانیوں کے ذریعہ نور شاہ نے موجودہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی ہم جنسی کی جانب بڑے دانشورانہ اور مفکرانہ انداز میں ہماری توجہ مبذول کرائی ہے، ساتھ ہی بھرپور انداز میں طنز بھی کیا ہے۔ ''زمین کھولے گی زبان اپنی''، خواب بھی بکتے ہیں''، ٹوٹتے لمحوں کا بیان''، ''لکیریں''، ''وہ جو ایک شخص تھا''، ''مہیلنگ ٹچ'' اور ''آسمان لہو اور پھول'' زندگی کی حقیقتوں سے پُر موجودہ کشمیر کی عکاسی ایسی کہانیاں ہیں جس میں کشمیر کی وادیاں اور چشمے خون کے آنسوں بہاتے محسوس ہوتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ''مہیلنگ ٹچ''، میں کشمیر کی ایک ہلکی سی تصویر:

> ''رات اندھیری ہے نہ چاند کی نرم وسبک روشنی ہے اور نہ ہی ستاروں کی چمک و دمک، ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک سیاہ بادلوں کا دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ خلقت سے بھری یہ بستی خالی خالی سی نظر آتی ہے۔ اور میں اپنے بند کمرے سے بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ اس مختصر سی داستان کا اختتام کب، کہاں اور کیسے ہوگا۔ دور بہت دور گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ شاید کراس فائرنگ ہو رہی ہے ان آوازوں سے ان سناٹوں میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے اب تو یہ سناٹے نہ صرف میری بلکہ ہم سب کی زندگیوں کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ لوگ مرتے ہیں اس جانب بھی اور اس جانب بھی....''

اس پیراگراف میں اتھاہ دُکھ کے ساتھ خون کے آنسوؤں کی آمیزش بھی ہے اور بے آواز رونے کا درد بھی، جسے محسوس کر کے دل تڑپ اٹھتا ہے یہاں تک کہ اشک رواں ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے اس میں کشمیر کی ایسی حقیقی تصویر کشی کی ہے جس کے سبب اندر بہت اندر تک دل زخمی ہو کر پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔

پھر بھی ایسے ماحول میں کچھ بھولی بسری یادیں اثاثے کے بطور فنکار نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ وہ جینے کا ماحول مہیا کرتے رہتے ہیں اور حسن کے گیت گانے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں کہ زندگی اسی کا نام ہے۔

'ایک خواب بے خواب سا'' ان کا ایسا افسانہ ہے جس میں دو کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، بظاہر دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں لیکن تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی گہرا ربط ہے۔ اگر چہ کہانی ایک ہے لیکن دو طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ایک طبقے میں پیار محض دل بہلاوے کی چیز ہے تو دوسرے طبقے میں پیار کے نام پر جان قربان کر دی جاتی ہے۔

''پرندے، میں نور شاہ فن کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔خوبصورت ڈائیلاگ، دلکش منظر کشی، ماحول کی پُر اسراریت، خیال آفرینی اور جذبات کی فراوانی نے اس کہانی کو بے حد خوبصورت اور بامعنی بنا دیا ہے لگتا ہے فنکار نے اس کہانی کو بننے میں اپنی خصوصی صلاحتیں صرف کر دی ہیں۔اس میں کردار بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں اسے کردار کی کہانی کہا جاسکتا ہے جو اپنے اندر بے پناہ حسن سمیٹے ہوئے ہے۔

''بے جڑ پودے'' دو محبت بھرے دلوں کی ایسی کہانی ہے جو محبت کی پہلی ہی سیڑھی سے پھسل کر گر پڑتے ہیں، حالات کا جبر انہیں لاچار و بے بس کر دیتا ہے اور وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنی جان کو روگ لگا لیتے ہیں۔

نور شاہ نے عورت کی عظمت، ذہانت، ارادے کی پختگی اور اس کی مظلومیت کو ہی اپنی کہانیوں کا محور نہیں بنایا ہے یا پھر انہوں نے عورت کو صرف وفا کی دیوی کے روپ میں ہی نہیں پیش کیا ہے بلکہ ان کے خیال میں بے وفا اگر مرد ہو سکتا ہے تو عورت بھی ہو سکتی ہے۔''خوشبو کا سفر''،''آخری دن کی تلاش'' اور''دوسرے شوہر کی خواب گاہ'' میں انہوں نے ایسی ہی بے وفا عورت کی تصویر پیش کی ہے۔

''گھر بے گھر'' اور''رشتوں کی دہلیز پر'' جیسی ان کی کئی ایسی کہانیاں ہیں جو پاکیزہ جذبوں کی کہانیوں کے زمرے میں شمار کی جاسکتی ہیں۔

نور شاہ کی کہانیوں کو جستہ جستہ پڑھیئے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ورائٹی اور تنوع ہے۔وہ اپنی کہانیوں میں زندگی کے تلخ حقائق،نفسیاتی کشمکش، حالات اور ماحول کا المیہ اس

خوبی سے سموتے ہیں کہ قاری کے ذہن و دل پر کاری ضرب لگتی ہے لیکن اس کاری ضرب کو سنبھالنے کے ہنر سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے قاری کو لطیف رومانی ماحول بھی فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حسن کا ذکر اس دلکش پیرائے میں کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن سے دکھوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور یہی خوبی انہیں امتیاز بخشتی ہے۔

''کہاں گئے یہ لوگ'' میں ۶۵ مختلف النوع شخصیات کے مختصر خاکے شامل ہیں۔ نور شاہ کی پہلی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے صاحب خاکہ کے بارے میں بہت جامع، سہل اور سرسری انداز میں زندگی کے رنگوں کو اجاگر کر کے بالکل اپنے انداز میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان خاکوں کی دوسری اضافی خوبی یہ ہے کہ قاری انہیں پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ روانی، شگفتگی اور اختصار کے سبب پڑھتا چلا جاتا ہے۔ نور شاہ نے ہر خاکے میں اس طرح رنگ بھرا ہے کہ اس کی شخصیت پوری طرح اُبھر کر قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

نور شاہ کی دوسری تخلیقات میں ''بند کمرے کی کھڑکی''، جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار اور کشمیر کہانی شامل ہیں۔ بند کمرے کی کھڑکی میں اُنہوں نے اپنی ادبی زندگی کی کھٹی میٹھی یادوں کو ڈائری کے اوراق میں سمیٹا ہے۔ نور شاہ نے افسانوی اسلوب دے کر ڈائری کے اوراق پر بکھری ہوئی کہانیوں کو بہت ہی دلچسپ اور دل آویز بنایا ہے۔ بند کمرے کی کھڑکی میں ریاست کی سماجی ادبی علمی اور ثقافتی پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے بہت سارے علمی اور ادبی واقعات سامنے آتے ہیں۔ جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار اس تعلق سے بے حد اہمیت کے حامل ہے کہ اس میں ریاست سے تعلق رکھنے والے بہت سارے افسانہ نگاروں کے بارے میں بھرپور جانکاری ملتی ہے۔ اُن کی ایک کہانی کا تجزیہ ملتا ہے اور ڈرامائی روپ بھی، بقول پروفیسر مجید مضمر جموں کشمیر کے افسانہ نگاروں کی تصویروں کی ایک نمائش ہے...... تصویروں کا یہ البم ریاست میں اردو افسانے کے پیچ وخم کو بھی ظاہر کرتا ہے اور افسانہ نگاروں کے احوال اور کوائف سے بھی واقف کراتا ہے۔ کشمیر کہانی دراصل کشمیر میں ہونے والے افسوس ناک اور المناک واقعات کی منظر کشی کرتی ہے۔

یہ کہانیاں لکھتے ہوئے نور شاہ نے ایک کیمرہ مین کا روپ اپنا لیا ہے اور واقعات و مناظر کی عکس بندی جسارت اور چابکدستی سے کی ہے۔ ان افسانوں اور ڈراموں میں آہوں، اور آنسوؤں کے مناظر کے ہوتے ہوئے بھی مایوسی کا عنصر نظر نہیں آتا۔

نور شاہ کا بیانیہ پختہ، دلکش اور رواں دواں ہے، وہ لفظوں کے اُلٹ پھیر میں قاری کو نہیں اُلجھاتے، بوجھل اور ثقیل الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے قلم میں تازگی ہے۔ زبان سلیس، سادہ اور پُر کار ہونے کے علاوہ کرداروں کی زبان سے جملوں کی فطری ادائیگی کہانی کار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسی سبب نور شاہ کی تحریروں میں پڑھے جانے کی ایسی بھرپور قوت ہے کہ عام قاری بھی اسے نہایت دلچسپی سے آخرت تک پڑھ کر ہی دم لیتا ہے اور یہی خوبی فنکار کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔



●...... پروفیسر ظفر احمد نظامی

نور شاہ۔ بعض اہم گوشے

بھرا بھرا چہرا، متانت کا رنگ گہرا، آنکھیں پُر نور، غرق کیف وسرور، ستواں ناک، ذہن محوِ سفر افلاک، بڑے بڑے کان، خوش بختی کی داستان، کشادہ پیشانی، علمیت کی نشانی ___ یہ ہیں نامور کہانی کار، افسانہ کا اعتبار، شخصیت بے نظیر، ترجمانِ جنتِ کشمیر، ادب کا مرکز نگاہ ___ یعنی جناب نور شاہ۔

نور شاہ سرینگر میں پیدا ہوئے، کشمیر کی رنگینی پر شیدا ہوئے زعفران زاروں میں پروان چڑھے، چناروں کے سایوں میں آگے بڑھے، خود کو تعلیم سے روشناس کیا۔ سرکاری ملازمت سے دل لگایا، کشمیر ایڈمنسٹریٹیو سروس کا اعزاز پایا۔ محکمہ زراعت میں عہدیدار رہے، دیہی ترقیاتی امور کے وقار رہے۔ شہر صحافت کے امیر رہے، ''دیہات سدھار'' کے مدیر رہے۔ ''پاپولر سائنس'' اور ''سائنس نیوز'' کی ادارت کی۔ شعبہ سائنس وٹکنالوجی کے سربراہ رہے، انرجی ڈیولپمنٹ ایجنسی کے مرکز نگاہ رہے۔

وہ ابتدا ہی سے تخلیقی قوتوں کے حامل رہے، قلمکاروں کی صف میں شامل رہے۔ انہیں بچپن سے افسانہ نگاری کا شوق ہے، لکھنے لکھانے کا ذوق ہے۔ انہوں نے ہر صنف ادب سے ناطہ، افسانوں اور ڈراموں سے رشتہ جوڑا، کہانی کے فن سے آشنا ہوئے، قصہ گوئی کے ناخدا ہوئے۔ آج وہ پسندیدہ کہانی کار ہیں، کشمیر میں اُردو افسانہ کا وقار ہیں، شہرت ان پر جھومتی ہے، مقبولیت ان کے وجود کو چومتی ہے۔ پہلے وہ موضوعات چنتے ہیں، پھر اُنہیں کہانیوں میں بنتے ہیں۔ وہ کہانیوں کو زیر بار نہیں کرتے، کرداروں کی بھرمار نہیں کرتے۔ انہوں نے کئی ادبی منظر

نامے بھی لکھے ہیں۔ بے شمار ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ وہ ناموری کی فصل بو چکے ہیں، ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ''ویرانے میں پھول'' کھلائے ''پائل کے زخم'' مہکائے۔ ''گیلے پتھروں'' کو سہارا دیا، ''بے گھاٹ کی ناؤ'' کو کنارا دیا۔ ''من کا آنگن'' قلم سے سجایا، ''رات کی ملکہ'' سے دل بہلایا۔ ''نیلی جھیل'' کے کالے سایوں کر جگمگایا، آؤ کہیں سو جانے میں کیف پایا۔

ان کی کہانیوں میں شگفتگی ہے، انداز میں شائستگی ہے۔ تحریریں زندگی سے روشن ہیں، مجروح دلوں کی دھڑکن ہیں۔ موسیقی کا رچاؤ ہے۔ چنچل ندیوں کا بہاؤ ہے، مہربانیاں ہیں، نامہربانیاں ہیں، آبادیوں میں ویرانیاں ہیں، امتزاج رنگ و بو ہے، حقیقت کی جستجو ہے۔ یاسیت کی تاریکیاں ہیں، نفسیات کی باریکیاں ہیں۔ امیدوں کا نور ہے، رجائیت کا سرور ہے۔ چنار کا جگمگاتا شباب ہے۔ ڈل کا خاموش اضطراب ہے۔ وادی کی وسعت بیکراں ہے، ناز و ادائے دلبراں ہے۔ محرومیاں ہیں، نزدیکیاں ہیں، دوریاں ہیں، محفل خوبان و بزمِ مہوشاں ہے، کیفیتوں کی مچلتی کہکشاں ہے۔

یوں تو وہ ہر کھیل کا ذائقہ چکھتے ہیں، کرکٹ میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ نور شاہ نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے، اسے جانچا ہے، پرکھا ہے، وہ اس کی ہولنا کیوں پر اشک بہاتے ہیں، مسرت آفرینیوں پر مسکراتے ہیں۔ مظلوموں کے ہمدرد ہیں، ہمدردی میں فرد ہیں، بڑے کشمیر شناس ہیں، زندگی کے عکاس ہیں۔ ان کا فن کامیاب ہے، کشمیر ہی کی طرح شاداب ہے۔

جو شخص ان کے ساتھ رہتا ہے، ان کے بارے میں یہی کہتا ہے کہ ۔

نور ہی نور بن کے رہتے ہیں ہر طرح طور بن کے رہتے ہیں

............●●●............

● ...... پشکر ناتھ

نُور شاہ اور اردو افسانہ

نور شاہ کی بات کشمیر میں اُردو افسانے اور اس کی نشو ونما کی بات سے الگ نہیں......نور شاہ کی بات آئے گی تو پس منظر میں کشمیر میں اُردو افسانے کی بات ضرور ہوگی۔
کشمیر میں اُردو افسانے کی ابتداء جب بھی ہوئی ہو مگر اس بات سے انکار نہیں کہ اُردو افسانے میں پریم ناتھ پردیسی پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں اور پریم ناتھ پردیسی کا آخری افسانہ جو بھی ہو یہ بات شاید سبھی جانیں گے کہ ''بہتے چراغ'' کے بعد کشمیر کا ایک بڑے پائے کا افسانہ نگار اپنی زندگی کے چراغ پر پستول داغ کر ہم سب سے نظریں چرا گیا۔۔تب سے بہت زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔مگر کشمیر کے بہت سے افسانہ نگار معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ کشمیر کے افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے کی اوڑھنی میں کون کون سے ستارے ٹانکے ہیں۔ جاننا اور ان کی صحیح قدروں کو متعین کرنا نقادوں کا کام تھا، مگر بدقسمتی سے اُردو زبان کے تمام نقاد اس بات پر خاموش ہیں۔ ممکن ہے اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔ یہ مصلحت اُردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہورہا ہے۔ ہاں ایک طرح کی ادبی بددیانتی عمل میں ضرور آرہی ہے۔اس بددیانتی کو مدِّ نظر رکھ کر یہ مضمون لکھا جارہا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو ادب میں کشمیری ادیبوں کا اتنا حصہ ضرور ہے کہ اُن کی طرف نقاد حضرات توجہ دیں۔
کشمیری ادیبوں کے تئیں جو بے اعتنائی برتی گئی اُس کا احساس باہر اتنی شدّت سے نہیں جتنا کشمیر

میں موجود ہے اور نتیجہ کے طور پر یہاں کا ادیب اپنے آپ کو Ignore کیا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود تخلیقی عمل جاری ہے اور کارواں میں نئے نئے ساتھی شامل ہو رہے ہیں۔ وقت آئے گا جب اُردو کے نقاد اس کارواں کی موجودگی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ مگر وقت کا انتظار کس نے کیا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ کشمیر کے ادیب بغیر کسی طرف دھیان دئے اپنا کام کئے جا رہے ہیں اور اپنا تخلیقی عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی کے بعد ادیبوں کا ایک کارواں وجود میں آ گیا ہے جو پوری تندہی اور لگن کے ساتھ اپنے پیش رووں کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھنے کے لئے کوشاں ہے بلکہ اس روایت کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ان میں سوم ناتھ زتشی، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، ٹھاکر پونچھی، حامدی کشمیری، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، مخمور بدخشی، موہن یاور، ویدراہی، برج کیتال، بنسی نردوش، صوفی غلام محمد، غلام رسول سنتوش، رام کمار ابرول، امیش کول، ہردے کول بھارتی اور دوسرے بہت سے ادیبوں کا ذکر خاص طور سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر حیرت کا مقام ہے جہاں یہ سب ادیب اُردو افسانے کو حتی المقدور سنوارا رہے ہیں، وہاں اس سارے تخلیقی عمل کا جائزہ لینے والا خاموش ہے۔ اس خاموشی کو یہاں کا ادیب بہت حد تک محسوس کرتا ہے اور نتیجہ کے طور پر جو بھی پہلا اُردو پڑھا لکھا آدمی کشمیر آتا ہے وہ جھٹ ایک مضمون لکھتا ہے جس میں یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک سرسری جائزہ ہوتا ہے، چند مشورے ہوتے ہیں بس! ظاہر ہے یہ پہلا اُردو پڑھا لکھا آدمی اپنے مضمون کی بُنیاد سُنی سُنائی باتوں پر اور کسی قہوہ خانے میں دو ایک ادیبوں کے ساتھ کی گئی گفتگو پر رکھتا ہے اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہوتا ہے۔

بہر حال! یہ میری بحث کا موضوع نہیں ہے، اس لئے میں اس بات کو اسی حد تک رہنے دیتا ہوں، یہ کہنے کے بعد کہ اب یہاں کے ادیبوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کام کا جائزہ لیں اور اس طرح نقادوں کے اس تغافل یا مصلحت کو چیلنج کریں...... اسی سلسلے کی پہلی کڑی یہ مضمون ہے جو میں اپنے ایک ہمعصر ادیب کی شخصیت اور فن پر تحریر کر رہا ہوں۔ اسی

استدعا کے ساتھ کہ اس مضمون کو اسی جذبے کے پس منظر میں رکھا جائے اور اس میں وہ نقادانہ قسم کی صلاحیت اور تشبیہیں ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی جائے جن کی ضربیں اور چوٹیں سہتے سہتے بائرن اور شیلے جواں مرگ ہوئے تھے!

نورشاہ نے سب سے پہلے شاہدہ شرین کے فرضی نام سے لکھنا شروع کیا۔ اُن کا پہلا افسانہ ''گلاب کا پھول'' کے عنوان سے دلی کے ایک ادبی جریدے ''بیسویں صدی'' میں شائع ہوا۔ بہرحال نُورشاہ کی ادبی زندگی کا آغاز ''گلاب کا پھول'' سے ہوا، اور تب سے آج تک اس افسانہ نگار نے درجنوں افسانے لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اچھا افسانہ چاہے نورشاہ کا لکھا ہوا ہو یا شاہدہ شرین کا، ہرحالت میں اچھا ہی کہلایا جائے گا!

میری دانست میں نورشاہ کے لکھے ہوئے افسانوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ابھی نورشاہ کو افسانہ نگاری کے میدان میں آئے ہوئے اتنا وقت نہیں ہوا ہے جسے ادوار میں تقسیم کیا جا سکے۔ پہلا دور وہ ہے جب نورشاہ نے ''گلاب کا پھول'' ''بن برسے بادل'' اور ''زعفران کی لالی'' کے درمیان کے افسانے لکھے ہیں۔ نورشاہ کی اُس دور کی سب سے کمزور کہانی ''زعفران کی لالی'' ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نورشاہ کی اُس دور کی باقی تمام کہانیاں اچھی ہیں۔ اچھے اور بُرے افسانوں کی پہچان کرنے کے لئے ہیں اُردو کے Contemporary افسانوں کے پسِ منظر میں بات چلانی ہوگی اور اُن تمام کلیوں اور قاعدوں کو مدنظر رکھنا ہوگا جن کی کسوٹی پر پورا اُترنے کے بعد ہی کوئی افسانہ اچھا یا برا کہلایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ مضمون ایک پیشہ ور نقاد سے نہیں لکھا یا جا رہا ہے جیسا کہ اُوپر ذکر آیا ہے۔

اس دَور میں نورشاہ کے افسانوں کے دو مجموعے ''بے گھاٹ کی ناؤ'' اور ''ویرانے کے پھول'' اور ایک ناول، نیلی جھیل کالے سائے، شائع ہوئے ہیں۔ ان دونوں افسانوی مجموعوں میں ہمیں نورشاہ کی دونوں طرح کی کہانیاں ملتی ہیں کامیاب بھی اور وہ بھی جو زیادہ کامیاب نہیں ہیں۔ ان میں دبن برسے بادل، نلنی، گلاب کا پھول، اندھے خواب، بوٹ کی آخری رات، اجنبی

سمندر اور لڑکی، ویرانے کے پھول، ادھوری کہانی وغیرہ افسانے قابل ذکر ہیں۔

ان افسانوں کے پسِ منظر میں نور شاہ ایک ایسے ادیب کی حیثیت سے اُبھرتا ہے جس کا ذہن رومانی ہے اور جو رومان کے تانے بانے سے ایک ایسی فضا خلق کرتا ہے جس میں اس کے کردار نیم الف لیلوی لگتے ہیں۔ مگر ایک بات جو واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ اُس کی طرزِ تحریر ہے جو الف لیلی ہونے کے ساتھ ساتھ کٹی پھٹی ہے اور وہ جذبہ ہے جو ہر بُرائی سے پہلو بچاتا ہوا دنیا کی خوبصورتی کی تلاش میں بھٹکتا رہتا ہے۔

میری نظر میں نور شاہ ایک ایسی روح ہے جو ازل سے خوبصورتی کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر اس تلاش میں نور شاہ نے فن کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ان افسانوں میں نور شاہ نے زیادہ تر توجہ ماحول اور اُس کی تربیت پر، کرداروں کے باہمی ربط، اور اندازِ بیان پر دی ہے اور اس توجہ میں تکنیک اور ٹریٹمنٹ میں کوئی نیا تجربہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ مجموعی طور پر نور شاہ کے دور کی لکھی ہوئی کہانیاں اگر ایک طرف اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ایک قابلِ توجہ افسانہ نگار معرض وجود میں آیا ہے تو دوسری طرف ان میں کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی کہ جس کی بنا پر انہیں غیر معمولی کہا جاسکے۔

نور شاہ کے افسانوں کا دوسرا دور ''لمحے اور زنجیریں'' سے شروع ہوتا ہے جب میں نے یہ کہانی پڑھی تو میں چونک اُٹھا۔ اس میں چونکا دینے والی بات ہی تھی۔ میں پہلے دو ایک سال سے اظہار کی اُلجھنوں میں گرفتار ہوں اور احباب کے ساتھ مسئلہ کئی مرتبہ زیر بحث آیا ہے۔ اُردو افسانہ اب اس موڑ پر آ گیا ہے جہاں اظہار کی نئی راہیں تلاش کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ انسانی فطرت کے نت نئے موڑ، انسانی دماغ کی پیچیدگیاں اور لاشعور کے Dimensions کو صفحہ قرطاس پر لانے کے لئے ایک ادیب کی کم مائیگی شاید اس بات کی محرک ہو۔ بہر حال یہ بات ہم لوگ کئی مرتبہ زیر بحث لا چکے ہیں اور اُردو افسانے میں چند تجربے کئے بھی گئے ہیں جن میں پروفیسر خلیل احمد کا 'جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے'' قابلِ ذکر ہے۔ حال ہی میں ''آگ کا دریا'' اسی طرح کے

اظہار کی ایک واضح مثال ہے۔اس لئے جب میں نے نور شاہ کا یہ افسانہ پڑھا تو میں چونک اُٹھا۔
اس کے بعد نور شاہ کے چند اور افسانے ''ایک رات کی ملکہ، مونا نرا، تاریک راتوں کے فرشتے
میری نظر سے گزرے اور میں اُن کے فن کا قائل ہو گیا۔ یہ افسانے نور شاہ کی نئی کتاب ''ایک
رات کی ملکہ'' میں شامل ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے کشمیر کے بہت ہی کم ادیبوں نے اظہار
کے اس مسئلے کو سمجھ کر ایسے کامیاب تجربے کئے ہیں۔ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے
کہ نور شاہ کتنا ذہین اور محنتی افسانہ نگار ہے۔ انسان کے دماغ کی وہ بلندیاں اور وہ پستیاں
جہاں فرشتے بھی پاؤں دھرنے سے ڈر محسوس کرنے لگیں، ان افسانوں میں اس کامیابی سے
پیش کی گئی ہیں کہ ہم اب نور شاہ کو محض ایک اُبھرتا ہوا افسانہ نگار نہیں کہہ سکتے ـــــ ان میں نور
شاہ نے ایک خاص ڈھنگ کو اور ایک خاص ٹریٹمنٹ کو اپنایا ہے جو اسے ایک منفرد مقام بخشنے کے
لئے کافی ہے۔

نور شاہ کی افسانوی زندگی کا آغاز صرف چند سال پہلے ہوا ہے مگر جس لگن سے اور جس
محنت سے اُنہوں نے کام کیا ہے اور جو نتیجے اس لگن اور محنت سے برآمد ہوئے ہیں اُس نے نور
شاہ کو اپنے بیشتر ہم عصروں سے آگے بڑھا دیا ہے۔

نور شاہ ایک معصوم چہرے اور پر نور شخصیت کا مالک ہے۔اس کے بظاہر پُرسکون اور پُر
امن سراپا کو دیکھ کر بہت سے آدمی دھوکا کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ نور شاہ نے اپنے اندر کی اضطرابی
کیفیت اور اپنے تجسس کو اور اپنی تڑپ کو بھی اپنے چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔یہ آدمی جب بات
کرتا ہے تو لگتا ہے جیسے بات نہیں کر رہا ہے کوئی سحر پھونک رہا ہے۔نور شاہ کو بہت کم غصے کی حالت
میں دیکھا گیا ہے۔ بہت کم یہ کسی ادبی، سیاسی، سماجی یا مذہبی مسئلہ پر بحث کرتے دیکھا گیا ہے۔
اس کے سراپا پر ہر وقت ایک ایسی کیفیت طاری رہتی ہے جیسے یہ شخص دائمی خواب دیکھتا رہتا ہو۔اس
خواب کی تعبیر کیا ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ یہاں کوئی اندازہ کام نہیں کر سکتا۔نور شاہ کی اس
بظاہر پرسکون زندگی میں کیسے کیسے......ان کے بارے میں بھی کوئی آدمی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں نور شاہ کی نظر بہت دور تک جاتی ہے اس کی وجہ اُس کے ارد گرد کا ماحول ہے۔ نور شاہ اس ماحول میں رہتا ہے جہاں صرف پستیاں اور بلندیاں ہیں اور بیچ کا ایک بھیانک خلاء ہے۔ یہاں وہ ہانجی طبقہ ہے جو سردیوں کے برفیلے اور ٹھٹرانے والے دن اپنی اپنی کشتی کے سروں پر مغموم انداز میں بیٹھے ہوئے اس اُمید پر گزارتے ہیں کہ بہار کے آنے کے ساتھ ہی وہ سیاح آنے شروع ہوجائیں گے جن کے دلوں میں جنت کی تمنا ہوتی ہے اور پھر ان کو بھی روزگار ملنے کا موقع ملے گا۔ یہاں وہ دولت مند طبقہ بھی رہتا ہے جو بیرومیٹر کے پارے سے بے نیاز اپنے دن اُن گلابی ڈرائنگ روموں میں گزارتا ہے جہاں گناہ اور ثواب کی تمام حدیں معدوم ہوجاتی ہیں اور نور شاہ ہمیں ان گلابی ڈرانگ روموں کے اندر لے جاتا ہے۔ اُن سرحدوں سے روشناس کراتا ہے کہ جن کے اِدھر اُدھر کوئی دنیا نہیں۔ کوئی دنیا کا غم نہیں۔ صرف جام کی مہک ہے اور رمبا سمبا کے ناچ ہیں۔ نور شاہ کو ان دونوں طبقوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور وہ اپنے افسانوں میں بار بار چلاتے ہیں کہ یہ مسخ شدہ چہرے، یہ گلابی ڈرائنگ روم، یہ چمکتی کاریں دراصل وہ نہیں جو یہ بظاہر لگتی ہیں، ایک رات کی ملکہ، ایک رات کی بات، کمرہ نمبر ۱۳، اور آشیاں میں یہ بات نہایت چابکدستی سے سامنے لائی گئی ہے۔

مگر ان گھناؤنی تصویروں میں رنگ بھرتے بھرتے نور شاہ کا ذہن قنوطی نہیں ہوا ہے۔ اُس نے خطیبانہ لہجہ بھی نہیں اختیار کیا ہے اور نہ اس کے اندازِ بیان میں طنز کی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ وہ بہت نرم، شیتل اور خاموش لہجے میں بات کرتا ہے اور ہنسی خوشی اُن تمام مرحلوں سے گزر کر کہانی کے اختتام تک آتا ہے، جہاں ایک دل دہلا دینے والی چیخ کی گونج دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اگر یہ ایک افسانہ نگار کی کامیابی نہیں ہے تو میرے پاس کامیابی کی کوئی اور تشریح نہیں ہے۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود نور شاہ خوبصورتی کا قائل ہے۔ اُس نے اپنے اندر کی خوبصورتی کے احساس کو بچائے رکھا ہے اور یہ اتنا شدید احساس ہے کہ کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ

نور شاہ Optimist ہے اور ہر بدصورتی میں خوبصورتی ہی دیکھ سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے نور شاہ کے افسانے بغور پڑھے ہیں، وہ مجھ سے اتفاق کرنے میں کوئی پس وپیش نہیں کریں گے کہ نور شاہ ایک خوبصورت دنیا کا خواہاں ہے، ایک سچی اور ایماندار دنیا کا حامی ہے۔ اور اس لئے ہر اُس بدصورت بُت کو توڑتا ہے جو بظاہر خوبصورت تو ہے مگر اپنے اندر بے پناہ غلاظت چُھپائے ہوئے ہے۔

نور شاہ کے افسانوں کی عمر کم ہے مگر اس کی کم عرصے ہی میں نور شاہ نے اپنی محنت، لگن اور تندہی سے اپنے لئے ایک جگہ بنالی ہے۔ یہ صرف کشمیر کے اُردو افسانہ نگاروں میں ہی نہیں بلکہ ملک کے جدید تر افسانہ نگاروں میں بھی اور یہ وہ مقام ہے جہاں نور شاہ کے ہمعصر ادیب اسے محبت، مسرت اور رشک کے ملے جُلے جذبے سے دیکھتے ہیں۔



(نوٹ: یہ مضمون پشکر ناتھ نے ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی میں نور شاہ کے حوالے سے تحریر کیا تھا۔)

●...... دیپک بُدکی

نور شاہ کا تخلیقی سفر

رومانیت سے حقیقت تک

نور شاہ ایک ایسے تخلیق کار ہیں جو اپنے دل میں پون صدی کے تغیرات، انقلابات، قوم کا المیہ، اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور انسان کا درد و کرب لئے ہمیں آج بھی اپنے رومانی افسانوں، ناسٹلجیائی یادداشتوں، دلفریب خاکوں اور پارینہ روزنامچوں سے محظوظ کر رہے ہیں۔ تقریباً ساٹھ سال پہلے انہوں نے سجاد حیدر یلدرم سکول کی پیروی میں اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا جس کی آبیاری گزشتہ صدی میں ماہنامہ، بیسویں صدی، نئی دہلی کرتا رہا۔ نور شاہ کی اکثر بیشتر کہانیاں اسی رسالے میں چھپتی رہیں اور قارئین کی دلچسپی کا مرکز بنتی رہیں۔ عشق و محبت کی ماورائی کہانیاں، افلاطونی کردار اور جمالیاتی موضوعات......! نور شاہ نے خود بھی رومان پرور طبیعت پائی ہے جو حسن و جمال کی انتہا دیکھنے کی متلاشی ہے۔ ان کے بارے میں عبدالقادر سروری فرماتے ہیں:

"نور شاہ وادی کے افسانہ نگاروں میں غالباً سب سے زیادہ لکھنے والے افسانہ نگار ہیں۔ ......کہانی لکھنے میں انہیں نہ صرف ذوق ہے، بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح وہ ہر موضوع سے ایک مؤثر افسانہ اور ہر موقف سے دلچسپ مرقع پیدا کر سکتے ہیں جہاں ان کے موضوع میں دم نہیں، اسے بھی اپنے پیش کشی کے انداز اور فنی چابک دستی سے وہ جیتا جاگتا

بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سینکڑوں کردار انہوں نے پیدا کئے ہیں، تاہم ان میں یکسانیت بہت
کم ہے، وہ حقائق کے افسانے لکھتے ہیں، لیکن رومانی حقائق کے......نورشاہ کرداروں کی بیرونی
رنگ کاری کے علاوہ اکثر ان کے بطون کی گہرائیوں میں بھی جھانکنے کی کوشش کرتے
ہیں......افسانوں میں ڈرامائی موقف پیدا کرنے کی وہ شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔"

(عبدالقادر سروں، 'کشمیر میں اردو'، جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر، کشمیر، تیسرا حصہ، ۱۹۸۴ء، ۲۵۔۲۲۴)

سازگار ادبی ماحول کے سبب ڈل گیٹ سرینگر سے کئی ادیب سامنے آتے رہے ہیں۔ نورشاہ اور ان کے خاندان میں سبھی بھائی اردو ادب کی طرف مائل تھے۔ اس علاقے کی خصوصیت یہ ہے کہ پس منظر میں شنکر آچاریہ کی پر شکوہ پہاڑی ہے اور پیشِ منظر میں جھلمل کرتی ہوئی ڈل جھیل ہے جو سارے ماحول کو پر کیف بناتے ہیں۔ پھر گرمیوں میں خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے سیاحوں کے خوشنما قافلے سونے پر سہاگا کا کام کرتے ہیں۔ اسی ماحول سے ترغیب پا کر نور شاہ نے افسانے کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اور عمر بھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ اس بارے میں خود ہی فرماتے ہیں:

"دراصل وادی کے جس حصے میں میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا اور جوانی کے ایام جیے ہیں، وہ ڈل جھیل کے آس پاس کے کچھ حصے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ وادی کے اسی حصے میں میرے احساس جمال کی پرورش ہوئی ہے اور وہ حسن جو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے لاشعوری طور پر میری کہانیوں میں منعکس ہے۔

(نورشاہ، افسانوی مجموعہ 'بے ثمر سچ'، امیکس بکس، حضرت بل، سرینگر کشمیر ۲۰۰۵ء، ص ۸)

نورشاہ کو بچپن ہی سے افسانہ نگاری کا شوق رہا لیکن ان کی ادبی زندگی کی باضابطہ شروعات ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ چونکہ ابتدا میں چند ایڈیٹروں نے ان کے افسانے لوٹا دیے اس لئے انہوں نے اپنی کہانیاں چھپوانے کا ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا اور وہ تھا اپنے نام کے

بدلے 'شاہدہ شیریں' کے فرضی نام سے افسانے بھیجنا۔ ایڈیٹر حضرات اس خوبصورت نام پر لٹو ہو گئے اور کہانیاں دھڑا دھڑ چھپنے لگیں۔ بے شمار خطوط بھی آتے رہے جن میں تقرب حاصل کرنے کی خواہشوں کا مکرر اظہار ہوتا۔ آخر کار شاہدہ شیریں' تقلیب ماہیت پر مجبور ہوئی اور وہ 'نور شاہ' بن کر سامنے آ گئی۔ بقول نور شاہ ان کا یہ دور کافی من چلا رہا۔ کئی معروف ادبا کے خطوط ملے جن سے ان کی دوہری شخصیتیں سامنے آ گئیں۔ ایک دفعہ گفتگو کے دوران میں نے ان سے التماس کی تھی کہ ان خطوط کو شائع کروالیں مگر ان کی شرافت، حلیمی اور وفاداری انہیں ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے۔ ۱۹۵۹ء میں 'ہمارا ادب' کے انتخاب کے لئے ان کی ایک کہانی 'گلاب کا پھول' چن لی گئی جس میں پروفیسر حامدی کاشمیری نے آخر کار نقاب الٹ دیا:

> '' 'بے گھاٹ کی ناؤ' کا خالق نور شاہ نقلی نسوانی لبادے اتار کر، اب اصلی صورت میں ہمارے سامنے آ رہا ہے اور ہماری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہا ہے۔''

(بحوالہ 'نور شاہ' جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، جان محمد آزاد، جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر، ص ۱۸۸)

نور شاہ کی پہلی کہانی ماہنامہ، بیسویں صدی' نئی دہلی میں بعنوان' گلاب کے پھول' چھپی تھی جبکہ ان کا پہلا ڈرامہ 'دل کی روشنی' ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوا تھا۔

نور شاہ کی افسانہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''نور شاہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس قزح کے رنگ آ گئے ہیں اور اس خصوصیت نے نور کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ نور شاہ افسانہ بُننے کے گُر سے بھی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں جس سے ان کے افسانوں میں غم کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہو گئی ہے۔ 'بے گھاٹ کی ناؤ'، 'من کا آنگن اداس اداس' اور 'گیلے پتھروں کی

مہک' جیسے افسانے قابل قدر ہیں اور ہمارے افسانوی ادب میں اضافہ۔''

(ڈاکٹر برج پریمی، 'اردو افسانہ ریاست میں'، انتخاب اردو ادب، ۴۷ء تا ۷۱، نور شاہ ۱۹۷۲ء)

ان کے افسانوں کے مجموعے 'بے ثمر سچ' پر راقم الحروف کے تبصرے کا اقتباس بھی یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''نور شاہ افسانے لکھتے وقت 'ستیم، شوم اور سندرم' کی کھوج میں نکلتے ہیں۔ وہ نہ صرف عورت کے حسن سے متاثر ہیں بلکہ مناظر قدرت سے بھی جھوم اٹھتے ہیں۔ بہر حال عورت ان کے تخیل پر حاوی رہتی ہے۔ اس عورت میں وہ دوشیزہ کی پاکیزگی بھی دیکھتے ہیں اور ماں کی ممتا بھی۔ بیوی کی رعنائیاں بھی ڈھونڈتے ہیں اور کسی کی شہوت انگیز انگڑائیاں بھی۔''

(دیپک بدکی، تبصرہ 'بے ثمر سچ'، عصری تحریریں، میزان پبلشرز، سرینگر کشمیر، ص ۸۴)

مذکورہ مجموعے (بے ثمر سچ) کی کئی کہانیاں بہت متاثر کرتی ہیں جیسے وہ جو ایک شخص تھا، لکیریں بے جڑ پودے ،صلیب وغیرہ۔ مجموعے میں شامل کچھ افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

☆ ''یہ زندگی ایک کہانی ہے اور اس کہانی میں ماضی کے کچھ حسرت بھرے لمحے حال کی بے پناہ اُداسیاں اور مستقبل کی ان دیکھی ان جانی پرچھائیاں پوشیدہ ہیں۔'' (رات کا سورج)

☆ ''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم کس دور میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم کس سماج اور کس سوسائٹی کی تخلیق کر رہے ہیں۔ یہاں ہر شے میں بناوٹ ہے، ملاوٹ ہے، ہماری باتیں، ہماری سوچیں بھی تو نقلی ہیں۔ سبھی پر ملمع چڑھا ہوا ہے۔'' (بے جڑ پودے)

☆ ''ہر شاخ ایک صلیب ہے اور ہر صلیب پر نڈھال عیسیٰ کو خدا کی تلاش ہے!'' (صلیب)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ابتدا میں نور شاہ کے افسانوں میں رومانیت غالب رہی اور نفسیاتی واہ واہی (Appreciation Therapy) کے باعث وہ اس ڈگر پر بہت عرصہ تک گامزن رہے۔ البتہ ان کے افسانے وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا کی منزلیں طے کرتے رہے اور حقیقت پسندی کے نزدیک آنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ انہی دنوں ترقی پسند تحریک اپنے زوروں پر تھی اس لئے نور شاہ نے بھی غریبوں اور مفلسوں کی حمایت میں افسانے

لکھے مگرانہوں نے نہ اپنا اندازِ بیان ترک کیا اور نہ ہی اپنے افسانوں کو فوٹو گرافی یا تحریکی منشور بننے دیا۔ اس بارے میں عبدالقادر سروری فرماتے ہیں:

''اس عہد کے افسانہ نگاروں کی طرح انہیں بھی مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے، اکثر افسانوں میں انسان دوستی کے جذبے سے کام لیتے ہیں۔ کشمیری عوام کی زندگی، ان کے جذبات، ان کے رنج وغم، ان کی مسرتوں، ان کی تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی مرقعے ان کے افسانوں کی کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔''

(عبدالقادر سروری، 'کشمیر میں اردو'، جے اینڈ کے اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر، تیسرا حصہ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۴)

نورشاہ دورِ جدیدیت میں بھی کافی فعال رہے مگر ان کے افسانوں پر جدیدیت کا اثر بہت کم نظر آتا ہے۔ وہ استعاراتی و علاماتی حد بندیوں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار کھل کر کرتے ہیں۔ انہوں نے بیانیہ کا خوب استعمال کیا ہے حالانکہ مکالمہ کو بھی ضرورت کے مطابق کام میں لاتے ہیں۔ بقول رؤف راحت'' ...... یہاں تک کہ قاری کی موت واقع ہوتی اگر نورشاہ جیسے تخلیق کار نہ ہوتے۔''

(رؤف راحت، حرفِ چند، نورشاہ کے تین ناولٹ، میزان پبلشرز، سرینگر، کشمیر ۲۰۰۹ء، ص ۷) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہوں نے علامتوں کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ ان کے کئی افسانوں میں کتا، چنار، سفید رنگ اور برف وغیرہ بطور علامات استعمال ہوئے ہیں مگر ان علامتوں کو وہ منزل نہیں سمجھتے بلکہ ان کو منزل تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

نورشاہ کے افسانوں کی ایک اور خوبی ان کی منظر نگاری ہے۔ وہ قاری کے ذہن پر مطلوبہ منظر کا ہو بہو عکس بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے اندھیرے اجالے، بے جڑ پودے، لکیریں قابل غور ہیں۔ اچھا ڈرامہ نگار ہونے کے سبب ان کے افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔ ان کے مکالمے جچے تلے اور چست ہوتے ہیں۔ کہیں

کہیں وہ طنز کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔نور شاہ کے افسانوں کا اختتام بھی عنوان ہی کی طرح چونکانے والا ہوتا ہے۔ جہاں تک کرداروں کا سوال ہے وہ باہر سے زیادہ کردار کے درون میں جھانکتے ہیں۔کردار کی نفسیاتی کشمکش، الجھن اور کجروی کو وہ بڑی ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں اور شجرِ ممنوعہ کے پھل کو چکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ چنانچہ اپنے کرداروں کے بارے میں خود ہی لکھتے ہیں:

> ''میرے افسانوں کے اکثر و بیشتر کردار رومانوی ہیں۔میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں۔میرا ایسا سوچنا بجا بھی ہے کہ زندگی حسن و عشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان ہی سے قائم ہے۔''
>
> (نور شاہ، افسانوی مجموعہ 'بے ثمر سچ'، امیکس بکس، حضرت بل، سرینگر کشمیر ۲۰۰۵ء، ص ۸)

جیسے کہ پہلے ہی ذکر آچکا ہے کئی افسانوں میں کرداروں کی نفسیاتی کجرویوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔مثلاً دستک Electra Complex؛ صلیب Sexual Dissatisfaction ؛ وہ جو ایک شخص تھا، زمین کھولے گی زبان اپنی، اور آخری دن سے پہلے Guilt Complex؛ رات کا سورج Oedipus Complex؛ ایک لمحے کی محنت Sodomy؛ اشرف المخلوقات اور انجانے اتہاس کی کڑیاں Lesbianism & Wife Swapping وغیرہ۔ اس کے باوجود وہ ان معاملوں پر کُھل کر نہیں لکھتے بلکہ بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ اور سلجھے ہوئے طریقے سے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کشمیر افسانہ نگار کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔وہ اسی دھرتی پر پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور زندگی کے نرم و گرم سے جوجھتے رہے۔ان کے اکثر افسانوں میں کشمیر کا عکس بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ملتا ہے۔ مجموعہ 'بے ثمر سچ' کے کئی افسانے کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے 'ٹوٹتے لمحوں کا بیان'، 'لکیریں' وغیرہ۔افسانہ 'اس کی گلی کا پاپ' میں کشمیر کے موجودہ ماحول کی منظر نگاری بالواسطہ طور پر یوں کی گئی ہے۔

''اب یہاں کوئی ہنگامہ نہیں، کہیں کوئی چیخ نہیں، کوئی شور نہیں۔ برف کی سفید روشنی میں ساری گلی اونگھ رہی ہے، سارا ماحول تھکا تھکا اور سویا سویا سا ہے جیسے اب کوئی یہاں نہیں رہتا۔ یہ انسانوں کی بستی نہیں قبرستان ہے، سارے مکان سارے گھر برف کی قبریں ہیں اور ان میں رہنے والے لوگ برف کی مورتیاں، بے حس بے جان، یخ ٹھنڈی لاشیں، مسخ شدہ چہرے، گوشت پوست کے بغیر جسم، خالی خالی بے رس ہڈیاں۔ اب یہاں وہ آواز بھی نہیں جو دل کے جنگل میں محبت کی کوئی قد آور شاخ بلندی سے پستی کی جانب ٹوٹنے سے بے ساختہ نکلتی ہے اور چند لمحوں کے لئے دل کی دنیا میں ایک مرگ آلودہ سناٹا چاروں سمت پھیلا دیتی ہے۔!!

بیسویں صدی کے آٹھویں دہے میں کشمیر میں جو انقلاب آیا اس نے یہاں کی زندگی کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔ ایک ایسے قلم کار کے لئے جو چالیس سال اپنے رومانی خامہ کو جمالیات کی روشنائی میں ڈبو ڈبو کر حسن و جمال کے پیکر بناتے رہے اور جو ہمیشہ کہتے رہے کہ ''ہم سب کا جسم ایک ہے، جسم کی بناوٹ ایک ہے، جسم کے اندر خون ایک ہے، خون کا رنگ ایک ہے، تو پھر یہ فرق کیوں......؟''۔ ان کے لئے یہ ایک بہت بڑے امتحان کا وقت آن پڑا تھا۔ ان کے ہم راہی کچھ تو راہ عدم اختیار کر گئے تھے، کچھ وادی کو الوداع کہہ چکے تھے۔ اپنی قوم کا شیرازہ بکھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اندر سوئی ہوئی روح جاگ اٹھی، ایک نئی توانائی نے پھر سے جنم لیا، ان کے سوچ و فکر میں کافی تبدیلی آئی اور وہ اپنے شہر آشوب کا نوحہ رقم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ غریب معصوم کشمیریوں کے بہتے لہو کو قرطاس پر جمع کر کے ان کا کولاج بنا گئے، ان کی خاموشیوں کی صدا سننے کے لئے اپنے کان دھرنے لگے، ان کی محرومیوں کا دکھ درد بانٹنے لگے اور ان کی بے زبانی کو زبان دینے لگے۔ اس حوالے سے ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی کی ایڈیٹر ڈاکٹر شمع افروز زیدی فرماتی ہیں:

''نور شاہ ایک جانب لفظوں، رنگوں موسیقی کی دلکش تان، بانسری کی لے، وائلن کی دُھن اور جسم کے آہنگ کے ذریعہ انتہائی لطیف انداز میں اپنے احساسات کو واضح کرتے ہیں تو دوسری جانب

زندگی کی سنگلاخیت کا ذکر بھی اسی شد و مد سے کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں کہ موجودہ کشمیر پہلے جیسا جنت بے نظیر رہا بھی تو نہیں۔ اب وہاں نہ بانسری کی مدھر تان گونجتی ہے، نہ ہی دل نواز مناظر دل کو موہ لیتے ہیں، نہ وہاں کے حسین موسم کہانی کہتے محسوس ہوتے ہیں، نہ ڈل جھیل کے ٹھنڈے پانی کی سرد لہر جسم میں سرایت کرتی ہے، نہ چنار کے درختوں کی پُرسکون چھاؤں میسر آتی ہے اور نہ وہاں کی وادیاں سرگوشیاں کرتی محسوس ہوتی ہیں لیکن یادِ رفتگاں کے طور پر نور شاہ اپنے ماضی کے کشمیر کو تلاشتے ہوئے ضرور محسوس ہوتے ہیں۔''

نور شاہ کے تین ناولٹ 'آدھی رات کا سورج'، 'آؤ سو جائیں'، لمحے اور زنجیریں' ان کے شروعاتی دور کی تخلیقات ہیں اس لئے ان میں بھرپور رومانیت نظر آتی ہے۔ نور شاہ نے رومانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان ناولٹوں کے کرداروں میں عجیب سالا ابالی پن ملتا ہے اور کشمیر کے حسین مناظر کے ساتھ ساتھ اوبرائے ہوٹل میں ماضی کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔
ناولٹ 'آؤ سو جائیں' پر اعجاز صدیقی، ایڈیٹر ماہنامہ شاعر ممبئی لکھتے ہیں:

''آؤ سو جائیں' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے، وہیں ایک یگ کی کہانی بھی ہے۔ اس ناولٹ میں نور شاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔''

(حرف چند، نور شاہ کے تین ناولٹ، مرتبہ رؤف راحت، میزان پبلشرز سرینگر، کشمیر، ۲۰۰۹ء ص vi)

نور شاہ نے گزشتہ کئی برسوں سے اپنی ڈائری کے صفحات اور اپنی یادداشتوں کو قرطاس کے حوالے کر دیا ہے۔ ان خاکوں اور ماضی کے واقعات کو پڑھ کر قاری ایسے محسوس کرتا ہے کہ وہ رائٹر کی یادوں کے البم کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ 'بند کمرے کی کھڑکی' ان کی ڈائری کے چنندہ اوراق پر مشتمل ہے جن کی ترتیب تاریخ کی بجائے موضوعیت پر دی گئی ہے۔ اس ڈائری میں ۴۴ ادیبوں و صحافیوں، ۳ فلمی شخصیتوں، ۳/ مصوروں و مجسمہ سازوں، ایک موسیقار، اور ۲/ ادبی تنظیموں کا ذکر آچکا ہے۔ اس سے بڑھ کر اس ڈائری سے خود قلم کار کی شخصیت کے پوشیدہ پہلو بھی سامنے

آتے ہیں۔ ان کی نیک نیتی، ہمدردی اور اصول پرستی کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی کے اصولوں کی ان دیکھی، فرقہ وارانہ فسادات نیز انسانی اقدار کی پامالی پر ان کا دل رنجیدہ ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ کشتواڑ اور بھدرواہ کے دورے پر وہاں کی حالت دیکھ کر وہ اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

''ایک ڈر کا ماحول ہر سمت پیدا ہو گیا اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ خود ہم لوگ، ہمارے رہنما اور سیاست دان، ہماری معاشرہ، ہمارا انتظامیہ......کوئی بھی آدمی جنم سے بُرا نہیں ہوتا۔ تو کیا یہ مادہ پرست دنیا ہے جو آدمی کو کرپٹ Corrupt کرتی ہے۔......یہ سوال میں اپنے آپ سے بھی کرتا ہوں اور آپ سے بھی......!''

ماحولیات پر نور شاہ کی فکرمندی اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ انہیں ایک جانب ڈل جھیل کے پاس اپنے مکان کے کھونے کا غم ستاتا ہے اور دوسری جانب ڈل جھیل کی آلودگی پریشان کر دیتی ہے۔ اِدھر جہلم دریا کے بہاؤ کی کمی دیکھ کر وہ مایوس ہوتے ہیں اور اُدھر سکڑتے ہوئے ولر جھیل کو دیکھ کر۔ انہوں نے اردو کے پرخلوص خادم اور بیسویں صدی کے ایڈیٹر خوشتر گرامی سے ہوئی دھوکے بازی کو اسی شدت سے بیان کیا ہے جس شدت سے انہوں نے اپنے کھوئے ہوئے یار دوستوں کے بارے میں لکھا ہے۔ 'یادوں کی مہک' کے عنوان سے نور شاہ نے کشمیری پنڈت کلچر اور پنڈت ادیبوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنے پنڈت دوستوں کا دردمندی سے ذکر کیا ہے اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی جتائی ہے۔ اس ڈائری کے بارے میں عمر مجید لکھتے ہیں کہ:

''نور شاہ نے ہفتہ وار ایک ادبی ڈائری لکھنے کا فریضہ اپنے کندھوں پر لیا اور ادبی شخصیات اور عصر حاضر کے ادبی حالات و واقعات کو اپنے منفرد اور مخصوص انداز میں پیش کرنے لگے۔ یہ محض ایک خانہ پری نہ تھی بلکہ ایک بامقصد کوشش تھی جسے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ برصغیر کی ادبی دنیا کے لئے نئی چیز ہے۔''

(عمر مجید، 'فلک رنگ تاثرات' بند کمرے کی کھڑکی، نور شاہ، ص ۹۰-۸۹)

اسی نہج کی ایک اور کتاب 'کہاں گئے وہ لوگ' کے عنوان سے سامنے آئی ہے جس میں نور شاہ نے ۶۷ شخصیات پر اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود ان کے فن پر لکھی گئی آرا کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اردو کے ادیب ہیں جیسے پریم ناتھ پردیسی، موہن یاور، ابن صفی، جگن ناتھ آزاد، کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، حکیم منظور، خواجہ احمد عباس، شکیل الرحمٰن، کشمیری ادب سے وابستہ قلم کار ہیں جیسے اختر محی الدین، دینا ناتھ نادم، موتی لال ساقی، فاضل کاشمیری دانشور ہیں جیسے پی این پشپ، محمد دین فوق، محی الدین حاجنی، صحافی ہیں جیسے ملک راج صراف، فلمی ہستیاں ہیں جیسے محمد رفیع، پرتھوی راج کپور، نور جہاں، مدھو بالا، نوشاد علی، امجد خان اور ریڈیو دوردرشن سے وابستہ آرٹسٹ ہیں جیسے بنسی نردوش، شجاع سلطان، غرض ایک کہکشاں ہے جو ان صفحات پر سجائی گئی ہے۔ طوالت کی وجہ سے یہاں پر پوری فہرست نہیں دی گئی ہے البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ جن لوگوں کے خاکے اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں ان میں سے قریب قریب سب کے ساتھ نور شاہ کے قریبی تعلقات رہے ہیں جبکہ دوسرے لوگوں سے وہ ملے بھی نہیں ہیں مگر وہ اپنی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر ان سے کافی متاثر رہے ہیں ۔کتاب میں کئی ایسی باتیں درج کی گئیں ہیں جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔

'جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار۔تعارف، فن اور مکالمہ' کے عنوان سے نور شاہ کی ایک اور دستاویز ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی جس میں انہوں نے چند مضامین کے علاوہ ریاست کے ۶۰ر افسانہ نگاروں کے مختصر کوائف، ان کے ایک چنندہ افسانے کا تجزیہ اور افسانے کے ایک سین کو مکالمی روپ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشمول افسانہ نگاروں میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے آزادی سے پہلے قلم اٹھایا تھا اور وہ بھی ہیں جو ابھی بھی طفلِ مکتب ہیں، وہ ادیب بھی ہیں جو شہابِ ثاقب کی طرح ادبی افق پر نمودار ہو کر ٹوٹ گئے اور وہ بھی ہیں جو عمر بھر ادب کی آبیاری کرتے رہے، کشمیر سے ہجرت کرنے والے وہ قلم

کار بھی ہیں جنہوں نے تقسیم وطن کے دوران سرحد پار اپنی بستیاں بسائیں اور وہ مہاجر بھی ہیں جنہوں نے ۱۹۹۰ء میں ملک کے مختلف علاقوں میں پناہ لی۔

آخر میں مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھر بھی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ نور شاہ کے ادبی سفر کو چند صفحات میں سمیٹنا بہت مشکل کام ہے۔ تاہم میری یہ کوشش رہی ہے کہ کم سے کم ان صفحات میں نور شاہ کی حصولیابیوں کا اعتراف کرسکوں اور آئندہ نسلوں کو یہ بتا سکوں کہ بیسویں صدی میں ایسے بھی جیالے اردو ادب کی آبیاری میں مصروف رہے ہیں۔



●...... وحشی سعید

نور شاہ اور میں

نور شاہ کے ساتھ میری پہلی جان پہچان ادبی رسالوں کے ذریعے اس وقت ہوئی جب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماہنامہ ''بیسویں صدی'' اردو زبان وادب پر ایسے چھائے ہوا تھا کہ اس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل تھی۔ اُسی زمانے میں بیسویں صدی میں نور شاہ کا طوطی بولتا تھا۔ ہم جیسے اردو کے نئے لکھنے والوں کے لئے نور شاہ کی مقبولیت باعثِ رشک تھی اور نئے لکھنے والوں کے لئے وہ کسی ہیرو سے کم نہ تھے۔ حالانکہ اُس زمانے میں بہت سارے ادباء، شعراء اور افسانہ نگار اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک کے ساتھ منسلک ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے لیکن میری سمجھ یہ کہتی ہے کہ ادب کو حصوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔

ایس پی کالج میں دورانِ تعلیم ہی رسالہ ''نگینہ'' کو سرکاری رجسٹریشن ملا۔ اُن دنوں نور شاہ کے برادر اصغر بشیر شاہ میرے بہت قریب آ گئے تھے اور رسالہ ''نگینہ'' میں اُن (بشیر شاہ) کے مضامین چھپنے لگے۔ بشیر شاہ ہر بار مجھے یہ کہتے کہ اُن کے مضمون کو پوری اہمیت کے ساتھ چھاپا جائے۔ وہ اگلی بار نور شاہ کی ایک نئی غیر مطبوعہ کہانی 'نگینہ' کے لئے لائیں گے اور یہ ان کا ہر بار کا وعدہ ہوتا۔ اس بات کا ''نگینہ'' کے ایک پرانے شمارے میں ذکر بھی ہے۔ اُس دور میں بھی نور شاہ نگینہ میں چھپتے رہے۔

ایک وقت ایسا بھی گزرا جب ترقی پسند ادب بہت زیادہ بور کرنے لگا۔ اُس لمحے اردو ادب میں رومان پرور افسانے ایک نئے آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آنے لگے۔ اردو ادب کے لئے یہ تبدیلی نہ صرف خوشگوار تھی بلکہ افسانے اور بالخصوص رومان پسند افسانوں کے لئے ایک

نعمتِ غیر مترقبہ بن گئی۔ یہ افسانے بہت پسند کئے گئے۔ ایسے پسِ منظر میں نور شاہ ایک بڑا نام بن کر اُبھرے۔ یہ وہ دور تھا جب ابن صفی کے جاسوسی ناول عروج پر تھے حالانکہ ہمارے بہت سارے ادباء کو یہ شکایت رہی کہ جاسوسی ناولیں ادب کا حصہ نہیں ہیں لیکن میرے نزدیک کوئی بھی کہانی ہو، کسی بھی قسم کی کہانی ہو، اگر کہانی کار اپنے فن میں کمال رکھتا ہو، اپنے انداز بیان اور پیش کش پر ید طولیٰ رکھتا ہو تو جاسوسی ناول بھی ادب کا حصہ بن سکتا ہے۔ نور شاہ رومانیت سے لبریز اپنے افسانوں میں نہ صرف باکمال کہانی کار بن کر اُبھرتے ہیں بلکہ وہ ان میں رومانیت کی ایسی جادوگری ہیں کہ ہم اُس سحر سے باہر نہیں آپاتے اور جلد ہی اردو ادب کی افسانوی دنیا میں ان کی شخصیت ایک اُستاد بن کر اُبھر گئی۔ اُن کے فن کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو اپنی کہانی کی گرفت میں باندھے رکھتے ہیں۔

میں اپنے وطن کشمیر سے بہت عرصے تک دور رہا۔ زر معاش کے لئے بدیشوں کی خاک چھانتا رہا۔ جب وطن واپس آیا تو ایک روز اپنے ہوٹل کی ایک تقریب میں نور شاہ کو اپنے سامنے پایا۔ انہوں نے اپنی کتاب ''کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' مجھے پیش کی۔ اس کتاب میں نور شاہ نے جس محبت سے کشمیر کے مایہ ناز افسانہ نگاروں کے ساتھ میرا بھی تذکرہ کیا ہے وہ میرے دل کو چھو گیا اور میرے لئے ایک نئی ادبی اُمنگ کا مژدہ ثابت ہوا۔ یہاں سے ہماری دوستی کی شروعات ہوئی۔ رسالہ ''نگینہ'' نئے سرے سے ادبی دنیا میں نمودار ہوا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس میں نور شاہ کا بھی ایک اہم رول ہے۔ نور شاہ کی افسانہ نگاری کا میں ہمیشہ ایک مداح اور پرستار رہا ہوں لیکن میرے لئے اُن کی دوستی زیادہ اہم اور انمول ہے۔



● ...... وحشی سعید

نور شاہ اور میں

نور شاہ کے ساتھ میری پہلی جان پہچان ادبی رسالوں کے ذریعے اس وقت ہوئی جب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ماہنامہ ''بیسویں صدی'' اردو زبان وادب پر ایسے چھائے ہوا تھا کہ اس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل تھی۔ اُسی زمانے میں بیسویں صدی میں نور شاہ کا طوطی بولتا تھا۔ ہم جیسے اردو کے نئے لکھنے والوں کے لئے نور شاہ کی مقبولیت باعثِ رشک تھی اور نئے لکھنے والوں کے لئے وہ کسی ہیرو سے کم نہ تھے۔ حالانکہ اُس زمانے میں بہت سارے ادباء، شعراء اور افسانہ نگار اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک کے ساتھ منسلک ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے لیکن میری سمجھ یہ کہتی ہے کہ ادب کو حصوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔

ایس پی کالج میں دورانِ تعلیم ہی رسالہ ''نگینہ'' کو سرکاری رجسٹریشن ملا۔ اُن دنوں نور شاہ کے برادر اصغر بشیر شاہ میرے بہت قریب آگئے تھے اور رسالہ ''نگینہ'' میں اُن (بشیر شاہ) کے مضامین چھپنے لگے۔ بشیر شاہ ہر بار مجھے یہ کہتے کہ اُن کے مضمون کو پوری اہمیت کے ساتھ چھاپا جائے۔ وہ اگلی بار نور شاہ کی ایک نئی غیر مطبوعہ کہانی 'نگینہ' کے لئے لائیں گے اور یہ ان کا ہر بار کا وعدہ ہوتا۔ اس بات کا ''نگینہ'' کے ایک پرانے شمارے میں ذکر بھی ہے۔ اُس دور میں بھی نور شاہ نگینہ میں چھپتے رہے۔

ایک وقت ایسا بھی گزرا جب ترقی پسند ادب بہت زیادہ بور کرنے لگا۔ اُس لمحے اردو ادب میں رومان پرور افسانے ایک نئے آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آنے لگے۔ اردو ادب کے لئے یہ تبدیلی نہ صرف خوشگوار تھی بلکہ افسانے اور بالخصوص رومان پسند افسانوں کے لئے ایک

نعمتِ غیر مترقبہ بن گئی۔ یہ افسانے بہت پسند کئے گئے۔ ایسے پسِ منظر میں نور شاہ ایک بڑا نام بن کر اُبھرے۔ یہ وہ دور تھا جب ابن صفی کے جاسوسی ناول عروج پر تھے حالانکہ ہمارے بہت سارے ادباء کو یہ شکایت رہی کہ جاسوسی ناولیں ادب کا حصہ نہیں ہیں لیکن میرے نزدیک کوئی بھی کہانی ہو، کسی بھی قسم کی کہانی ہو، اگر کہانی کار اپنے فن میں کمال رکھتا ہو، اپنے انداز بیان اور پیش کش پر ید طولیٰ رکھتا ہو تو جاسوسی ناول بھی ادب کا حصہ بن سکتا ہے۔ نور شاہ رومانیت سے لبریز اپنے افسانوں میں نہ صرف با کمال کہانی کار بن کر اُبھرتے ہیں بلکہ وہ ان میں رومانیت کی ایسی جادوگری ہیں کہ ہم اُس سحر سے باہر نہیں آپاتے اور جلد ہی اردو ادب کی افسانوی دنیا میں ان کی شخصیت ایک اُستاد بن کر اُبھر گئی۔ اُن کے فن کا یہ کمال ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو اپنی کہانی کی گرفت میں باندھے رکھتے ہیں۔

میں اپنے وطن کشمیر سے بہت عرصے تک دور رہا۔ زر معاش کے لئے بدیشوں کی خاک چھانتا رہا۔ جب وطن واپس آیا تو ایک روز اپنے ہوٹل کی ایک تقریب میں نور شاہ کو اپنے سامنے پایا۔ انہوں نے اپنی کتاب ''کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' مجھے پیش کی۔ اس کتاب میں نور شاہ نے جس محبت سے کشمیر کے مایہ ناز افسانہ نگاروں کے ساتھ میرا بھی تذکرہ کیا ہے وہ میرے دل کو چھو گیا اور میرے لئے ایک نئی ادبی اُمنگ کا مژدہ ثابت ہوا۔ یہاں سے ہماری دوستی کی شروعات ہوئی۔ رسالہ ''نگینہ'' نئے سرے سے ادبی دنیا میں نمودار ہوا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس میں نور شاہ کا بھی ایک اہم رول ہے۔ نور شاہ کی افسانہ نگاری کا میں ہمیشہ ایک مداح اور پرستار رہا ہوں لیکن میرے لئے اُن کی دوستی زیادہ اہم اور انمول ہے۔



●......عبدالغنی شیخ

نورشاہ۔ ایک منفرد افسانہ نگار

نورشاہ سے میرا تعارف بیسویں صدی کی معرفت ہوا۔ یہ غائبانہ تعارف تھا۔ جریدہ میں نورشاہ کی کہانیاں چھپتی تھیں۔ موضوع کی کشش، زبان کی حلاوت، بیان کی لطافت اور رومان کی ہلکی ہلکی آنچ کی چاشنی دعوت مطالعہ دیتی تھی اور قاری سے کہانی ختم کئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

میں بھی بیسویں صدی میں اپنے افسانے چھپانے کے لئے کوشاں تھا۔ یکے بعد دیگرے میرے دو افسانے مسترد ہوئے۔ تب خوشتر گرامی رسالہ کے مدیر تھے۔ موصوف اردو کے بڑے عاشق اور محسن تھے۔ بیسویں صدی کی نوک پلک سنوارنے میں کوئی کسر نہیں رکھتے تھے۔ پھر ضیاء الدین نیّر نے ادارت سنبھالی۔ انہوں نے بیسویں صدی کے معیار برقرار رکھنے میں اپنی کاوش جاری رکھی۔

ایک روز نورشاہ نے مجھے فون پر بتایا کہ بیسویں صدی میں میری کہانی 'پہلا خط' چھپی ہے۔ بیسویں صدی کہانی کار کو کہانی چھپنے پر اعزازی کاپی نہیں بھیجتی تھی۔ میں نے نورشاہ سے استدعا کی کہ وہ کہانی کی فوٹو کاپی مجھے بھیجنے کی زحمت کریں۔ انہوں نے فوری طور رسالے سے کہانی کے اوراق نکال کر مجھے بھیجے۔ نورشاہ نے جریدہ 'وقار ادب' میں میرا افسانہ 'جھنڈا والا' کی اشاعت کی خبر بھی مجھے دی اور بعد میں رسالہ ہذا مجھے ارسال کیا۔

گزشتہ کئی سال سے سردیوں کے چند ماہ میں سرینگر میں گزارتا ہوں اور گاہے گاہے نورشاہ سے ملاقات ہوتی ہے۔اس طرح مجھے نورشاہ کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔عمر مجید مرحوم کی برسی پر ہم شہنشاہ ہوٹل پر ملتے تھے۔کبھی کورٹ روڈ پر واقع مشتاق احمد کینی کے آفس میں منعقدہ ادبی میٹنگ میں شرکت کرنے کا موقعہ ملا اور ان سے ملاقات رہی۔تب مجھے محسوس ہوا کہ جس طرح نورشاہ کے قلم سے تخلیق کا سوتا پھوٹتا ہے۔وہ اپنے قلم اور عمل سے اردو زبان و ادب کی خدمت بھی کرتے ہیں۔میں نے سنا اس سال وہ ریاست میں شائع ہونے والا ضخیم اردو جریدہ 'نگینہ' کی ترتیب اور تدوین میں لگے ہیں۔ایسے میں سوچتا ہوں کی جس لگن اور انہماک کے ساتھ وہ اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔اسی طرح افسانے لکھنے میں بھی ریاضت کرتے ہوں گے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو اکادمی کا قیام ایک دیرینہ مانگ ہے۔ریاست کے ادیبوں، ادب نوازوں اور محبان اردو نے اس ضمن میں بارہا سرکار کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے لیکن سرکار کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی ہے۔چند سال پہلے سرکار نے اُردو اکادمی کے قیام کے سلسلے میں مشاورت کے لئے جموں میں ایک میٹنگ بلائی۔لداخ سے مجھے مدعو کیا۔میں نے محسوس کیا کہ اب کی دفعہ حکومت اس معاملے میں سنجیدہ ہے۔ہم نے اس سلسلے میں ارباب اقتدار کو ایک جامع رپورٹ پیش کی۔اسی اثناء میں میں نے نورشاہ سے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اب سرکاری سطح پر بھی اردو اکادمی قائم ہو رہی ہے۔نورشاہ نے شبہ کا اظہار کیا۔نورشاہ مجھ سے زیادہ جہاں دیدہ اور تجربہ کار نکلے۔اردو اکادمی اور سرکار۔وہی ٹائیں ٹائیں فش ثابت ہوئی۔نورشاہ اور اس کے ساتھیوں نے مشکلات اور مالی وسائل کی عدم موجودگی کے باوجود اردو اکادمی قائم کی ہے۔

نورشاہ کا غیر ریاستی اردو مدیروں اور ادیبوں سے رابطہ ہے۔انہوں نے اردو رسائل کے دو مدیروں سے مجھے متعارف کرایا اور کہانیاں بھجوائیں۔میں نے یہ دیکھا کہ وہ نئے لکھنے

والوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

نور شاہ نے فکشن، ڈرامے، خاکے، تبصرے اور تذکرے لکھے ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تعداد لگ بھگ ڈیڑھ درجن ہے۔ وہ پچھلی آدھی صدی سے لکھ رہے ہیں۔ ایسے میں مجھے ان کی ایک کہانی 'کیسا ہے یہ جنون' یاد آتی ہے۔ کہانی کا یہ عنوان ان کے ایک افسانوی مجموعے کا نام بھی ہے۔ میں یہاں اس کہانی پر تبصرہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس عنوان کی نسبت سے نور شاہ کے ذوق تحریر کی بات کر رہا ہوں۔ وہ لکھے جارہے ہیں۔ نہ ستائش کی پروا اور نہ صلہ کی تمنا۔ شاید تا دمِ حیات ان کے ہاتھ سے قلم نہیں چھوٹے گا۔ ایسے میں 'کیسا ہے یہ جنون' ان کے لکھنے کی تپش پر پورا اترتا ہے۔

نوبل انعام یافتہ امریکی ادیب گراہم گرین لکھتا ہے:

"لکھنا ایک قسم کا علاج معالجہ ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جو نہیں لکھتے۔ مصوری یا دھنیں نہیں بناتے، وہ کیسے دیوانگی، مالیخولیا اور خوف سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جو انسانی فطرت میں داخل ہیں۔"

سعادت حسن منٹو سے جب پوچھا گیا کہ وہ کیوں لکھتے ہیں تو منٹو کا یہ جواب تھا۔

"میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں؟ میں کیوں پیتا ہوں؟"

نقاد ممتاز حسین نے لکھا ہے۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں لکھنے پر اندر سے مجبور ہوں۔"

ایسے میں ذہنی کیفیت سے اکثر ادیب دوچار ہوتے ہیں۔

ایک قلم کار اپنے ماحول اور معاصرانہ حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ نور شاہ کے فکر و ذہن پر قدرتی حسن، بشری وجاہت خاص کر نسائی حسن و جمال کے گہرے نقوش ہیں۔ کشمیر کے خیمہ میں ان دونوں کا خوبصورت امتزاج ہے اور نور شاہ اسی ماحول کے پروردہ ہیں۔ حسن شناسی اور حسن پرستی ان کی سرشت میں رچ بس گئی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں۔ "میرا ماننا ہے کہ زندگی کے

دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں اور زندگی حسن و عشق سے عبارت ہے۔" چنانچہ رومانیت ان کی نگارشات کا طرّہ امتیاز ہے۔

ان کے افسانوں کے کردار بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ خاص کر نسوانی کردار مجسمہ حسن ہیں۔ منظر دلکش ہے۔ شگفتہ پھول، چنار کے تناور اور چھتنار پیڑ، نیلی جھیل، نیلا آکاش، باد صبا، لہلہاتے مرغزار، چہچہاتے طیور، فضا پر کشش ہے۔ ارکسٹرا کی دھنیں، وائلن کا نغمہ، جگمگاتی روشنی۔ پھر تحریر میں پہاڑی ندی کی طرح روانی ہوتی ہے۔ خوبصورت الفاظ قوس قزح کے رنگ سجاتے ہیں۔ اس طرح افسانہ نگار نثر میں شاعری کرتے ہیں۔

۱۹۸۹ء میں کشمیر کے حالات نے نئی کروٹ لی۔ خون خرابہ، ظلم و جبر، عصمت دری اور بے چینی وادی کے باسیوں کا مقدر بنا اور نور شاہ عصمت دریدہ عورتوں، نفسیاتی مریضوں، مظلوموں اور اذیت رسیدہ نوجوانوں کا نوحہ سنائی دیتا ہے اور لاپتہ انسانوں، مسخ شدہ لاشوں اور بے نام قبروں کا کرب جھلکتا ہے۔

فکشن نور شاہ کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ نور شاہ کو خود علم نہیں کہ انہوں نے کتنے افسانے لکھے ہیں۔ نور شاہ کہانی لکھنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں رنگارنگی اور گونا گونی ہے۔ تخلیق کی خوبی اس کی وحدت تاثر (Unity of Impression) میں ہے۔ نور شاہ کے اکثر افسانے اپنا تاثر چھوڑتے ہیں۔ ان کے فکشن کے خزینے میں ہم کو ایسے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں جو اختتام پر غیر متوقع طور چونکا دیتے ہیں۔ کبھی قاری افسانہ پڑھ کر سکون محسوس کرتا ہے اور کبھی کہانی انجام پر اداس ہو جاتا ہے۔ نور شاہ چند سطور کے افسانچے میں زندگی کا ایک رخ، انسانی نفسیات کا ایک پہلو یا قدرت کا ابدی قانون یا زمانے کے دستور کی ایک جھلک دکھانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

نور شاہ جدیدیت سے متاثر نہیں۔ اس لئے ان کی کہانیوں میں ابہام نہیں پایا جاتا ہے۔ وہ علامتی اور استعاراتی افسانے نہیں لکھتے ہیں۔ البتہ چند کہانیوں کا تھیم قاری کو سوچنے پر

مجبور کرتا ہے کہ افسانہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے۔

نور شاہ اور میں ہم عمر ہیں ۔عمر کے اس موڑ کو چراغ سحری سے محمول کیا جاتا ہے ۔ انگریزی میں In the autumn of life 'زندگی بمطابق خزاں' سے تعبیر کی گئی ہے۔

نور شاہ لوح وقلم کی پرورش میں مگن ہیں۔عمر جب خزاں سے ہمکنار ہوتی ہے تو تخلیق باغ و بہار سے ہم آشنا ہوتی ہے۔ایک کہنہ مشق ادیب پت جڑھ میں اپنے قلم سے پھول اُگاتے ہیں۔

...........☆☆...........

● ...... پروفیسر عارفہ بشریٰ

نور شاہ بحیثیت ناول نگار

ریاست جموں و کشمیر کے فکشن نگاروں میں سب سے اہم اور معتبر نام نور شاہ کا ہے۔ نور شاہ بحیثیت افسانہ نگار ہند و پاک میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے اب تک آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے اکثر و بیشتر ناقدین نے ان کے فن کی انفرادیت کو سراہا۔ ریاست کی ناول نگاری کی تاریخ میں بھی ان کا ایک اہم نام ہے۔

نور شاہ نے دو ناول لکھے ہیں۔ ۱۔ نیلی جھیل کالے سائے ۲۔ پائل کی زنجیر اس کے علاوہ ان کے تین ناولٹوں کا مجموعہ ۲۰۰۹ء میں میزان پبلشرز سرینگر نے ''نور شاہ کے تین ناولٹ'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اگر ان ناولٹوں کو بھی (مختصر ہی سہی) ناول ہی مان لیں تو پھر نور شاہ کے ناولوں کی تعداد پانچ ہو جاتی ہے۔ نور شاہ کے ابتدائی دو ناولوں کے نسخے اب کہیں دستیاب نہیں۔ اس لئے ان کے ناولٹوں پر ہی گفتگو کریں تو معلوم ہوگا کہ نور شاہ کے یہ تینوں ناولٹ بھی ان کے مخصوص مزاج اور دوق جمال کی ہی آئینہ داری کرتے ہیں۔ نور شاہ کا ناولٹ '' آؤ سو جائیں'' ماہنامہ شاعر کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا تھا۔ ''شاعر'' کے مدیر اعجاز صدیقی نے نور شاہ کی فنی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا تھا:

''نور شارہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں، انداز بیان میں جو شگفتگی رچاؤ اور موسیقی ہے وہ کچھ تو حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت و جلال کی

دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہین منت ،نور شاہ بطور کہانی کار مقبول ومعروف ہیں۔نور شاہ کی تحریروں میں شعور وفکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔زبان واسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے۔''آؤ سو جائیں'' جہاں ایک لمحے کی کہانی ہے۔وہیں ایک دیگر کی کہانی بھی ہے۔اس ناولٹ میں نور شاہ نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں رہنے والے کرداروں کی نقاب کشائی اپنے منفرد ڈھنگ سے کی ہے۔''

اعجاز صدیقی کی مذکورہ بالا رائے کا ان کے اطلاق سبھی ناولوں پر ہوتا ہے۔ویسے عام لوگوں کے علاوہ خود نور شاہ بھی مانتے ہیں کہ''زندگی کے رومان چشموں سے ہی پھوٹتے ہیں۔ لیکن یہ رومان عام معنی کا رومان نہیں ہے بلکہ رومان کا یہ تصور اس پوری کائنات کے بارے میں مثبت (Positive) سوچ سے عبارت ہے۔نور شاہ لازوالِ حسنِ فطرت کے حوالے سے انسانوں کے ذہن وضمیر میں پوشیدہ حسن وخیر کی قدروں کو نمایاں کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں وادیٔ کشمیر کے حسن کو برف پوش پہاڑوں، سرسبز وادیوں، باغوں اور دریاؤں کے حوالے سے تو سمیٹا ہے لیکن کشمیر کی ثقافت اور اہل کشمیر کی سادہ لوحی اور حلیمی کو اپنے کرداروں کے ذریعے جیتے جاگتے روپ میں پیش بھی کیا ہے۔سلونی، صنوبر، راشد، برج، نیلی، اقبال، اختر، سلمٰی، احسن وغیرہ نور شاہ کے ناولٹوں کے کردار ہیں۔نور شاہ نے یہ کردار محنت سے تراشے ہیں۔نور شاہ کے کردار سادہ بھی ہیں، احسن کی طرح اور پیچیدہ بھی ہیں اختر کی طرح۔نور شاہ نے اپنے کرداروں کی نفسیات کا تجزیہ جگہ جگہ بڑی مہارت او رسچائی کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن نور شاہ کے بعض کرداروں کی سچائیاں عام قارئین کو ناگوار بھی لگ سکتی ہیں۔مثلاً ان کے ناولٹ ''آؤ سو جائیں'' کے کردار راشد کا ناول کی ہیروئین نیلی سے یہ کہنا کہ:

''میں حقیقی زندگی کا قائل ہوں۔اسی لئے ذہنی رشتوں پر جسمانی رشتوں کو ترجیح دیتا ہوں''

لیکن جب نورشاہ کے ان جملوں کو دیکھتے ہیں جس میں وہ لکھتے ہیں۔

''یہ ایک اجنبی دور کی کہانی ہے اس دور کے سارے کردار اجنبی سے ہیں۔ یہاں تک کہ مجھے بھی اپنا کردار اجنبی سا لگ رہا ہے۔ لیکن اس اجنبی پن میں بھی خیالات اور اپنی تحریر میں صاف گو بن کر اپنے اور ان سب کے جذبات کی عکاسی کرنا چاہتا ہیں''۔

اس لئے بعض کرداروں کی سوچ اور فکر میں جو اخلاقی گراوٹ اور کج روی ہے نورشاہ نے محض ان کی ترجمانی اور عکاسی کی ہے۔ نورشاہ جدید ترین موضوعات اور کرداروں کو پیش کرتے ہوئے بھی اپنی زمین اپنے کشمیر کو نہیں بھولتے۔

''یہ کوئی بہادری نہیں کہ تم نے اپنے مکان کی سیڑھیوں پر سونا بچھا رکھا ہے اور گھر میں صندل کے دروازے اور کھڑکیاں لگا رکھی ہیں یا اس کی اونچی بنیادیں سونے کی اینٹوں سے تعمیر کی ہیں۔ بہادری تو یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی تلوار سے کھیلنا سیکھو۔''

یہ آزادی کی باتیں۔ شاعر کشمیر آزاد کی آواز ہے۔

عوام، ظلم، غربت، ناانصافی، پس ماندگی اور جہالت کا شکار بنے ہوئے ہیں اور خود غرض لیڈر شان و شوکت سے رہتے ہیں۔''

یہ کشمیر ہے۔ بڈشاہ کا کشمیر، لل دید اور نورالدین ولی کا کشمیر

یہ میرا کشمیر ہے...... میرا گھر

رات اتنی تاریک کیوں ہے؟ یہ اندھیرا کیسا ہے؟''

نورشارہ نے اپنے افسانوں کی طرف اپنے ناولوں میں بھی بیانیہ (Narration) کے

۱: ناولٹ ''آؤ سو جائیں'' از نور شاہ صف ۶۳

۲: نورشاہ کے تین ناولٹ ص ۸۳۔۸۴

مختلف تجربے کئے ہیں۔ کرداروں کی خارجی اور باطنی دنیاؤں کو کبھی بلاواسطہ تو کبھی بالواسطہ طور پر بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ نورشاہ کا اسلوب اکثر ایک دلکش استعاراتی فضا کی تشکیل بھی

کرتا ہے جوان کے مخصوص رومانی مزاج سے ہم آہنگی ہے۔اگر دیکھا جائے تو نور شاہ اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، بیدی اور قرۃ العین حیدر کے بعد کی نسل کے فکشن نگاروں، غیاث احمد گدی، رام لعل، جوگندر پال اور اقبال مجید کے پائے کے افسانہ نگار اور ناول نگار ثابت ہوتے ہیں۔

(بشکریہ بازیافت، شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی)

..........●●● ....

•...... ڈاکٹر اشرف آثاری

نورشاہ کی تخلیقی انفرادیت

نورشاہ عہد حاضر کے صاحبِ اسلوب اور ممتاز قلم کار ہیں۔ان کا قوت مشاہدہ قابل داد ہے۔بحیثیت افسانہ نویس نورشاہ کی شناخت مضبوط ہے۔گزشتہ پچاس برسوں پر نورشاہ کا ادبی سفر محیط ہے۔ان کے اکثر افسانے فنی بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہوئے ہیں جو کچھ مشاہدے میں آتا ہے ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔نورشاہ نے افسانہ نویسی کے لئے خصوصی طور ایک منفرد طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے جس پر اب بھی مستعدی کے ساتھ مست خرامی سے گامزن ہیں۔

مصلحت پسندی یا نظراندازی سے وہ سمجھوتہ نہ کر پائے اور نہ ہی ہوا کے رخ پر پھسلنے کے عادی ہیں۔اپنے افسانوں میں نورشاہ فقط انسانی فطرت اور جذبات کی عکاسی کرتے آئے ہیں۔ان کی اکثر کہانیوں کو کھنگالنے پر یہ اصلیت سامنے منڈلانے لگتی ہے کہ جو کردار وضع کئے ہیں وہ سب کے سب اتنے حقیقی اور جاندار لگتے ہیں کہ قارئین کو اپنے ساتھ باندھے رکھتے ہیں۔

تہذیبی، معاشرتی اور جنسی اقدار اس بدلے بدلے سے زمانے میں جس سرعت کے ساتھ پامال ہو رہے ہیں۔ان کے اثرات نورشاہ کی تحریروں میں نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

نورشاہ کے بیشتر افسانے ان کے بھرپور تجربے، صحت مند فکر، وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی غمازی کرتے ہیں۔کسی منظر کی عکاسی کرتے وقت اس کا چھوٹے سے چھوٹا پہلو بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے وہ

بڑے بڑے نکتے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ الفاظ کی ترتیب میں خاص اہتمام کرتے ہیں۔ لفظوں کی آبیاری نور شاہ خون جگر سے کرتے ہیں۔ منظر کشی میں بھی ان کا قلم ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ ہر افسانہ ایک مکمل زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ہر مکتب خیال کے قاری کے لئے ان کی کہانیوں میں کچھ نہ کچھ مثبت پہلو موجود ہیں۔

خود اعتمادی کا دامن تھامے نور شاہ سطحیت، جذباتیت یا نعرہ بازی سے کبھی متاثر نہ ہوئے۔ مواد اور ہیئت میں رشتہ ہر حال میں قائم رکھنے اور فن و موضوع کے درمیان توازن برقرار رکھنے میں ان کو واقعی ید طولیٰ حاصل ہے۔ ''بے گھاٹ کی ناؤ'' سے لیکر ''کیسا ہے یہ جنون'' تک نور شاہ نے قادر الکلامی کی نہج پر گامزن ایک مخصوص رویہ اپنایا ہے۔ اس اپنائے گئے رویئے یا رنگ میں طبع آزمائی کر کے دنیائے ادب کو بیش بہا پھول انمول موتی اور جگمگاتے لعل عطا کئے ہیں اور اب بھی اس عمر میں آب و تاب کے ساتھ مشق سخن جاری ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی پہلی ہی تخلیق کے باعث نور شاہ اردو ادب میں معتبر مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

بقول منٹو مرحوم ''کسی مہم میں اگر پہلا ہی قدم کامیاب ہو جاتا ہے تو حوصلہ میں پختگی اور جذبات میں تقویت حاصل ہوتی ہے''۔

ویسے سعادت حسن منٹو مرحوم نے بھی اکثر انسانی جذبوں کی خصوصی حیثیت کو ہی اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنایا تھا۔ نور شاہ بھی اسی دائرہ نظر کے تحت منفی انسانی رویئوں کو بڑے مثبت انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ دراصل افسانے انسانی قدروں ولوازمات پر مبنی ہوتے ہیں جن کا برملا اور بغیر لگی لپٹی اظہار مہذب سماج میں صحیح طریقہ کار مانا جاتا ہے۔ ویسے بھی ادیب اور فحاشی کا مسئلہ ہر دور میں زیر بحث رہا ہے اور کبھی کبھی نا خوشگوار واقعات کا باعث بھی بنا ہے۔ جب بھی کسی قلم کار نے زندگی کی حقیقتوں پر سے بدگمانی کی گرد جھاڑنے کی کوشش کی تو کچھ بیمار ذہن رکھنے والوں نے اس ادب پر فحاشی کا الزام لگایا۔ حالانکہ اصلیت یہ ٹھہری کہ ادب فقط زندگی کی تصویر پیش

کرتا ہے اور اگر زندگی ہی ننگی ہو تو تصویر کو چادر پہنانے یا اوڑھنے سے کیا حاصل۔

نور شاہ حساس ذہن کے مالک ہیں، اندھا وشواس، غیر مہذبانہ انداز فکر اور بے راہ روی سے لبریز ہتھکنڈوں سے پورے انہماک کے ساتھ بغاوت کرتے آئے ہیں۔ انتہائی اہم موضوعات پر زندگی میں پیش آنے والے واقعات و مسائل پر مدلل بحث کرتا ہوا قاری کے دل و ماغ پر اپنے ان مٹ نقوش اس سبک روی سے چھوڑتا ہے کہ قاری بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ؏

میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

الغرض افسانہ نویسی نور شاہ کی خمیر میں شامل ہے۔ ویسے ہر قلم کار کو ادب پارہ تیار کرنے میں سکون اور فرصت درکار رہتی ہے۔ نور شاہ اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ کافی مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ اب صحت بھی قدرے بگڑنے لگی ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ کاغذ داغدار کرنے کے لئے وقت کہاں سے نکالتے ہیں۔ اللہ ہی جانے۔

لہٰذا مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل ہے نہ جھجک کہ نور شاہ واقعی فطری ادیب ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں اصلاحی انداز نمایاں طور پر غالب رہا ہے۔ کئی افسانوں میں ملت و قوم کی نوجوان نسل کے لئے پیغام بیداری اور کبھی راز و نیاز کے زندہ جاوید واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔

نور شاہ کا افسانہ تحریر کرنے کا ایک منفرد انداز ہے پھر بھی ان کی کچھ کہانیوں کی گہرائیوں میں بغور جھانکنے سے ایک ادب شناس محقق کو انتظار حسین کی سنجیدگی، احمد ندیم قاسمی کی راست کرداری، کرشن چندر کی برد باری، سعادت حسن منٹو کی بے باکی اور عصمت چغتائی کی آزاد خیالی کی جھلکیاں واضح طور محسوس ہوتی ہیں۔



● ...... شارق عدیل

ایک نبض شناس کہانی کار۔نور شاہ

نثری ادب، کی کوئی گلی ایسی نہیں ہے جس میں نور شاہ کے قلم کی خوشبوئیں گشت نہ کرتی ہوں، اس لئے نور شاہ کو پوری طرح برآمد کرنے کی جستجو میں اپنے بھٹک جانے کے امکانات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، اس لئے میں کچھ لکھنے سے قبل یہ اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے آج تک نور شاہ کی ایک بھی افسانوی کتاب باقاعدہ نہیں پڑھی ہے لیکن میں جب جب تنقید سے شاعری سے اپنے آپ سے اوب جاتا ہوں تو نور شاہ، کی کہانیوں کا مطالعہ مجھے ایک بار پھر تازہ دم کردیتا ہے اور میں پوری یکسوئی سے ادبی کاموں میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

چونکہ نور شاہ کی کہانیوں کے تلخ و ترش مناظر میں بھی زندگی کی رومانیت پوشیدہ رہتی ہے اور ان کی کہانیوں کی ایک مخصوص خاصیت تو یہ ہے کہ ان کا ہر کردار اپنی ذات سے باخبر ہوتا ہے اور کہانی کو ہر اعتبار سے زندگی کے قریب رکھتا ہے۔ میں اپنے خیال کی صداقت کو پوری طرح نمایاں کرنے کی غرض سے نور شاہ کی ایک مختصر سی کہانی ''آخری سیڑھی'' کا سہارا لے رہا ہوں، چونکہ یہ کہانی کشمیر کے گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے اس سیلاب کی کہانی ہے جس نے زندگی کو ہر سطح پر متاثر کیا تھا اور زندگی کے نشیب وفراز سے ہر انسان کو بغیر کسی امتیاز کے وابستہ کردیا تھا، بے شمار پانی کے حصار میں پھنسے ہوئے ایک ایسے انسان کے احساسات کو محسوس کیجئے جو اپنے بیٹوں کی فرقت میں موت کے خوف سے بیگانہ ہوتا جارہا ہے۔

لیکن بچے والدین کے ان دکھوں سے بے پرواہ ہی رہتے ہیں، کیوں کہ وہ بہتر مستقبل

کی امید میں اپنا وطن ، اپنا گھر چھوڑ کر دیارِ غیر میں بس جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر اپنے گھر کی طرف کبھی نہیں دیکھتے ، بوڑھے ماں باپ ان کی فرقت کے دکھوں کو جھیلتے جھیلتے اس قدر مایوس اور مغموم ہو جاتے ہیں کہ ملکِ عدم میں جا کر بس جاتے ہیں ، لیکن نور شاہ نے مذکورہ کہانی کو اس انداز سے تحریر کیا ہے کہ اس میں جذبات کی آنچ خود کلامی کے احساس میں ضم ہوگئی ہے۔ جب وہ اپنی بستی کے دوسرے لڑکوں کو دیکھتا تو اس کے دل میں ایک کسک سی اٹھتی اور اسے اپنے لاڈلوں کی بہت یاد آتی ، آج جب سیلاب میں سب کچھ بہتا جا رہا تھا ، تو اسے اپنے بیٹے بے تحاشا یاد آرہے تھے لیکن یہ بے تحاشا محبت ، یہ بے تحاشا یاد اسے سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ اگر اس کے بیٹے یہاں ہوتے تو نہ جانے انہیں کون سے سیلابی آفت کا سامنا کرنا پڑتا ، اچھا ہوا وہ یہاں نہیں ہیں ، وہ شاید اس طغیانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ اپنے آپ کو بچا نہ پاتے شاید مجھے بھی بچا نہ پاتے۔ لیکن میرا کیا ہے ۔ یہاں میرا کون ہے ۔ مر بھی گیا ، سیلاب کی نذر بھی ہوگا......؟ اس نے ایک لمبی آہ بھری ، ایک بار پھر دور اپنی نظریں دوڑائیں اور اسے لگا جیسے دور سے ایک ناؤ سیلاب کے بڑھتے پانیوں سے ٹکراتی ہوئی آہستہ آہستہ اس کی جانب آرہی ہے۔

اس ناؤ کو دو نوجوان کھینچنے میں مصروف تھے۔ اسے لگا جیسے اس کے بیٹے اس کی جانب بڑھ رہے ہیں ، کہانی کا یہ منظر ایک باپ کے جذبات کی عکاسی ایسے حقیقی انداز میں کرتا ہے کہ نور شاہ کی تصوراتی سوچیں بھی صداقت کی مانند محسوس ہوتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ رنج و مسرت کے لمحوں میں اپنے جگر کے ٹکڑے بہت شدت سے یاد آتے ہیں۔ اس کرب کو صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اپنے پیاروں کی فرقت میں کبھی نہ ختم ہونے والے انتظار کی اذیت میں مبتلا رہتے ہیں ، لیکن ان کے واپس آنے کی امید میں کس طرح سانسوں کی ڈور کو تھامے رہتے ہیں۔

مذکورہ کہانی کا آخری منظر تو انسان کو اس قدر جذباتی بنا دیتا ہے کہ اس کے آنسوؤں کا دریا ضبط کا باندھ توڑ کر آنکھوں سے باہر آجاتا ہے۔ ناؤ جب کھڑکی کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا ناؤ میں واقعی دو لڑکے تھے ایک خالق اس کا ملازم اور دوسرا......؟ خالق تم ٹھیک ہو وہ چلایا تم

نے یہ خطرہ کیوں مول لیا؟

آپ کے لئے...... میرا آپ کے بغیر کون ہے اور میرا، وہ سوچنے لگا، میرا بھی کون ہے خالق کے بغیر، زندگی کے یہ ایسے واقعے ہیں، جن میں انسانیت کی روشنی اتنی زیادہ ہے کہ ان کے مقابل خون کے رشتوں کی روشنی پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ خون کے رشتوں سے بھی افضل جانے کیوں لگتا ہے۔

شارقؔ۔ بانٹتا ہے جب درد ہمارا اک بنجادہ اک بنجادہ۔

نور شارہ، کی تخلیقی ذہانت جب کہانی میں سرایت کرتی ہے تو چھوٹے چھوٹے جملوں سے بھی بڑے بڑے اقتباسات کا کام لے لیتی ہے اور کہانی کو زندگی کے احساسات سے پوری طرح جوڑ دیتی ہے۔ نور شاہ موجودہ ادبی وادی کے ایک ایسے فنکار ہیں جو تخلیقیت سے آباد ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر حال و ماضی کے فن پاروں سے بیگانہ نہیں ہے۔ چونکہ ان کی کہانی کسی بھی موڑ پر بے ربطی یا تجریدی فضا سے آنکھیں چار نہیں کرتی ہے۔ نور شاہ، کی ایک اور کہانی ہے جس کا عنوان ہے۔ ایک کہانی تین باب'' اس کے تینوں ابواب کا زندگی سے اٹل تعلق ہے کیونکہ اس میں جو مرکزی کردار ہے وہ کہانی کے ہر باب میں اپنی رومانی سوچوں کی بناء پر نمایاں ہے۔ اگر نور شاہ چاہتے تو اس کہانی کو طوالت کے لمس سے ہمکنار کر سکتے تھے اور اس کی گنجائش بھی تھی مگر انہوں نے کہانی کو اختصار کے دائرے میں رکھ کر بھی اس مہارت کے ساتھ بنا ہے کہ قاری نور شاہ کی تخلیقی قوتوں کا قائل ہو جاتا ہے۔ کہانی کے اوّل باب میں، ایک معصوم قابل طالبِ علم کے مغرور آفیسر باپ کی فیصلہ سناتی ہوئی گفتگو اس کے اندر ابھرتے ہوئے دلکش جذبوں کو مجروح کر دیتی ہے۔

ویل ڈن مائی بوائے، میں بہت خوش ہوں تمہارا رزلٹ دیکھ کر، مجھے تمہارا رزلٹ دیکھ کر تمہارے مستقبل میں اپنا مستقبل نظر آ رہا ہے۔ تم بہت ترقی کرو گے۔ اور پھر بیٹے بھی کس کے ہو، نیشنل پیٹرولیم کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو آفیسر کے...... اور اب تمہاری زندگی کا دوسرا دور شروع

ہو رہا ہے۔ سبجیکٹ میری مرضی سے لینا، مجھے تمہاری آنکھوں میں ایک کامیاب انجینئر بننے کی پرچھائیاں نظر آرہی ہیں۔ بچے کو محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا باپ نہیں بلکہ چیف ایگزیکٹیو آفیسر بول رہا ہے۔

''ٹھیک اسی سمے اس کی نظروں میں اس کی ماں کا چہرہ گھوم گیا، کاش آج میری ماں زندہ ہوتی وہ مجھے سینے سے لگاتی اور محبت بھرے لہجے میں کہتی سہیل بیٹا خوش، آباد رہو، اللہ ہمیشہ کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرے۔'' کہانی کا یہ اقتباس بچوں کی زندگی میں محبتوں سے لبریز ماں کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ والدین بچوں پر اپنے فیصلے تھوپنے سے پہلے یہ ضرور جان لیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں، لیکن بعض باپ اپنی آفیسری یا دولت کے زعم میں اس ضروری بات کو نظر انداز کر کے اپنی ہی اولاد کو ایک ایسی کرب ناک رات کے حوالے کر دیتے ہیں جس کی صبح خوف ناک ہوا کرتی ہے۔

لیکن کہانی جب اس منزل سے آگے قدم رکھتی ہے تو تخلیقی نور کے ساتھ محبت کی شبنم میں بھیگی ہوئی ضرور محسوس ہوتی ہے مگر ماحول کی رنجیدہ فضا سے دامن نہیں چھڑاتی ہے اور ایک ایسی اداسی کو انسان کے ذہن میں انڈیل دیتی ہے کہ وہ لمحہ لمحہ اپنے آپ کو مایوسی کی دلدل میں دھنستا ہوا محسوس کرتا ہے۔ میرے خیال کو کہانی کے ان الفاظ میں ابھرتے ہوئے محسوس کیجیے۔

''اور جب ناظمہ نے میری لکھی ہوئی نظمیں سنی تھیں تو ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی تھی، کتنی معصومیت اور کم سنی کے انداز میں اس نے کہا تھا، سہیل مجھے لگتا ہے تم نے یہ نظمیں میرے لئے لکھی ہیں، میں تم سے بے حد متاثر ہوئی، نہیں مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں''۔ اور چند روز کے بعد نئی کلاسز میں داخلے کا عمل شروع ہوا، کون سے سبجیکٹ لے رہے ہو، ناظمہ، نے پوچھا، میں تو آرٹس میں دلچسپی رکھتا ہوں، لیکن میرے اندر کے جذبات میرے احساسات اور شوق کو میرے ڈیڈ نہیں سمجھتے، اور تم جانتی ہو، میری ماں نہیں ہے میں اپنی سوچوں کو کسی کے ساتھ SHARE بھی نہیں کر سکتا، کوئی میرے اندر کی آواز سننے کی کوشش بھی

نہیں کرتا، کہانی کا یہ باب اپنے مرکزی کردار کی مچلتی ہوئی آرزوؤں اور بے بسی کو بہت ہی عمدگی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ کہانی کے دوسرے باب میں سہیل انجینئرنگ کے پہلے سال کے امتحان میں نا کامیاب ہی جاتا ہے۔ تو اس کے ڈیڈی یہ سوچ کر حیران ہوئے اور پریشان بھی کہ اس قدر ذہین، ہونہار اور قابل لڑکا انجینئرنگ میں کیسے ناکام ہوسکتا ہے۔

لیکن سہیل اپنی ناکامی کی وجہ جانتا تھا، وہ تو پڑھ لکھ کر انجینئر نہیں استاد بننا چاہتا تھا۔ کسی اسکول میں کالج میں لڑکوں کو تعلیم کے نور سے آراستہ کرنا چاہتا تھا، قلم کار بننا چاہتا تھا، لیکن اس کے ڈیڈی کی بے جا انا اور ضد نے اس کی زندگی کو اس طرح برباد کیا کہ اسے زندگی سے بہتر موت نظر آنے لگی اور زندگی کے تیسرے باب نے کہانی کو فیصلہ کن الفاظ کی ان گونجوں کے ساتھ ختم کر دیا۔ ''اب مجھے کل کا انتظار ہے۔ آنے والے کل کا، اور میں ڈیڈی سے کہہ دونگا کہ مجھے نہ تو انجینئرنگ سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی انفارمیشن ٹیکنالوجی سے، میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گا لیکن اپنی مرضی سے اپنی پسند سے۔''

اور پھر صبح آ گئی سہیل اپنی نیند سے نہیں جاگا، اب ذرا سہیل کے ڈیڈ کی انا پرست شخصیت کو ڈاکٹر سے گفتگو کے منظر میں دیکھئے۔ کیا یہ ہارٹ اٹیک ہے ڈاکٹر، خودکشی بھی ہوسکتی ہے۔ خودکشی...... لیکن کیوں...... کس لئے ڈاکٹر، کبھی کبھی والدین کے غلط فیصلے بھی بچوں کی معصوم زندگی چھین لیتے ہیں، مسٹر چیف ایگزیکیٹو آفیسر صاحب، کہانی کی آخری سطر میں جو طنز کا عنصر ہے وہ ایسے لوگوں کے لئے ایک سبق ہے جو بچوں کی سوچوں سے انجان اپنے حکم ناموں کی تعمیل سے آگے کبھی نہیں سوچتے۔ تعلیم آدمی کو ایک بہتر انسان بنانے کے لئے ضروری شے ہے۔ لیکن کچھ لوگ معتبر عہدے کے نشے میں گھر اور آفس کے فرق کو بھول جاتے ہیں، نور شاہ، نے کہانی کے مختصر سے تین ابواب میں زندگی کے بہت اہم معاملات کو بیان کر دیا ہے اور یہ ثابت بھی کر دیا ہے کہ انسان کی زندگی بھی تین ابواب پر ہی منحصر ہے بچپن جو اس کی تعلیم اور دستکاری سے وابستہ ہے۔ جوانی جو اپنے آپ کو ثابت کرنے کا دور ہے اور بزرگی زندگی کے ہر مقام پر بردباری،

شفقت، سنجیدگی، کا مظاہرہ کرنے کا وقت ہے لیکن کہانی میں جو بزرگ ہے وہ بیان کردہ اوصاف سے عاری ہونے کی بناء پر ہی اپنے بیٹے کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس لئے ہر بزرگ کا بردبار ہونا لازمی ہے۔ ورنہ گھر کو برباد ہوتے دیر نہیں لگتی ہے۔

نور شاہ، کا تخیل بھی صداقت کے تابع ہے تبھی تو ان کی کہانیوں کا خمیر افسانوی احساس کی گرفت میں رہتے ہوئے بھی حقیقت پسندی سے نظریں چرا کر نہیں گزرتا ہے اور کبھی کبھی نور شاہ کہانی کو اس کاریگری کے ساتھ تخلیق کرتے ہیں کہ کہانی کا معنوی حسن کہانی کی آخری سطروں میں ہی عیاں ہوتا ہے جس کے ثبوت میں ''آدمی سڑک کا'' ایسی مختصر کہانی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ اس کہانی میں ایک ایسے انسان کی زندگی کو نمایاں کیا گیا ہے جو غریب بستیوں کو غربت کے اندھیروں سے نکال کر ترقی کے اجالوں سے جگمگانا چاہتا ہے۔ کہانی کا تمہیدی ابتدائیہ دیکھیں۔ جب وہ بستی کا سرپنچ بنا تو بستی کے لوگوں نے بھرپور جشن منایا، شاید اس لئے کہ لوگ اس کی ایمانداری، دیانت داری، اور قابلیت سے پوری طرح واقف تھے۔

سرپنچ، بننے سے پہلے بھی وہ آس پاس کے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا، سرپنچ بننے کے بعد اس نے بستی کا نقشہ ہی بدل دیا، بچے اسکول جانے لگے کسانوں کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہوگئی۔ سرکار بھی دیگر بستیوں کی خوشحالی کے لئے اس سے مشورہ کرنے لگی، لیکن وہ اپنے سرپنچی کے پانچ سال بھی پورے نہ کر سکا اور تین سال کے اندر ہی کسی موذی بیماری کا شکار ہو کر فوت ہو گیا، اس غم نے ساری بستی کو شہر خموشاں میں تبدیل کر دیا، اور ایک دن خاموشی کی اس جھیل میں ایک آواز سنائی دی۔ سرکار کا ایک ذمہ دار اہل کار بستی والوں کو بتا رہا تھا کہ سرکار مرحوم سرپنچ کی اعلیٰ کارکردگی کے لئے اسے بعد از مرگ انعام و اکرام اور اعزازات سے نوازنے کا فیصلہ کر چکی ہے یہ خبر سن کر بستی میں ہر جانب خوشیوں کے پھول مہکنے لگے۔

اور پھر ایک دن صبح سویرے بہت سارے سرکاری اہلکاروں کو دیکھ کر بستی کے لوگ

اپنے گھروں سے نکل آئے۔ بے صبری کے بہت سے لمحات گذارنے کے بعد ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کار سے اترا اور بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں بستی کی ایک گلی پر سرپنچ کے نام سے ایک بورڈ آویزاں کر کے اس گلی کو سرپنچ کے نام سے منسوب کر دیا۔ لوگ اس اعزاز سے حیران و ششدر رہ گئے کہ بڑے بڑے کام کرنے والے سرپنچ کو بستی کی گلی کا ایک حصہ بنا دیا گیا تھا۔

اس کہانی کی آخری دو ڈھائی سطروں میں ہی پوری کہانی کی معنویت سمٹ آئی ہے۔ چونکہ ہر طرح کے کرپشن میں ملوث اس دور میں ایمان دار سیاسی شخصیت یا دیانت دار آفیسر کے مرحوم ہوتے ہی ان کے ناموں کو گلیوں محلوں اور سڑکوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

اور سرکار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اپنی مکر آلودہ سوچوں سے کبھی چھٹکارا ہی نہیں ملتا جو وہ یہ سوچ سکیں کہ مرنے والے اپنے پیچھے اپنے خاندانوں کو بھی چھوڑ گئے ہیں جن کا بہر صورت خیال رکھنا سرکاری ذمہ داری ہے۔ سیاست سے جڑے ہوئے کورپشن میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ نور شاہ کی کسی بھی کہانی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں ایک نہ ایک سبق آموز پہلو ضرور ملے گا جو سماج وہ معاشرے کی بہتری کا خواہاں ہوگا۔

اس لئے میرا یہ ماننا ہے کہ نور شاہ کی کہانیاں ہی ان کے تخلیقی وجود کی بہترین مبصر ہیں۔



●...... محمد یوسف مشہور

نور شاہ کے افسانوں کی حقیقت

نور شاہ کے افسانے نصف صدی سے زیادہ عرصے سے اُسی شوق و ذوق سے پڑھے جا رہے ہیں جس ذوق و شوق سے لکھے جا رہے ہیں۔ ہر بڑا فن کار کسی خاص فن میں اپنی پہچان بنانے میں تبھی کامیاب ہوتا ہے جب وہ استقلال اور پیہم ریاضت کو اپنا شعار بناتا ہے۔ نور شاہ نے افسانہ نگاری کو اپنا خاص میدان بنایا تو افسانے کی تخلیق میں وہ کچھ اس طرح منہمک ہوئے کہ یہ اُن کا ہمہ وقتی مشغلہ بن گیا۔ وہ افسانہ سوچتے، بُنتے اور جیتے ہیں۔ گویا افسانہ اُن کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ اُن کی پُر اسرار شخصیت اگر چہ اُن کے افسانوں اور کرداروں میں مناسب موقع و محل پر ڈھلتی رہی ہے اور سنجیدہ قارئین کے لئے اجنبی نہیں رہی تاہم سطحی نظر سے دیکھنے والوں کے لئے وہ اب بھی ایک معمہ ہیں۔ بقول قتیل شفائی ؎

اِک عمر گزاری ہے اس فن میں ہم نے قتیلؔ
ملتے ہیں کہاں ہم سے فن کار لگن والے

نور شاہ جیسا لگن والا فن کار ریاست جموں و کشمیر کے دبستان اردو میں اپنے تخلیقی سفر کے دوران ڈرامے، خاکے، افسانچے اور افسانے تخلیق کرتا رہا ہے مگر اُن کی سبھی تحریروں پر افسانویت غالب ہے۔ اُن کے ڈراموں اور خاکوں میں بھی اُن کے افسانوں کی طرح کہانی پن اور مکالمے کے عناصر مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور سے اُن کی زبان جو سادہ، روزمرہ اور مختصر فقروں پر مشتمل ہے، اُن کی جملہ تحریروں میں خاص دل چسپی کا باعث ہے۔

روزمرہ کی عملی زندگی میں پیش آنے والے سامنے کے حالات و واقعات کو افسانوں کا

مواد بنانے والا یہ فن کار ماضی کی تاریخ، اسطور دیومالا اور مذہب کا سہارا لئے بغیر افسانہ تخلیق کرنے میں کامیاب ہوتا ہے وہ کسی تحریک یا مسلک کا ڈھنڈورچی نہیں ہے بلکہ زندگی کی برہنہ حقیقتوں سے براہِ راست سروکار رکھتا ہے۔ نور شاہ افسانہ کے مواد پر اور کہانی کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے اپنی تخلیقی صلاحیت اور فنکارانہ بصیرت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ ضرب الامثال، محاورات، تشبیہات اور استعارات کا کم سے کم استعمال کرتے ہیں تاکہ قاری زبان کے خارجی گورکھ دھندے اور بھول بھلیاں میں پھنس کر نفسِ مضمون اور اصل غرض و غایت تک پہنچنے میں ناکام نہ رہے۔ سماجی افسانے کی جمالیات یہی ہے کہ ترسیل و ابلاغ کی راہ میں خود متن رُکاوٹ نہ بن جائے۔ شاعری کی بات اس سے بالکل مختلف ہے۔ شاعری میں شعرِ شور انگیز مستحسن ہے کیونکہ اس میں اسی وسیلے سے گہرائی اور کثیر معنویت پیدا ہوتی ہے۔ اِس کے برعکس افسانے میں یہی مقصد پلاٹ بندی، مکالمے اور کردار نگاری کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں افسانہ نگار کا کمال یہی ہے کہ بالکل سادہ زبان، آسان اور مختصر جملوں میں عرض مطلب کرنے، مرصع و مسجع اور گنجلک زبان ایک گونہ ''شور'' کا باعث ہوسکتی ہے قاری اس طرح کے اسلوب میں اُلجھ کر متن کی کنہ تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ بعض نقادوں اور قارئین کو نور شاہ کے افسانوں میں، اکہرا اور یک معنویت پر اعتراض ہوگا کیوں کہ ادبی تنقید میں تہداری اور کثیر معنویت کا بہت زیادہ چرچا کیا جاچکا ہے مگر یہ شاعری، انشائیہ نگاری یا زیادہ سے زیادہ علامتی افسانے کی حد تک درست ہے جو ادیب، سماج اور فرد کے دُکھ درد کو شدت سے محسوس کرتا ہو اور اِس کے ازالے کے لئے ادب تخلیق کررہا ہو وہ بھلا اُدھر اِدھر کی ہانک کر کیا کرے گا۔ وہ بے اختیار کراہتا ہے چیختا ہے، چلاتا ہے کیوں کہ

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

نور شاہ اُس سماج کا حصہ ہے جہاں انصاف کا خون ہوتا رہا ہے۔ استحصال کے نت

نئے حربے ایجاد کئے جاتے رہے ہیں۔ انسانی حقوق کی پامالی اپنی آخری حدود کو چھو رہی ہے۔ ایسے ماحول میں حق و انصاف کی جدوجہد میں شامل ہونے والے ادیب اور فن کار کو وہی زبان اور وہی طرزِ اظہار اختیار کرنا چاہیے جس سے ترسیل میں دِقت نہ ہو۔ اسی لئے عدلیہ کے لئے واضح اور غیر مبہم زبان کی سفارش کی جاتی ہے۔ اس میں ملمع کاری اور تصنع سے مغالطے اور گمراہیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان کے مجموعے ''کیسا ہے یہ جنوں'' میں شامل اسی عنوان کی کہانی کا یہ اقتباس نور شاہ کی سادہ عبارت اور مطلب برآری کا کافی وشافی ثبوت ہے۔

''میرا نام عامر ہے اور میری عمر لگ بھگ بارہ برس ہے۔ بھلا بارہ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ یہ تو کھیلنے کودنے، ہنسنے ہنسانے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کی عمر ہوتی ہے۔ زندگی کے طویل سفر میں بارہ برسوں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن جب بچپن اور لڑکپن کے مٹھاس بھرے دِن تلخیوں اور کڑواہٹوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کھیل کود کے ایام جدوجہد اور کشمکش کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو ذہن میں اپنی کم علمی اور کم فہمی کے باوجود کئی سوال اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں۔''

نور شاہ کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اِن میں راوی کوئی فالتو شخص نہیں بلکہ خود افسانے کا کردار بلکہ بعض اوقات مرکزی کردار ہے۔ وہی اپنی بپتا سناتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس طرح راوی قاری اور کرداروں کے درمیان حائل نہیں ہوتا بلکہ کردار براہِ راست قاری سے مکالمہ قائم کرتا ہے۔ راوی کی درمیانہ داری اور دلالی سے اپنے افسانوں کو پاک کرنا بھی نور شاہ نے یوں ہی روا نہیں رکھا ہے۔ اِس کے پیچھے بھی حقیقت کارفرما ہے کہ سماج میں ان ہی عناصر کی کارستانیوں نے زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی بے محل نہیں ہے کہ خود افسانہ نگار اپنے اکثر افسانوں میں اسی متذکرہ بالا راوی نما کردار کے خول میں چھپ کر آپ بیتی سناتا ہے۔ اسی آپ بیتی کے پہلو میں جگ بیتی عیاں ہے۔ دراصل افسانہ نگار اپنے سماج کے بارے میں اتنا فکر مند ہے کہ وہ وقت ضائع کئے بغیر قاری کو اپنا ہم نوا بنانا چاہتا ہے تاکہ ظلم وستم کا فوری مداوا ہو سکے۔ یہ اور بات ہے کہ اِس سماج میں اب قاری ہی ناپید ہو رہا ہے اگر اِکا دُکا ہے

بھی تو وہ اپنے ادیب اور فن کار کے تجربے سے گزر کر اُس کے درد کو بانٹنے کیلیئے تیار نہیں ہے۔

''کیسا ہے یہ جنون'' میں شامل کہانی، رشتوں کا درد، سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''میں کبھی ان گیتوں پر جان دیتا تھا۔ اب انہیں سننا نہیں چاہتا۔ اب مجھے ان نیم سریلی آوازوں سے بھی نفرت ہوگئی ہے ......نہیں، نہیں، آج مجھے ٹھنڈی تازہ ہوا کی ضرورت نہیں۔ آج میں اپنے بند کمرے میں گھٹ گھٹ کر رونا چاہتا ہوں۔ میں اپنی ان ساری کہانیوں کو اپنے کمرے کی گھٹن میں دفن کرنا چاہتا ہوں تاکہ صبح کوئی نئی کہانی نہ جاگے۔ کسی نئی کہانی کا جنم نہ ہو۔ میں نئی صبح کی دلہن کو اندھیاروں میں پیدا ہوتے نہیں دیکھ سکتا......!

راوی جو اس کہانی کا مرکزی کردار اور خود کہانی کار ہے تخلیقی کرب میں مبتلا ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک کہانی روپ دھارنے پر تلی ہوئی ہے مگر وہ انجام سے واقف اپنے شاہکاروں کی بے قدری گوارا نہیں کرسکتا۔ وہ بہ بانگِ دُہل کہتا ہے کہ وہ ان کہانیوں کو تشکیل نہیں دے گا۔ مگر اپنے آس پاس کے حالات کے ہاتھوں مجبور نہ چاہتے ہوئے بھی حقیقت سے پردہ اُٹھاتا ہے تاکہ اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوسکے۔ یہ ذمہ داری بحیثیت حساس سماجی کارکن اور مخلص انسان اُس نے خود اپنے اوپر عائد کردی ہے۔ اسی سے اُس کا ضمیر زندہ ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا کرسکتا ہے کہ خود نمائی سے بچنے کے لئے اپنی اَنا کو دبائے رکھے۔ بڑبول اور بلند آہنگی کا دعویٰ کرے نہ مظاہرہ۔ بالکل دھیمی آنچ پر وہ معجونِ مرکب تیار کرے جو مظلوم اور کمزور کے درد کے لئے مجرب ہو۔ چنانچہ نور شاہ خواص کے بجائے عوام کے فن کار ہیں۔ اُنہیں پاپولر کہانی کار کہلانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ یہی اُن کے فن کی کامیابی ہے۔ اِس سے کہیں یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ وہ صحافتی نوعیت کا ادب تخلیق کرتے ہیں اور اخباری طرز کے بیانات درج کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اربابِ اختیار و اقتدار نے اُسے کب کا تختۂ دار پر چڑھایا ہوتا کیونکہ بنیادی طور وہ ہر سچے فن کار کی طرح اینٹی اسٹیبلشمنٹ ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ کی رسائی اخبارات کی سرخیوں سے آگے نہیں ہے۔ اُسے سنجیدہ ادب کے مطالعے کی فرصت ہی نہیں ہے

۔رہا یہ سوال کہ اگر نور شاہ ہر دل عزیز اور بڑا فن کار ہے تو اُسے اپنے مرتبے کے عین مطابق پذیرائی کیوں نہیں ملتی جس کا وہ حقدار ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ادبی سیاست پر وہ جگادری چھائے ہوئے ہیں جنہیں جانب داری، اقربا نوازی اور لابی اِزم کا مرض لاحق ہے۔ وہ اُسی کے سر پر ٹوپی رکھتے ہیں جو اپنی دستار اُن کے چرنوں میں ڈال دے۔ بڑا فن کار ایسا کبھی نہیں کرسکتا۔ نور شاہ کے افسانوں کی حقیقت سمجھنے کے لئے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہ جذباتیت اور ہیجان انگیزی سے بہت حد تک گریز کرتے ہیں۔ اُنہیں معلوم ہے کہ جذباتی اور ہیجان انگیز تخلیقات میں ہماری دل چسپی خطرناک رجحان ہے کیوں کہ اِس طرح ہم ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے عمل سے بچنا چاہتے ہیں۔ اِدھر استحصال کی قوتوں کا ایک خطرناک حربہ یہ بھی ہے کہ ستم کشوں کو، مبہم اور گمراہ کن لسانی روّیوں میں اُلجھایا جائے اور اُن کے جذبات کو اس طرح اُبھارا جائے کہ وہ اِس کی رو میں بہہ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہوجائیں۔ نور شاہ جیسا خاموش طبیعت اور بردبار فنکار کسی استحصالی کی نقاد کے بہکاوے میں نہیں آتا، وہ اپنے مشن پر مسلسل کام کرتا ہے وہ کسی صلے یا کسی کی واہ! واہ! کے بھوکے نہیں ہیں۔ فکشن کی دُنیا کا یہ مجذوب زندگی کی بھیڑ میں کھوجانے کے بجائے اپنی انفرادیت کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنی تخلیقی دُنیا آباد کرنے میں مصروف ہے۔ ادبی ماحول میں قائم اجارہ داری کوشش کے باوجود بھی اُنہیں اپنے دام میں گرفتار نہیں کرسکتی۔ وہ کسی کا ڈکٹیشن لینے کے محتاج ہیں نہ آمادہ۔ اُنہیں اپنے باذوق اور ہم خیال قارئین پر پورا اعتماد ہے۔ یہی اُن کا انعام واکرام اور ادبی مسلک ہے۔ بھلا ایسے مخلص قارئین کو جن کی ہماری سماج میں اکثریت ہے، کو چھوڑ کر چندِ گنے چنے فیشن پرستوں اور نظریات فروشوں کی باتوں میں آنا کوئی ادبی دیانت داری ہے؟

نور شاہ کے افسانوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کمپنی کی مشہوری کے لئے کرشمہ سازی اور کالے جادو کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کے افسانوں کے کردار پلک جھپکنے میں شیطان سے انسان یا انسان سے شیطان نہیں بنتے۔ اُن کے پاس ایسی کوئی جادوئی چھڑی نہیں

جسے گھما کر وہ ناخوب کو خوب بنانے کا ڈھونگ رچائیں۔ ''درندے'' میں مادوی کی عزت سے کھیلنے والے اور پھر اُس کا قتل کرنے والے فوراً تائب نہیں ہوتے اور افسانہ نگار اُنہیں دودھ کے دُھلے ثابت کرنے کی غلطی نہیں کرتا۔ اُسے معلوم ہے کہ بُری عادت موت سے پہلے نہیں چھوٹتی اور سرشت چشم زدن میں تبدیل نہیں ہوتی۔ 'لکیر' کا 'میں' تیس سال کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ اب میں تیس سال اُس پار رہنے کے بعد اِس پار آیا ہوں۔ ان تیس برسوں کے دوران اُس پار کی طرح اس پار بھی کچھ نہیں بدلا ہے۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ سرحد کی لکیر بھی ویسی ہی ہے جو اس بستی کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ایک تصویر کو دو روپ دیتی ہے۔'' گویا بدلاؤ کا نعرہ بالکل کھوکھلا اور بے معنی ہے۔ شاید سماجی روّیوں کی یہی سخت مزاجی نور شاہ کے افسانوں کو المناک انجام تک پہچاتی ہے۔ اُنہیں المیہ کو طربناک انجام تک پہنچانے میں دل چسپی اس لئے نہیں ہے کہ زمینی سطح پر کوئی خاطر خواہ تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔ لباس اور ظاہری رکھ رکھاؤ ہزار بدلے مگر باطنی میل کچیل دھونے کے لئے کوئی آمادہ نہیں ہے۔ اِسے یاسیت پر نہیں بلکہ حقیقتِ حال پر محمول کیا جانا چاہیئے۔



● ...... رفیق شاہین

نورشاہ۔ طرب وکرب کا ترجمان

کشمیر کے فکشن نگار نورشاہ محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وہ نہ صرف درون ملک بلکہ دور افتادہ براعظموں پر آباد اردو بستیوں کے آسمان پر بھی مہر نصف النہار کی طرح درخشندہ وتابندہ دکھائی دیتے ہیں۔ موصوف کی شخصیت کئی خانوں میں منقسم ہیں۔ ناول، خاکے، ترجمہ، ناولٹ افسانہ، افسانچہ، بچوں کی کہانیاں، ٹی وی سیریل، ریڈیائی ڈرامے، فیچرس، ڈائری نویسی، کالم نگاری اور صحافت جیسے میدانوں کے وہ ایک ایسے اہم اور کامیاب شہسوار ہیں جنہوں نے ہر محاذ پر اپنی فتوحات کے پرچم لہرائے ہیں۔ ان کے نثر پارے پرنٹ میڈیا کے وسیلے سے سرِ قرطاس ابیض جلوہ نما اور مشتہر ومقبول ہوکر اہالیان علم وعرفان ارباب حل وعقد اور حلقہ ہائے تشنگان ناول افسانہ سے داد وستائش اور تحسین وتہنیت کے گراں مایہ نذرانے قبول ووصول کرتے رہتے ہیں۔ مغرب کے مفکر تالمود نے فرمایا ''اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بعد تمہارے بچے تمہیں یاد کریں تو تم اُن کے لئے ایک جھونپڑی بناؤ اور اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پوتے تمہیں یاد رکھیں تو تم اُن کے لئے ایک پتھر کی حویلی تعمیر کرو اور اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پڑپوتے تمہیں یاد رکھیں تو تم ان کے لئے ایک فصیل بند شہر بساؤ اور اگر تم چاہتے ہو کہ آنے والی نسلیں تمہیں رہتی دنیا تک یاد کریں تو زیادہ کچھ نہیں تم بس ایک کتاب تصنیف کر جاؤ۔'' ہوسکتا ہے کہ یہ قول شاہ کی نظر سے گزرا ہی نہ ہو۔ اس کے باوجود خود ہی اتنے دور اندیش اور باشعور واقع ہوئے ہیں کہ ایک کتاب تو کیا تقریباً

ایک درجن کتابیں منظرِ عام کی زیب و زینت بنا کر انہوں نے تاریخِ ادب میں اپنا نام ہمیشہ ہمیشہ کیلئے امر کر لیا ہے۔

میں ۱۹۵۸ء سے لے کر آج تک اُن کے افسانے بڑے ذوق شوق سے پڑھتا چلا آرہا ہوں اور انہیں میں نے ہمیشہ اپنے دل کے بے حد قریب محسوس کیا ہے۔ ان سے روبرو ملاقات کا موقع تو نصیب نہیں ہوا تاہم فون پر گفتگو کے دوران انہیں ایک شریف النفس، منکسر المزاج اور نہایت مخلص انسان محسوس کیا ہے۔ کشمیر میں میرے جتنے بھی عزیز و رفیق ہیں وہ بھی ان کے عجز و انکسار اور تہذیب و شرافت کی سچائی کی قسمیں کھا کر یقین دلاتے ہیں جس کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ مجھ سے تو ان کا مشفقانہ اور ہمدردانہ سلوک رہا ہے اس کا گواہ میں خود ہوں۔ ان کا سال رواں کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ''کیسا ہے یہ جنون'' میرے زیر مطالعہ ہے اور اب اسی پر اظہار خیال مقصود ہے۔ ۲۵۸ صفحات پر محیط یہ کتاب جس کے بیک کور پر مصنف جلوہ فرما نظر آتے ہیں، اس کے ابتدائی ۳۸ صفحات پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، دیپک، بدکی اور ڈاکٹر اشرف آثاری کے مضامین کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ عرض مدعا کے لئے مصنف نے خود بھی دو صفحات پر قبضہ جمانا اپنا حق سمجھا ہے۔ صفحہ ۴۲ تا ۱۰۵ حصہ اول کے تحت گیارہ افسانے پیش کئے گئے ہیں۔ حصہ ب کے تحت تین ریڈیائی ڈرامے پیش کئے گئے ہیں جو ۱۰۸ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۵۷ پر اپنے اختتام کو پہنچ جاتے ہیں۔ حصہ ج جو افسانچوں کے لئے وقف ہے اسے ۳۹ افسانچوں کا گلدستہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح چار مزید حصے اور بھی ہیں جن کے زیر عنوان کشمیری کہانیوں کے اُردو تراجم، فلمی فیچر بچوں کی دنیا اور سیلاب کی کہانیاں مرتب کی گئی ہیں۔

نور شاہ شاعرانہ مزاج کے مالک ہیں۔ اُن کی نثر میں سلاست، فصاحت مہارت ذکاوت فراست اور فکری و فنی معنویت کے علاوہ شعری نزاکت و نفاست اور حلاوت موسیقیت کی سحر انگیز فضا کا جادو بھی لطف و انبساط اور کیف و سرور سے شاد و سرشار کر دیتا ہے۔ اُن کے قلم میں بے پناہ پختگی ہے۔ حال و ماضی کے متضاد محرکات اور بیکِ وقت کبھی کبھی دو کہانیوں کے مختلف

کرداروں کے مزاج و منہاج کا ایک ہی کہانی میں بیان کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ بیانیہ کی فصاحت اور کہانی کا تسلسل اور دلچسپی بھی مجروح نہ ہو کوئی آسان کام نہیں ہے۔ افسانہ ''رشتوں کا درد'' میں اُنہوں نے سلمیٰ اور صنوبر کے معاشی اور خانگی حالات کے تضاد پر مبنی بیک وقت دو کہانیاں اس خوبی سے بیان کی ہیں کہ نہ تو کہیں بیانیہ میں سقم پیدا ہوا ہے اور نہ ہی کہیں کوئی گرہ پڑی ہے، جوان کے بیان واسلوب کی مہارت پر دال ہے۔

نور شاہ نے مدت مزید تک محض رومانی افسانے لکھ کر قارئین کے ایک وسیع حلقے کو اپنا مرید و مداح بنالیا تھا۔ اُن کے رومانی افسانے بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ بعد میں جب کشمیر میں سیاسی و معاشرتی حالات بد سے بدتر ہو گئے تو عصری تقاضوں کے خاکے پیشِ نظر انہوں نے بھی حقیقت اور عصری حسیت کو اُجاگر کرنے والے موضوعات کو وسیلۂ اظہار بنالیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں ہمیں گم گشتہ تہذیب وتمدن، انسان دوستی دردمندی اور اعلیٰ قدروں کی بازیابی اور بحالی کا جذبہ جوش مارتا دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی بامقصد کہانیاں امن وآشتی یکجہتی، انسان دوستی اور امن وسکون کی زندگی جینے پر اصرار کرتی ہیں۔

پہلی کہانی جو کتاب کا سرنامہ بھی ہے'' کیسا ہے یہ جنون'' ظلم وتشدد کے خلاف نعرۂ احتجاج کا درجہ رکھتی ہے۔ دادی کا بیٹا اس آمرانہ تشدد کی بھینٹ چڑھ چکا ہے اور اب اس کا بارہ سالہ پوتا بھی باطل کے خلاف سینہ سپر ہو چکا ہے۔ تجربے کار دادی مستقبل سے لئے سہہ عفریت کے لہراتے سائے کو دیکھ کر یکبارگی پکار اُٹھی ہے۔

''بیٹی! اب جو میں مرونگی تو میرا رونے والا کوئی نہ ہوگا۔ مجھے کندھا دینے والا کوئی نہ ہوگا۔''

کہانی ''درندے'' محبت میں ایک ہو جانے والے نوجوان جوڑے کی کہانی ہے۔ کہانی کا ہیرو دو سال بعد جب لندن سے واپس اپنے وطن لوٹتا ہے اور ائیر پورٹ پر اپنی محبوبہ کو نہیں پاتا تو اس کے گھر جاتا ہے تو وہ اسے وہاں بھی نہیں ملتی۔ لہٰذا اس کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں

درج کرادی جاتی ہے۔ پھر اطلاع ملنے پر وہ اسپتال چلا جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کی محبوبہ بستر مرگ پر آخری سانسیں گن رہی تھی۔ مشکل سے اس نے اپنے محبوب کا زیر لب نام لیا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ وہ گینگ ریپ کا شکار ہوئی تھی۔

کہانی ''لکیر'' سرحد کے اس پار اور اُس پار ہر جگہ یکساں وحشت و درندگی کی آئینہ دار ہے۔

''ساتھ ہے مہربان میرا'' نامی افسانہ ایک بیوی کی اپنے شوہر سے غیر معمولی محبت کی عکاس ہے۔ ایک عورت رات کے وقت ڈاکٹر کو بتا کر کہ اس کا شوہر سخت بیمار ہے اسے اپنے گھر لاتی ہے۔ ڈاکٹر مریض کو انجکشن لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے صبح تک یہاں رُک کر مریض پر نظر رکھنی ہوگی۔ صبح ہونے پر مریض ہوش میں آجاتا ہے اور حیرت زدہ ہو کر پوچھتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب آپ یہاں آئے کیسے؟

ڈاکٹر دیوار پر آویزاں اس کی بیوی کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔ آپ کی یہ بیوی ہی تو مجھے بلا کر لائی ہیں۔ اس پر مریض کہتا ہے یہ تو ممکن ہی نہیں ان کے انتقال کو تو پانچ سال گزر چکے ہیں۔

کہانی ''روشنی اور سائے'' کا لب لباب یہ ہے کہ مکان مالکن خانم کو اپنی نوجوان ملازمہ پر فخر تھا کہ عالیہ نے سونے چاندی سے بھری کھلی الماریوں کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا مگر ایک دن اسے شوہر کی طرف سے مشکوک ہو جانے پر اس نے فی الفور عالیہ کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ پھر دو سال کے بعد جب اسی عالیہ کو ایک عالیشان شاپنگ مال میں امیرزادیوں جیسے ٹھاٹھ باٹ میں دیکھا تو حیران رہ گئی۔ دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ دو سال پہلے اُس نے ایک دولت مند رئیس سے شادی کر لی ہے اور جب اُس رئیس کا نام اُس نے احمد کلیم بتایا تو اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی کہ یہ تو اسی کے شوہر کا نام تھا۔

کہانی ''یہ خلش اگر نہ ہوتی'' میں بیوی کے مابین ضد اور عدم مفاہمت کے تار و پود سے تخلیق کی گئی ہے۔ شہر کی فضول خرچی سے پرہیز کی تاکید کا بُرا مان کر بیوی اپنا گھر چھوڑ کر میکے

چلی جاتی ہے۔ وہاں بھائیوں، بہنوں اور اُن کے شوہروں کے درمیان بھی جب گفتگو کا عنوان فضول خرچی بن جاتا ہے اور وہ اُن سب کو بھی اس کے خلاف پاتی ہے تو شوہر سے اُس کی شکایت دور ہو جاتی ہے اور وہ خوشی خوشی اپنے شوہر کے پاس چلی جاتی ہے۔

اُن کے ریڈیائی ڈراموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں منظر، موسم اور کرداروں کو سماعت کے وسیلے سے بڑی فنی چابکدستی سے بصارت کا حصہ بنایا گیا ہے جو سامعین کو شاد کام کرتا ہے۔ امراؤ بیگم اور مرزا غالب کی پیشکش کا اسلوب بھی دلکش و دلآویز ہے۔ جہاں تک افسانچوں کا تعلق ہے وہ ہمارے سماج میں در آئی بدعنوانیوں اور زندہ کرداروں کی مردہ ضمیری کو کاٹ دار طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ قارئین اور سامعین کو آسودگی بھی فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا، کیا روپ، کیا سروپ، تجربہ، ڈیوٹی، انتظار اور نصیحت وغیرہ ایسے ہی کھنکتے چھنکتے افسانچے ہیں۔ کشمیری کہانیوں کے تراجم میں سلاست فصاحت، تسلسل اور روانی کا خیال رکھا گیا ہے۔ فلمی فیچر میں تکنیک کی پابندی کے ساتھ شکیل بدایونی اور کیفی اعظمی کے شخصی اور فلمی و فنی نقوش کو اُبھارا گیا ہے۔ شکیلؔ، کیفیؔ اور نوشاد سے ملاقاتوں کا بذات خود مجھے بھی شرف حاصل رہا ہے۔ ’’کیسا ہے یہ جنون‘‘ نور شاہ کی ایک اہم کتاب ہے جسے دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔ اور وہ بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔



●...... ڈاکٹر مجیب شہزر

عہد آشنا فکشن نگار

کشمیر کے سینئر اور ہر دلعزیز افسانہ نگار نور شاہ آفاقِ ادب میں شرف قبولیت اور شہرت وشہامت کی سب سے بلند چوٹی پر متمکن نظر آتے ہیں۔ اس بلندی پر پہنچنے کے لئے اپنے سفر کا آغاز انہوں نے اپنی اوّلین تخلیق ''گلاب کے پھول'' کے ساتھ ۱۹۵۸ء میں کیا تھا اور تب سے آج تک انہوں نے کتنے گلاب چمپا، چمیلی، مولری، گل لالہ، گل ہزارہ، گل مہندی اور کنول کھلائے اور مہکتے اور مسکراتے کتنے گلشن آباد کئے اس کا اندازہ انہیں خود بھی نہیں ہے۔ وہ تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان کا ذہن ہمیشہ بیدار رہا، فکر انگڑائیاں لیتی رہی۔ تخیل کا طائر ہمیشہ مائل پرواز رہا اور قلم سر فرط اسی طرح جیسے کل محورِ قص تھا۔ اسی طرح آج بھی رواں اور رقصاں ہے۔ افسانچہ، ناولٹ، ناول فلمی فیچر، ریڈیائی ڈرامے، اردو ترجمہ، ادبِ اطفال، ادبی خاکے، سیلابی کہانیاں اور صحافت ہر میدان میں انہوں نے اپنی تخلیقی فکری اور نئی مہارت نیز امتیاز و انفراد کا لوہا منوایا ہے۔ ان کے نثر پارے معیاری رسائل کے سر قرطاس ابیض متواتر جلوہ طرازیاں اور گہر افشانیاں کرتے رہتے ہیں۔

نور شاہ محبت کا جواب محبت سے دینے والے نہایت نیک اور سیدھے سچے انسان ہیں۔ وہ اپنے محکمے میں ترقی کر کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ دوران ملازمت اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد جو بھی وقت انہیں میسر ہوا، وہ تمام وقت انہوں نے لوح وقلم کی نذر کر دیا۔ اس طرح صوفیانہ اصطلاح کے طور پر اگر انہیں فنا فی الادب کہا جائے تو مطلق بھی غلط نہ

ہوگا۔ تخلیقی مسرت کو پا کر انہوں نے زندگی کی باقی تمام خوشیوں کا قصداً تیاگ کیا ہے اور اسی تیاگ اور دنیاوی سنیاس کی بدولت ہی آج وہ ایک ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف ہیں اور برصغیر میں ایک بہت بڑا حلقہ اس کے نام کی مالا جپا کرتا ہے۔ یہ قدر و منزلت، یہ شہرت و شہامت ان کے اسی تپ و تپسیا کا ثمر شیریں ہے۔

ان کے افسانے ایڈگر ایلین پو کے نظریے کے مطابق قرأت میں نصف گھنٹے سے زیادہ وقت کا تقاضہ نہیں کرتے۔ بے ہنگم جدیدیت والی دقاقت و ثقالت، ژولیدگی و پیچیدگی اور مہملیت ولایعنیت سے ان کی نثر کو دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ وہ سادگی میں پُر کاری، طرز بیان کی جمالیاتی سحر کاری اور تسلسل و روانی کی دلکشی و دلآویزی اور تاثر کی دل پذیر کیفیت میں رچے بسے ہی افسانے معرض وجود میں لانا پسند کرتے ہیں۔ ان کے افسانے میں کہانی بھی ہوتی ہے اور پلاٹ بھی، ساتھ ہی باقاعدہ طور پر آغاز و ارتقاء نقطۂ عروج اور انجام کا بھی التزام و اہتمام روا رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے وقت اور عصری تقاضوں کے مطابق رومانی جذباتی حسّیاتی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی ہر طرح کی کہانیاں تخلیق کی ہیں۔

''کیسا ہے یہ جنون'' ان کا تازہ ترین نواں افسانوی مجموعہ ہے جس میں افسانے، افسانچے، ریڈیائی ڈرامے، فلمی فیچر بچوں کی کہانیاں، کشمیری افسانوں کے ترجمے شامل کتاب کئے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ماجرا سازی، مرقع کشی کے ساتھ کردار نگاری بڑے غضب کی ہوتی ہے۔ بیانیہ کا بہاؤ مکالموں کو ضروری نہیں مانتا لیکن موقع محل کی مناسبت سے لکھے ان کے مکالموں کی بے ساختگی، برجستگی اور معنی خیزی ان کے افسانوں کی رگ و پے میں زندگی کی لہر دوڑا کر انہیں حقیقت اور واقعیت سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔

''اجنبی چہرے'' ایک ایسا زمانہ ہے جو رشتوں کے کھوکھلے پن اور تصنع کا آئینہ دار ہے۔ یہ ایک بچے ارشد کی دکھ درد سے بھری تنہا زندگی کا المیہ افسانہ ہے جو بیک وقت کئی چہروں کو بے نقاب کر کے دوغلی زندگی بسر کرنے والے کرداروں کو قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ ارشد کی

ماں اپنے دیور کے ساتھ فرار ہوگئی۔ پھر جوانی میں قدم رکھنے کے بعد ارشد کی ملاقات سائرہ ڈاکٹر تاج اور روپ متی سے ہوئی۔ کوئی وقت گزار کر چلی گئی کسی نے اسے اس کی غربت کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ بعد میں جب دولت اس پر مہربان ہوگئی تب بھی روپ متی نے اس کے بدنام خاندان کی وجہ سے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور وہ کرب انگیز تنہائی کے بھنور میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔

''سفر زندگی کا'' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کا شوہر لداخ جاتے ہوئے ہوائی حادثے کا شکار ہوگیا۔ وہ اپنی گود کے بچے کے ساتھ ٹرین سے کشمیر جارہی تھی۔ اگلے اسٹیشن پہ کچھ عورتیں اسی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئی اور کسی کے منع کرنے پر بھی بھاری سامان اوپر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد سامان گرا اور وِدھوا عورت جو پہلے سے ٹرین میں سفر کررہی تھی اس کی گود کے بچے کے اوپر گرا اور بچہ لہو میں تربتر ایک سرد لاش میں تبدیل ہوگیا۔ اس کی ماں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ سارا کمپارٹمنٹ ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ کہ ناگہاں عورت کے حواس بحال ہو گئے ۔ پھر جس عورت کا سامان بچے کی موت کا سبب بنا تھا اس نے لپک کر اس عورت کا بچہ اس کی گود سے چھین لیا۔ یہ افسانے کا نقطہ عروج تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب کا خیال یہی تھا کہ وہ بچے کو چلتی ٹرین سے باہر پھینک دے گی کہ وہ عورت نیم دیوانگی کے عالم میں قہقہے لگاتے ہوئے کہے جارہی تھی دیکھا میرے بچے کو کچھ نہیں ہوا۔ میں نے اسے مرنے سے بچالیا ہے۔ نور شاہ نے یہاں ثابت کردکھایا ہے کہ ماں کی ممتا عظیم ہوتی ہے جو زندگی دینا جانتی ہے لینا نہیں۔

''کیسا ہے یہ جنون'' مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ چھ ماہ کے بچے کا ایک باپ عوام پر ظلم ڈھانے والوں سے انصاف کی دہائی دینے والے ایک گروہ میں شامل ہوگیا مگر جبّاروں اور قہاروں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو انصاف دینے کے بجائے موت کے گھاٹ اتار دیا پھر جب مقتول کا چھ ماہ کا وہ بچہ بارہ برس کا ہوگیا۔ تب بھی شہر میں لاقانونیت اور افراتفری کی وہی فضا قائم تھی۔ آج بھی امن و انصاف کے لئے لوگ اپنی جانوں کی بازی لگائے ہوئے تھے اور ان میں یہ بارہ سالہ بچہ بھی شامل تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ابو کی طرح کیا ہم سب بے گناہوں کو بھی تختہ دار

پہ لٹکا دیا جائے گا۔ کھیل کود کی عمر میں بچے کی ایسی سوچ وقت اور تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ''درندے'' ایک ایسی المیہ کہانی ہے جو سماج میں رہ کر سماج کے افراد پر مظالم ڈھانے والے وحشی درندوں کے خلاف شدید احتجاج کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک لڑکی کا محبوب جب دو سال کے بعد ہندوستان آیا تو اس محبوبہ شہر کے ایک اسپتال میں بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رہی ہوتی ہے۔ اپنے محبوب کو سامنے پا کر اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ وہ زیر لب اس کا نام لے کر اسے پکارتی ہے اور اس کے ساتھ ہی کالج کی ایک لیکچرار حسینہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیتی ہے۔ وہ گینگ ریپ کا شکار ہوئی تھی۔

''لکیر'' ایک فلسفیانہ فکر و احساس کی کہانی ہے جو انگنت معصوم اور بے گناہ افراد کو موت کی نیند سُلا دینے والی سرحد کی خونی لکیر پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

نور شاہ نے افسانچوں میں بھی اپنے کمال اور فکر و فن کے جوہر دکھا کر ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ تضاد کی بنیاد پر استواران کے افسانچوں میں عصری حسیت اور زمینی صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ سماج کی دوغلی ذہنیت دوہرے معیار اور خود غرضانہ تفاعل پر انہوں نے طنز کے پتھر بھی خوب اُچھالے ہیں۔

''پھر کیا'' میں انٹرویو کے دوران ایک حسینہ کے مثبت جوابات سے اندازہ لگالیا جاتا ہے کہ کمپنی کے کلائنٹ کو خوش کرنے میں اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا لہٰذا اسے پی۔ آر۔ او کے لئے منتخب کرلیا جاتا ہے۔ ایک اور افسانچہ خون کے رشتوں کی بے عزتی کا نوحہ ہے۔ بیٹا چھ برس کے بعد جب وطن آتا ہے تو اس کے باپ کے جنازے کی تدفین کی جارہی تھی۔ بیٹے نے کیمرے سے میّت کی تصویر کھینچ لی اور کہا یہ تصویریں بچوں کو لندن ای۔ میل کروں گا۔ وہ تصویر میں اپنے دادا کو دیکھ کر خوب انجوائے کریں گے۔

افسانچہ ''تجربہ'' تہذیبی قدروں کی موت کا المیہ ہے۔ بچہ نہ ہونے پر شوہر مشورہ دیتا ہے کہ وہ یہ بچہ کسی اور کی مدد سے بھی تو حاصل کر سکتی ہے۔ اس میں بدنامی کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ یہ

مشورہ بیوی کو خوشی نہیں دیتا کیونکہ ایسے تجربے تو پہلے بھی کر چکی تھی شاید زمین ہی زرخیز نہیں تھی۔ ڈیوٹی مکروریا کاری پر مبنی افسانچہ ہے۔ تھانہ انچارج ایک جیب کترے کو اس شرط کے ساتھ اسے حوالات سے آزاد کر دیتا ہے کہ وہ باہر جا کر دن بھر راہگیروں کی جیب کاٹے اور شام کو ساری رقم اس کے حوالے کر دے۔ جیب تراش نے دس ہزار کی جیب کاٹ کر پانچ ہزار گھر والوں کو دیدیے اور پانچ ہزار تھانہ انچارج کو سونپ دیئے کہ اسی دن جس کی جیب کٹی تھی وہ بھی ایف۔آئی۔آر درج کرانے تھانے آ گیا اور کہا کہ دس ہزار کی جیب کٹی ہے۔ تھانہ دار کو جیب تراش کی بے ایمانی پر بہت غصہ آیا مگر ضبط کر کے جیب کترے کو تاکید کی کہ دوبارہ یہ حرکت مت کرنا ''اب جا کر کھانا کھالو اور سو جاؤ۔ کل پھر تمہیں ڈیوٹی پر نکلنا ہوگا''۔ ریڈیائی ڈرامے، فلمی فیچر، بچوں کی کہانیاں اور کشمیری کہانیوں کے اُردو ترجمے سبھی اپنی جگہ دلچسپ اور معنویت سے بھرپور ہیں۔

...........●●● ....

●...... شرافت حسین

نور شاہ۔ فکشن کی عہد آفرین شخصیت

بحیثیت افسانہ نگار نور کا نام ''میرے دل و دماغ'' میں کم و بیش نصف صدی سے بسا ہوا ہے۔ اس وقت میں قلم پکڑنا سیکھ رہا تھا۔ بیسویں صدی دہلی میں ان کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ ایڈیٹر خوشتر گرامی سال میں دو خصوص شمارے سالنامہ اور افسانہ نمبر نکالتے تھے، جس کا قارئین کو بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ اکثر نور شاہ کے افسانے خاص نمبر میں شائع ہوتے تھے۔ کرشن چندر، رام لعل، حامدی کاشمیری، بشیر پردیپ، شکیل الرحمٰن کے علاوہ میں نور شاہ کا بھی مداح تھا۔ ان کی تصویر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بے حد حساس، سیدھا سادہ شریف نوجوان ہے۔ اس کشمیر کے حسن کا دلدادہ تھا جو فلموں میں دیکھتا اور نور شاہ کے افسانوں میں پڑھتا تھا۔ ان کے افسانوں میں رومان کے ساتھ کشمیری حسن بھی ہوتا۔ انہوں نے اتنی بار ڈل جھیل کی تصویر کشی کی تھی۔ سرینگر کے آس پاس کے علاقوں کا تذکرہ کیا تھا کہ بہت ساری جگہوں کے نام مجھے یاد ہو گئے تھے اور میرے اندر کشمیر کا حسن دیکھنے کی الگ شدت اختیار کر گئی تھی۔ آخر میرے کشمیری دوست گلشن کاشمیری کی بدولت مجھے ۱۹۷۱ء میں وہاں جانے کا موقع مل گیا لیکن اس وقت میں اپنے محبوب فنکار نور شاہ کو تلاش نہیں کر سکا۔ بس وہاں کے دلنشیں نظاروں، کوہساروں، مرغزاروں، آبشاروں، گلزاروں اور زعفران زاروں میں کچھ نئے ادیبوں، شاعروں کے ساتھ کھو کر رہ گیا۔ اس وقت وہاں کا ماحول خوشگوار اور امن و امان بھرا تھا۔ وادیٔ کشمیر پر واقعی جنت کا گماں ہوتا تھا۔

نور شاہ سے میری ملاقات ۲۰۱۵ء میں ہوئی۔ ایس پی کالج سرینگر میں بک فیئر کے موقع پر میں نے انہیں دور سے دیکھ کر پہچان لیا۔ قریب جا کر اپنا تعارف کرایا اور وفور جذبات میں انکے گلے لگ گیا۔ ان سے ملنے کی میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی وہ جسے میں نے اپنے تصور کی آنکھوں سے بارہا دیکھا تھا میرے سامنے تھا۔ میں خوش ہو رہا تھا۔ حالانکہ چالیس سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ بک فیئر کی تقریب محترم پروفیسر حامدی کاشمیری کی صدارت میں تھی۔ حامدی صاحب اور نور شاہ وادی کے دو ایسے قلمکار ہیں جن کے حصے میں طویل ادبی مسافت آئی ہے۔ ایک لمبے عرصے سے دونوں حضرات اردو زبان و ادب کی بے پایاں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حامدی صاحب کا رجحان افسانوں سے زیادہ شاعری اور تنقید کی طرف ہو گیا۔ نور شاہ نے افسانے، ڈرامے، ترجمے، فلمی فیچر، ناول، ناولٹ اور افسانچوں پر توجہ دی۔ ان کے افسانوی مجموعے بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، ایک رات کی ملکہ، من کا آنگن اداس اداس، گیلے پتھروں کی مہک، بے ثمر سچ، آسمان پھول اور لہو، کشمیر کہانی کے عنوان سے شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ پروفیسر حامدی صاحب نے اظہار خیال فرمایا "یہ بات باعث طمانیت ہے کہ ریاست میں نور شاہ اہم افسانہ نگار ہیں جو تجزیہ پسندی اور جدت کاری کو بروئے کار لاتے ہیں۔" ...... معتبر افسانہ نگار دیپک بدکی نے کہا۔ نور شاہ ایسے تخلیق کار ہیں جو اپنے دل میں پون صدی کے تغیرات، انقلابات، قوم کا المیہ، اپنوں نے بچھڑنے کا غم اور انسان کا درد و کرب لئے ہمیں آج بھی اپنے رومانی افسانوں، دلفریب خاکوں اور پارینہ روزناچوں سے محظوظ کر رہے ہیں۔"

ادبی حلقوں میں نور شاہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ میں نے جب افسانہ نگاری شروع کی تو نور شاہ صاحب کے طرزِ اسلوب سے متاثر تھا۔ اس لئے انہیں کے انداز میں لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میری فکر، میرے جذبات، نظریات، خیالات بڑی حد تک ان سے مشابہت رکھتے تھے۔ مجھے احساس ہے کہ میں غائبانہ طور پر نور شاہ کے فن کی انگلی تھامے بہت دور

تک چلا تھا۔یعنی انہیں کا انداز، انہیں کا لب ولہجہ اختیار کیا تھا۔

نور شاہ کی ادبی مسافت نے انہیں نت نئے تجربوں سے روشناس کرایا ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے لئے بگڑتے سماج سے زیادہ تر مواد حاصل کیا ہے۔آس پاس پھیلی برائیوں سے پیدا شدہ اضطراب، انتشار، خود غرضی اور بے حسی کو اپنی کہانیوں کا محور بنایا۔ظاہر ہے ایک سچا فنکار سب کچھ دیکھتے ہوئے آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر ان دیکھی نہیں کر سکتا۔بھلے ہی اس کے قلم کو گستاخ کا نام دیا جائے۔نور شاہ ایسے ماحول کے پروردہ ہیں جہاں سیدھے سادے لوگ ٹیڑھے میڑھے راستوں کا انتخاب کرتے ہیں اور اوبڑ کھابڑ زمین پر اپنی پریشانیاں کندھوں پر اٹھائے دوڑتے رہتے ہیں۔نور شاہ نے انہیں دیکھا ہے۔ان کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے لیکن یہ معصوم لوگ شاید اشاروں کی زبان نہیں سمجھتے۔

نور شاہ نے جو کچھ لکھا، جس انداز میں لکھا، ان کا اپنا ہے۔کسی سے مستعار لیا ہوا نہیں انہوں نے اپنی فکری اڑان سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔مجھے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کا موقع نہیں مل سکا لیکن ان کی کم گوئی، متانت اور مخلصانہ رویے سے جو تصویر بنی وہ برسوں پہلے ذہن میں چسپاں شبیہہ سے ہو بہو میل کھاتی ہے۔نور شاہ صاحب کے فن پاروں پر ہمارے نقادوں نے خاطر خواہ قلم نہیں اٹھایا یا پھر یوں کہا جائے کہ جتنا لکھنا چاہیئے تھا، نہیں لکھا گیا (شاید ادب میں بھی سیاست در آئی ہے اور فنکار ٹولیوں میں بٹ چکا ہے۔سیاسی بساند اصاف محسوس کی جاسکتی ہے)۔نور شاہ نے اس کی پرواہ بھی نہیں کی۔ بیشتر خوددار ادیبوں کی طرح وہ خاموشی سے اردو ادب کی خدمت گاری میں اپنے شب و روز صرف کر رہے ہیں۔انہیں اردو ادب سے لگاؤ ہے۔اردو زبان سے محبت ہے۔انہوں نے افسانوی ادب میں جو رنگ بکھیرے ہیں وہ آنے والی نسلوں تک پھیکے نہیں پڑیں گے۔ساٹھ برسوں کی لمبی مسافت ہی ان کا وادی اور وادی سے باہر سرخروئی کے ساتھ مقام و مرتبہ قائم رکھے گی۔یہ میرا یقین ہے۔



● ...... ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

نورشاہ۔ اردوافسانے کے سرخیل

ریاست جموں وکشمیر میں جب بھی اردو افسانے کی تاریخ لکھی جائے گی تو نورشاہ جیسے کہنہ مشق اور ہمہ جہت فکشن نگار کا خصوصی ذکر کئے بغیر وہ نامکمل رہے گی۔ پروفیسر حامدی کاشمیری اور نورشاہ وادیٔ کشمیر میں اردو افسانے کے چنار وشہسوار ہیں۔

نورشاہ نے اپنی پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں صرف کردی ہے۔ دراصل جب ایک باذوق قلمکار کثیر مطالعے، گہرے مشاہدے اور عملی مشق کا عمل جاری رکھتا ہے تو اس کی تخلیق کاری میں وہ تمام عوامل ایک تدریجی ارتقا کے ساتھ معرض وجود میں آجاتے ہیں جو اس کی تخلیق کو مقام ارفع تک پہنچاتے ہیں۔ نورشاہ کے ادبی فن پاروں میں زبان و بیان کی سحر انگیزی، موضوعاتی تنوع، فنی لوازمات کی کارفرمائی، نفسیاتی وجنسی الجھنوں اور کجرویوں کا بے باکانہ اظہار دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کشمیر کی تہذیب وثقافت اور ان تمام دلکش وروح افزا مقامات کی بھی کہیں کہیں منظر کشی کی ہے جنہیں دیکھنے کے لئے دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ کشمیر آتے ہیں لیکن اس بات میں کوئی بھی مبالغہ نہیں ہے کہ نورشاہ کے افسانوں میں جمالیاتی، نفسیاتی اور جنسیاتی مسائل ومعاملات کی پیش کش بڑے عمدہ طور وطرز سے در آئی ہے۔ بقول پروفیسر شکیل الرحمٰن:

''حسن کے احساس میں جو تازگی ہے۔ اس کا لطف ہی دیگر ہے۔ نورشاہ کا احساس جمال کشمیر کے رنگ ونور کی دین ہے۔ حسن کا مشاہدہ کرنا اور پھر حسن میں ڈوبتے جانا تخلیقی ذہن کا

وہ کارنامہ ہے جو برسوں کی لذت عطا کرتا ہے۔ یہاں کشمیری نمکین چائے کا لطف وہی لے سکتے ہیں جو چائے کے رنگ اور اس کی لذت سے کبھی آشنا ہوں۔ نور شاہ کی عمدہ فنکاری کا ثبوت وہاں بھی ملتا ہے جہاں وہ جسم کی تشنگی کا نقش احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔"

(ذکر نور شاہ کی نئی کہانیوں کا۔ مشمولہ۔ ماہنامہ "لفظ لفظ" مدیر۔ زاہد مختار۔ سرینگر کشمیر۔ ص ۴۴)

نور شاہ کے افسانوں میں موضوعاتی بوقلمونی اور زبان و بیان کی حسن کاری ایک سنجیدہ قاری کو روحانی حظ اور ذہنی بالیدگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کسی وقوع پذیر سماجی، سیاسی، معاشی، نفسیاتی، جنسی اور مذہبی واقعے کو فنی لوازمات کے ساتھ کہانی بند کرنا آسان نہیں ہوتا۔ کہانی میں معمولی سا بھی جھول پیدا ہو جائے تو کہانی کہانی نہیں رہتی لیکن نور شاہ کی برس ہا برس کی محنت و ریاضت کے سبب ان کی کہانیاں فنی اعتبار سے بھی خاصی جاندار معلوم ہوتی ہیں۔ اس فنی و فکری ارتکاز کی رو سے اگر یہ کہا جائے کہ نور شاہ کے افسانے زندگی رنگ افسانے ہیں۔ جن میں ادبی چاشنی اور تخلیقی شعور کی نورانیت موجود ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ میرے لئے یہاں یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ نور شاہ کی افسانوی کائنات سے ماخوذ چند افسانوں کے اقتباسات بطور نمونہ پیش کروں تا کہ قارئین بذات خود نور شاہ کی تخلیقی ذہنیت اور ان کی زبان و بیان پہ دسترس کو نہ صرف بہتر طور پر سمجھ سکیں بلکہ لطف اندوز بھی ہوں۔ اس سلسلے میں "خوشبو کا سفر" "رات کا سورج" "اس کی گلی کا پاپ" "لکیریں" "زمین کھولے گی زبان اپنی" "ایک لمحے کی جنت" "ہیلنگ ٹچ" "بے ثمر سچ" "اندھیرے اجالے" "علیا اور بلبل" "مرغابی" "بٹوت کی آخری رات" "تتلی" اور "آسمان، پھول اور لہو" پیش کئے جا سکتے ہیں۔

افسانہ "خوشبو کا سفر" میں نور شاہ نے جہاں وادیٔ کشمیر کے ایک دلکش سیاحتی مقام گلمرگ کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے تو وہیں اس افسانے میں غلام محمد جیسے شخص کا ذکر بھی آیا ہے کہ جو اپنی گھوڑی پر آج تک کتنی ہی عورتوں کو سواری کروا چکا ہے۔ وہ تیس سال سے یہ کام کر رہا ہے۔ اس لئے اسے بھانت بھانت کی عورتوں کو بہت قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملا

ہے۔ لیکن گوری نام کی میم صاحبہ کا نیم عریاں وجود غلام محمد کو خیالوں ہی خیالوں میں ایک حسین جہاں میں پہنچا دیتا ہے۔ نور شاہ نے اس افسانے میں فطری مقامات کی خوبصورتی میں نسوانی حسن کی دلکشی کو بیان کیا ہے۔ مثلاً مذکورہ افسانے کے مرکزی کردار غلام محمد کے ذاتی تجربے کو انہوں نے ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کروایا ہے۔

''اپنی تیس سالہ زندگی میں مجھے تین چیزوں سے لگاؤ رہا ہے۔ گلمرگ کی ہریالی، بلبل کی خوبصورتی اور جوان عورتوں کے جسم۔ لیکن جب میں نے گوری میم صاحب کو دیکھا تو اپنے وجود کو ہی بھول بیٹھا۔ اسے دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ دھرتی مدتوں سے اس کے قدموں سے دھڑکتی رہی ہے۔ وہ مجھ سے چند قدم آگے جا رہی تھی بلبل کی لگام تھامے۔ اس کی کمر کا خم نمایاں تھا۔ کولہوں کا ابھار چلنے کے انداز سے متحرک تھا۔ وہ ایک مجسمہ تھی اور مجسمہ ہر لحاظ ہر زاویے سے مکمل تھا۔''

نور شاہ کا سماجی مطالعہ و مشاہدہ نہایت گہرا اور باریک بینی سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے جنس کو انسان کی بہت بڑی کمزوری قرار دیا ہے۔ افسانہ ''اس کی گلی کا پاپ'' اسی سلسلے کا ایک مایوس کن رخ ہے جس میں انہوں نے ایک دوشیزہ زیب اور اشفاق کی باہمی محبت کو ارتکاب گناہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ کس طرح اشفاق زیب پر فریفتہ ہوتا ہے اور وہ ایک ناجائز اولاد کو جنم دیتی ہے۔ وہ بدنامی کے داغ سے بچنے کے لئے اپنے نوزائدہ بچے کو ایک گلی میں بے سرو سامانی کی حالت چھوڑ دیتی ہے۔ اسی افسانے میں آصف اور حاجی صاحب کا ذکر افسانے میں کچھ ایسے موڑ پیدا کرتا ہے جو قاری کو نئی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ نور شاہ نے اس افسانہ میں اپنی فنی بصیرت کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ قابلِ ملاحظہ ہے:

''زیب میرے قریب آئی۔ پھر ہم دونوں قریب آئے۔ خیالوں میں شہنائیاں بابل کے گیت گاتی رہیں۔ سکھیاں ہاتھوں میں مہندی رچاتی رہیں۔ سرخ جوڑے پہناتی رہیں اور شام کی تنہائی میں زیب کی زندگی پر پڑی ہر نقاب کو الٹتا چلا گیا۔ پھول میں جب تک آخری جھونکا رہتا

ہے۔ بھونرا اس کے ارد گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ شمع کی آخری لو تک پتنگا ارد گرد گھومتا رہتا ہے۔ میں نے بھونرا بن کر زیب کی زندگی کا آخری سانس بھی اپنی سانسوں میں اتار لیا۔ اس کا سارا رس نچوڑ لیا۔ میں خود جل کر راکھ بن چکا تھا۔ بے خود بن چکا تھا اور زیب ماں بن چکی تھی۔“

عموماً ہمارے سماج میں پیار، محبت، عشق اور چاہت کی جذباتی دنیا کے کھیل تماشے اس طرح کے بھیانک اور مایوس کن حالات وواقعات کا باعث بنتے ہیں جس کی طرف نور شاہ نے بڑے ہنرمندانہ انداز میں اشارے کئے ہیں۔

افسانہ ”لکیریں“ انتہائی المناک صورتحال کی عکاسی کرتا ہے۔ وادیٔ کشمیر میں پھیلی دہشت گردی اور اس کی روک تھام میں فوجی دستوں اور میلی ٹنٹوں کے درمیان تصادم میں ایک معصوم اسکولی بچے کی ہلاکت کو جس پیرائے میں افسانہ نگار نے ایک چشم دید گواہ کے طور پر پیش کیا ہے وہ خون کی آنسو کی لانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے یہ فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ اس انتشار زدہ ماحول کی بھیانک صورتحال کے محرک یا ذمہ دار آخر کون لوگ ہیں؟ اسی افسانے میں نور شاہ نے ان تمام تشدد پسند عناصر پر اشاروں کنایوں کے ساتھ ساتھ طنز ورمز کی تیز کلہاڑی چلائی ہے۔ جو محض اپنی شکم پروری کی خاطر جائز وناجائز میں تمیز نہیں کرتے اس سلسلے میں مذکورہ افسانے سے ماخوذ یہ اقتباس قابلِ توجہ ہے۔

”میری نگاہوں کے سامنے وقت کا تیز لاوا بہا اور بے سبب جم گیا۔ ایک چہرہ میرے سامنے تھا۔ دودھیا رنگ سے بھرے بھرے بے رنگ سادے ہونٹ، چھوٹی سی ناک اور اس چہرے میں پوشیدہ معصومیت، پاکیزگی اور تقدس۔ وہ بچہ جس نے نہ دنیا دیکھی تھی اور نہ ہی دنیا داری۔ کراس فائرنگ میں اپنی جان کھو چکا تھا۔ اس کی کتابوں سے بھرا بستہ چھلنی ہو چکا تھا اور کتابیں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔ ان کتابوں میں پوشیدہ علم سرخ خون کا روپ اپنا کر سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔ جیسے علم نہ ہو۔ سڑک پر پڑا گندگی کا ڈھیر ہو۔ میں نے ڈرڈر کر معصوم سی بے جان زندگی کو چھونے کی کوشش کی۔ اس کی جان، اس کی زندگی جانے کس کی اور کس کی طرف سے آنے

والی بندوق کی گولی کی نذر ہو چکی تھی...... کیا مارنے والا کوئی نقاب پوش تھا یا وردی پوش یا مٹھی بھر سیاسی دنیا کو سجانے والا کوئی کھدر پوش...... کوئی تو تھا۔''

افسانہ ''زمیں کھولے گی زبان اپنی'' کا تعلق احساسِ جرم یا احساس گناہ سے ہے۔ وشال اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔قومی شاہراؤں اور چھوٹے بڑے شہروں میں ہر روز کوئی نہ کوئی جانی حادثہ سڑک پار کرتے واقع ہوتا ہے۔کئی ڈرائیور لوگ تیز رفتاری اور غیر ضابطگی کی وجہ سے جانوروں اور انسانوں کو روندتے ہوئے فرار ہو جاتے ہیں۔وشال سے بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔وشال کی گاڑی کے نیچے ایک نوجوان کچلا جاتا ہے اور وہ موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گاڑی بڑی تیز رفتاری سے بہت دور لے جاتا ہے۔پولیس کی پوری تحقیقات کے باوجود ملزم گرفت میں نہیں آتا ہے لیکن ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود وشال کو رات بھر اس کچلے ہوئے نوجوان کی شکل وصورت خوابوں اور خیالوں میں ڈراتی ہے اور وہ پریشانی وگھبراہٹ کے عالم میں بالآخر اپنے آپ کو پولیس کے سپرد کر کے اقرار جرم کرتا ہے۔زیر نظر افسانے میں نور شاہ قاری کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ انسان کا ضمیر اس کے اچھے برے اعمال پہ جھنجھوڑتا ضرور ہے۔

افسانہ ''ایک لمحے کی جنت'' میں کسی حد تک ابہامیت پیدا ہو گئی ہے۔اس افسانے میں ایک ہیڈ ماسٹر کی روداد ہے جو کنوارے پن میں خوبصورت طالب علموں کو ٹیوشن پڑھانے میں ذہانت کے بدلے خوبصورت ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔دینا ناتھ جو دینو کے نام سے مشہور ہے۔ ماسٹر جی کا چپراسی ہے جو ماسٹر جی کی تمام حرکاتِ خبیثہ سے بہت حد تک واقف ہے۔مالا نام کی لڑکی کا کردار افسانے کے نصف آخر میں آتا ہے جو اپنے بھائی کو ماسٹر جی کے پاس ٹیویشن پڑھانے لاتی ہے اور ماسٹر جی راضی ہو جاتے ہیں۔اس افسانے کی قرأت اشاروں ہی اشاروں میں اس امر کو نشان زد کرتی ہے۔کہ معمار قوم (ٹیچر) آج کے سماج میں اپنا مقام ومرتبہ کس حد تک کھو چکا ہے۔مذکورہ افسانے میں بھی نور شاہ نے اپنی زبان کا جادو کچھ اس طرح جگایا ہے۔

''دیکھئے۔لڑکی بے حد حسین ہو، کنول کے پھولوں جیسا گلاب چہرہ ہو، آنکھوں میں

بے حد مستی ہو، آواز میں مٹھاس اور باتیں کرتے سمے پلکیں خود بخود جھک جاتی ہوں۔ تو کیا بے کیف و بے رنگ زندگی میں محبت کی ایک ہلکی سی حرارت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا۔ میں اپنی ہی بات کرتا ہوں۔ یوں تو میرا نام دینا ناتھ ہے لیکن سب ہی مجھے دینو کہتے ہیں۔ میری عمر شاید 22 برس کی ہے۔ شاید اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے خود یاد نہیں کہ میں کب کہاں اور کس کے یہاں پیدا ہوا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور میرے ناپختہ شعور میں کچھ سمجھنے اور کچھ پہنچاننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ماسٹر کے گھر میں پایا۔ یہ تو بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مجھے ایک ایسے گھر میں ایک عورت نے جنم دیا جس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری ماں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میرا باپ کون ہے۔ چار سال کی عمر تک تو وہ مجھے گھر گھر گھوماتی رہی اور پھر ایک شام فاقوں سے تنگ آ کر اور طعنوں کی تاب نہ سہہ کر مجھے ماسٹر جی کے دروازے پر چھوڑ گئی اور خود نہ جانے کہاں چلی گئی۔"

مذکورہ افسانے سے ماخوذ مندرجہ بالا اقتباس جہاں ایک دوشیزہ کے حسن و جمال اور اس کے پرکشش پہلوؤں کا تصور ایک حسین پیکر میں قاری کے ذہن و دل میں ہلچل سی پیدا کر دیتا ہے۔ تو وہیں دوسری جانب معاشرتی خرابیوں پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ حرام کاری اور حرام خوری کے لئے کس طرح کے حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔ نور شاہ کا افسانوی اسلوب بغیر کسی مبلغانہ انداز کے سماجی حقائق اور مسموم ماحول پر گرفت کرتا معلوم ہوتا ہے۔

افسانہ "ہیلنگ ٹچ" کی فضا اور ماحول حزنیہ کیفیت لئے ہوئے قاری کے ذہن و دل پہ ایک گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ مفتی محمد سعید مرحوم (سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر) نے ۲۰۰۳ء میں اپنے دور اقتدار میں ہیلنگ ٹچ نام کی ایک پالیسی بنائی تھی جس کے تحت وہ ملی ٹنسی سے متاثرہ کنبوں کو نوکری اور دوسری سہولیات دلانے کے خواہش مند تھے۔ نور شاہ کے تخلیقی ذہن نے اس پالیسی کو موضوع بناتے ہوئے کئی سماجی، سیاسی اور استحصالی ہتھکنڈوں پر چوٹ کی ہے۔ زیر نظر افسانے میں ایک گمنام شخص کی زبانی پوری کہانی بیان کروائی ہے جو والدین سے محروم تین بہنوں

کا اکلوتا بھائی ہے۔ والدین کے گزر جانے کی وجہ سے اسے اپنی تعلیم مکمل کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ تین بہنوں کی بہتر تعلیم و تربیت ان کی نوکری اور شادی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے نحیف کندھوں پہ آن پڑتا ہے۔ آمنہ اس کی چھوٹی بہن ہے جو انگریزی ادب میں ایم اے، بی ایڈ ہے۔ لیکن نوکری کی تلاش میں دردر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد تھک ہار کے بیٹھ جاتی ہے۔ ایک روز اس کی ملاقات بظاہر ایک شریف اور معزز لیکن بباطن شیطان نما آدمی سے ہو جاتی ہے جو اسے نوکری کا جھانسہ دے کر اس کی عزت و عصمت لوٹنا چاہتا ہے لیکن وہ فوراً اس کی حرکات بد سے واقف ہو جاتی ہے اور آگ بگولہ ہو کر اپنے گھر واپس آجاتی ہے۔ اپنے بھائی کے پوچھنے پر وہ کہتی ہے۔

”اتنی جلدی واپس آ گئی تم تو......“

”ہاں بھیا آنا ہی پڑا۔ دراصل اس سماج اس سوسائٹی میں ایک بے بس اور مجبور عورت کے لئے کوئی عزت۔ کوئی وقار نہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ تم ٹھیک ہونا“

”بھیا اس سے پہلے کہ وہ شریف اور مہذب انسان اپنے نقلی چہرے سے نقاب سرکاتا اور ذلالت پر اتر آتا۔ میں نے اپنی سینڈل سے اس کا اصلی چہرہ لہولہان کر دیا اور وہاں سے چلی آئی۔ میں ٹھیک ہوں بھیا۔ بالکل ٹھیک......“ یہ کہتے ہوئے حیا کی سرخی اس کے چہرے پر تیر رہی تھی۔“

زیر نظر افسانے میں آگے چل کر ایک بھائی بہن کی ملازمت کی خاطر ملی ٹینٹوں یا پھر فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بنتا ہے اور اس طرح افسانہ اپنے اختتامی مرحلے میں المناک تاثر چھوڑ دیتا ہے۔ نور شاہ نے اسی افسانے کے حوالے سے جہاں کشمیر میں پھیلی فوجی آمریت اور جہاد کے نام پہ فساد کی وارداتیں پیش کی ہیں تو وہیں عظمت انسانیت کو اُجاگر کرتے ہوئے مقدس رشتوں کی بحالی پر زور دیا ہے۔ انہوں نے افسانوی انداز میں ان تمام سیاسی و سماجی خرابیوں کو بھی

موضوع بنایا ہے جن کی وجہ سے ایک پرامن ماحول خواب وخیال ہو کر رہ گیا ہے۔

نور شاہ کے بہت سے افسانوں میں فطری مناظر کے جمال و کمال کے ساتھ ساتھ کئی جمالیاتی و جنسی معاملات و واقعات کی منظر نگاری بھی اتنی دلچسپ اور ادبی لطافت کی حامل ہے کہ بعض موقعوں پہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ نثر میں شاعری کر رہے ہوں۔ افسانہ ''بے ثمر سچ'' اسی قبیل کا افسانہ ہے جس میں جنس مخالف کا جنسی میلان روح اور جسم کی سرحدوں کو نہیں پھلانگ پاتا ہے۔ واحد متکلم میں یہ افسانہ بیان اور بیانیہ کی کئی تہیں کھولتا ہے۔ شیتل نام کی پرائی عورت کا حسن و جمال۔ بے نام مرد کا غسل خانے کی جانب بڑھنا اور وہاں ایک جوان بے قرار نسائی وجود کا دیدار قاری کو ایک مخصوص و عجیب واقعاتی لمحے سے آشنا کراتا ہے۔ افسانہ نگار نے جس نازک اور پر کیف صورت حال کو سامنے لایا ہے اس میں ان کی بے باکی اور حقیقت شناسی کمال درجے کی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً مذکورہ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے......

''شیتل اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑی ہے۔ میری طرف دیکھتی ہے اور ایک ان دیکھی سی مسکراہٹ لئے اپنی خواب گاہ میں چلی جاتی ہے۔ مکان کے آس پاس خاموشی ہے۔ اس خاموشی میں بھی اک شور ہے جو میرے انگ انگ میں حرارت پیدا کر رہا ہے۔ میں پہلے اپنے کمرے کی اور پھر اپنے ذہن کی کھڑکی بند کر لیتا ہوں اور بے آواز قدموں سے شیتل کے مکان کے برآمدے کو پار کر کے اس کی خواب گاہ میں چلا جاتا ہوں۔ کمرہ خالی ہے لیکن کسی جوان جسم کی خوشبو بکھری بکھری سی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی صدا کوئی آواز نہیں۔ ہاں صرف خواب گاہ کے ساتھ والے غسل خانے میں مدھم مدھم سی روشنی پھوٹتی نظر آ رہی ہے۔ دفعتاً گزرتے ہوئے وقتوں کا ایک رس بھرا لمحہ میرے وجود کی اندھیر نگری میں ایک پل بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور میں اپنی آنکھیں بند کر کے غسل خانے کی جانب سرکنے لگتا ہوں۔ یہاں ایک سراپا ہے۔ ایک روپ۔ ایک جسم...... جوان اور بے قرار۔ لیکن اپنی آنکھیں بند کرنے سے پہلے سے ہی میں ٹھٹک کر رہ جاتا ہوں۔''

جیسا کہ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ نور شاہ کے بیشتر افسانوں میں کشمیری تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کشمیر کے وہ خوب صورت مقامات کہ جنہیں دیکھنے کے لئے ہر سال لاکھوں سیاح دنیا کے ہر ملک سے یہاں آتے ہیں۔ نور شاہ کے افسانوں میں ان تمام دلکش مقامات کی منظر کشی پوری جزئیات کے ساتھ در آئی ہے۔ دراصل ایک شاعر و ادیب جس ماحول و معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے۔ پلتا بڑھتا اور شعور و ادراک کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اس پورے ماحول کا جغرافیہ شعوری و لاشعوری طور پر اس کی ادبی زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اپنے وطن کی مٹی اس کے پھل پھول اور قدرتی مناظر اسے بہت پیارے لگتے ہیں۔ وہ دنیا کے کسی کونے میں کیوں نہ جائے مگر انہیں بھلائے نہیں بھول پاتا ہے۔ نور شاہ کو اپنے وطن وادی کشمیر کے ہر شجر و حجر، کوہ و دریا، بیابانوں، آبشاروں اور نظاروں سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کے بہت سے افسانے کشمیری تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ ''اندھیرے اجالے'' سے ماخوذ یہ اقتباس بطور مثال قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے کہ جس میں نور شاہ نے کشمیر کی تاریخ کو سمیٹا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو......

''کشمیر کی ہر چیز قابل تعریف۔ ہری بھری شاداب وادی، سندر دھرتی، بھانت بھانت کے لوگ، پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جہاں بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے سبز ہے۔ یہاں پھولوں سے جڑی مرگیں ہیں۔ رنگ برنگے پھولوں سے سجے سنورے تختے ہیں جن کی خوشبو میں سیاحوں اور یاتریوں کی سانسیں رچی بسی ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام، یہ شالیمار ہے۔ یہ نشاط ہے نور جہاں کے خوابوں کا باغ، جہانگیر کی جوانی کی یادگار، یہ ڈل جھیل ہے۔ اس پر چلتی پھرتی ننھی ننھی کشتیاں اور دلہن کی طرح سجے سنورے ہاوس بوٹ۔ یہاں لدر نالہ ہے جس کا پانی پتھروں سے سر پھوڑتا جھاگ ہوا جاتا ہے۔''

پورے اقتباس میں نور شاہ نے لفظی پیکروں میں اپنے وطنِ عزیز کا جو منظر پیش کیا ہے

وہ دل کو موہ لینے والا ہے۔ میں یہاں یہ بات کہے بغیر آگے نہیں بڑھوں گا کہ جس نے جنتِ نظر وادیٔ کشمیر کو ابھی تک نہیں دیکھا ہو۔اسے نور شاہ کے افسانوں بالخصوص ''اندھیرے اجالے''، ''علیا اور بلبل''، ''بٹوت کی ایک شام''، ''تتلی'' میرے حصے کے خواب'' اور ایک کہانی کے تین باب'' کو بطور خاص پڑھنا چاہیئے۔

نور شاہ کے افسانوں سے متعلق یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آمدہ حالات و واقعات اور اس کے دکھ درد اور مسرت و بصیرت کو افسانوی انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ لگتا ہے، ہم انسانی فطرت اور خارجی واقعات کے ساتھ مکالمہ کر رہے ہیں۔ یہ ہنرمندی اس بات کی دلیل ہے کہ نور شاہ کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔انہوں نے نہ صرف ناول اور افسانے لکھے ہیں بلکہ بہت سے افسانچے بھی لکھے ہیں جن میں دلچسپی اور دانشوری کا عنصر موجود ہے۔۲۰۱۴ء میں کشمیر میں سیلاب کی بھیانک صورتِ حال کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، محسوس کیا اور اسے اپنی تخلیقی ذہنیت کا حصہ بنایا۔ بڑھتی عمر کے باوجود نور شاہ کا افسانوی سفر برابر جاری ہے۔علم و ادب کے جنونِ عشق میں انہیں تھکان محسوس نہیں ہوتی ۔ دراصل ایک سچے اور اچھے قلم کار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو نئی منزلوں اور نئے آفاق کا پتہ دیتا ہے ۔اپنے تخلیقی شعور و ادراک کے ذریعے وہ آپ بیتی اور جگ بیتی کے نئے نئے جہاں آباد کرتا ہے۔ یہاں اس بات کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ نور شاہ کے افسانوی فن پر بھی اظہار خیال کیا جائے۔ تخلیقی فن پارہ فنی لوازمات کا متقاضی ہوتا ہے۔افسانے میں پلاٹ، کردار نگاری و مکالمہ نگاری، منظر نگاری، ماحول و فضا اور وحدت تاثر کے علاوہ زبان و بیان یہ تمام عناصر و عوامل اپنی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔نور شاہ کے یہاں کہیں تو منظر نگاری سے کہانی شروع ہوتی ہے اور کہیں ڈرامائی اسلوب میں کردار کو متعارف کرواتے ہیں۔اسی طرح تحیر و تجسس کا بھی وہ خاص خیال رکھتے ہیں یعنی واقعے کی پیشکش میں ایک منطقی ربط قائم کرتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھتے ہیں کہ قاری کو افسانے کے اختتام تک مضطرب رکھا جائے اور آخری جملے پر

وہ چونک جائے۔ اسی طرح ان کے افسانوں کے کردار ہمارے آپ کے ماحول سے تعلق رکھتے معلوم ہوتے ہیں جو حالات کے جبر اور مسائل کے انبوہ میں زندگی کرتے ہیں۔ نور شاہ کا تازہ افسانوی مجموعہ ''کیسا ہے یہ جنون'' اس بات کا مظہر ہے کہ وہ فن افسانہ نگاری سے کماحقہٗ واقف ہیں اور بہت حد تک انہوں نے راست بیانیہ کو ہی اہمیت دی ہے۔ وہ اپنے قاری کو افسانے کے ذریعے پہلیلیاں بھجوانے کا کام نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے اسلوبِ بیان میں دقیق، بوجھل الفاظ و تراکیب اور غیر مانوس علامتوں، استعاروں، تشبیہوں اور ابہامیت کا عمل دخل پایا جاتا ہے بلکہ وہ تو اپنے تجربات و مشاہدات اور حیات و کائنات میں وقوع پذیر واقعات کو سیدھے سادھے جملوں اور خالص افسانوی زبان کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ نور شاہ کی مقبولیت کا راز اسی بات میں مضمر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

..........●●● ....

●...... راجہ نذر بونیاری

نصف صدی کا گواہ......نور شاہ

بیسویں صدی کے وسطی دور میں اُردو کے نثری ادب میں افسانے یا کہانی کو عام اور غیر متوقع قبولیت حاصل ہوئی۔ اگر منشی پریم چند اس زمانے میں بقید حیات ہوتے تو انہیں بھی یقین نہ آتا۔ پریم چند نے افسانہ نگاری کو حقیقت نگاری بنا دیا تھا اور یہ اعزاز اس فن کو کسی اور زبان میں حاصل نہ تھا۔ گزشتہ ۷۰ سالوں میں افسانہ اپنے آرٹ، تکنیک اور تھیم کے اعتبار سے کئی مراحل سے گزرا ہے۔ اس درمیان افسانہ پھیلاؤ اور گہرائی میں پریم چند سے بہت آگے بڑھا ہے۔ اس کا تھیم زیادہ سنجیدہ، گمبھیر، زیادہ آفاقی اور کائناتی اور فکر و خیال زیادہ بھاری بھر کم اور تہہ دار ہوا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں اینٹی (Anti) لفظ کا چلن عام ہوا ہے۔ اسٹوری کی جگہ اینٹی اسٹوری نے لے لی ہے اور اینٹی ناول بھی لکھا جانے لگا۔ بعض ناقدین ادب نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ کہانی سے ہیرو کا جنازہ نکل چکا ہے اور یہ زمانہ اب صرف اینٹی ہیرو کا ہے۔ لیکن آج بھی ایک اچھی کہانی کی پہچان نہ تہذیبی فضاء میں ہے نہ کردار کے بیان میں نہ سمبالک (علامتی) Symbolic طرز میں بلکہ اچھی کہانی وہ ہے جو اپنے لکھنے والے کے اندر ابھری ہو اور اس میں اس کا دور اُس کے اردگرد کی پوری زندگی بولتی ہو۔

کہانی اور کہانی کار کے درمیان ایک کھرا رشتہ ہوتا ہے اور یہی رشتہ ہمیں برصغیر میں اُردو کے ایک معروف افسانہ نگار نور شاہ کی تخلیقات میں ملتا ہے۔

نور شاہ نے میرے تخمینے کے مطابق کم سے کم تین سو کہانیاں اور ۵۰ سے ۶۰ ڈرامے

تحریر کئے۔نور شاہ اور اُردو افسانے میں بھی محض تیس سال کا فرق ہے۔یعنی جب اردو افسانہ عالم شباب میں قدم رکھ رہا تھا نور شاہ جوان ہو چکا تھا۔ پتہ نہیں کیوں انہوں نے شاہدہ شریں کے فرضی نام سے لکھنا شروع کیا۔شاید خود کسی رومانی کہانی کا کردار بننا چاہتے تھے اور اپنی اس کوشش میں وہ بغیر محنت کے کامیاب ہو گئے۔

انہوں نے جہاں تک میری یادداشت کا سوال ہے ''نلنی'' کے تحت ایک رومانی کہانی لکھی جو فلمی وادبی ماہنامہ ''شمع'' نئی دہلی کے جنوری ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شاہدہ شریں کے نام سے شائع ہوئی اور یہ شمارہ آج تک میرے پاس موجود ہے اور اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ یہ ایک مختصر افسانہ تھا جو دو ہی صفحات میں مکمل تھا۔ بعد میں یہ افسانہ انہوں نے اپنے افسانوی مجموعے میں شامل کر لیا۔

نور شاہ پچاس کی دہائی سے من چلے اور من جلے قارئین کے دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے اور بہت سے دل پھینک قسم کے قارئین نے انہیں ان کی کہانیوں کو صرف اس لئے پسند کیا اور دل کھول کر داد دی کیونکہ وہ اس وقت نور شاہ نہیں بلکہ شاہدہ شریں تھے اور انہوں نے ''شاہدہ شریں'' کے نام خطوط میں اپنے دل تحفے کے طور بھیجے۔نور شاہ کو ان خطوط سے مزید لکھنے کی تحریک ملی کیونکہ انہیں اسے پلاٹ اور کردار بے تحاشہ مل رہے تھے جنہیں انہوں نے خود اپنے قلم سے تراشا تھا اور جو اُن کی اپنی ''ایجاد'' تھے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیر کے ادبی افق پر جو سورج چمک رہا تھا وہ پریم ناتھ پردیسی تھا۔ بقول راجندر سنگھ بیدی پردیسی کے افسانوں کے مجموعوں ''شام وسحر'' اور ''دنیا ہماری'' میں شامل افسانے سادگی اور معصومیت کی بنا پر لیوٹالسٹائی کی یاد دلاتے ہیں۔ پردیسی کے معاصرین میں پریم ناتھ در، شیام لال ائمہ، اسیر کاشمیری، کوثر سیمابی، صاحب زادہ محمد عمر، نورالٰہی، نندلال بے غرض اور گلزار فدا کو شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرے دور کے لکھنے والوں میں راما نند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس اور دل کش کاشمیری شامل ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے اردو افسانے کے

ساتھ موہن یاور، ٹھاکر پونچھی، اختر محی الدین اور نور شاہ کے نام وابستہ ہونے کے ناطے نور شاہ کو ریاست میں 'اردو افسانے' کے حوالے سے ایک ایسا مقام حاصل ہے جو اُن کے علاوہ صرف ڈاکٹر حامدی کاشمیری اور پشکر ناتھ بی اے کو حاصل رہا ہے۔ نور شاہ کے معاصرین میں سومناتھ زتشی، علی محمد لون، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، بنسی نردوش، ویدار اہی، ڈاکٹر برج پریمی، ہری کرشن کول، غلام رسول سنتوش، برج کٹیال، زیڈ سیمی، مخمور بدخشی اور رام کمار ابرول شامل ہیں۔

۱۹۶۰۔۱۹۶۵ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے لکھ کر اس صف میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، ان میں کشوری منچندہ، ویریندر پٹواری، کلدیپ رعنا، تیج بہادر بھان، مالک رام آنند، عمر مجید، وحشی سعید، مسعود سامون، آنند لہر، نذر بونیاری، واجدہ تبسم، سوم ناتھ ڈوگرہ، ڈی کے کنول اور انیس ہمدانی شامل ہیں۔ ریاست میں اردو افسانہ نگار باری باری یکے بعد دیگرے قابل افسوس اور نہ سمجھ آنے والے جمود کا شکار ہو گئے لیکن صرف ایک ذات گرامی نور شاہ کی ہے جو نہ تو خود کبھی جمود کا شکار ہوا اور نہ اس کی کہانی۔

نور شاہ بنیادی طور پر ایک شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس قزح کے رنگ سمٹ گئے ہیں۔ نور شاہ کہانی گھڑنے اور اس میں جمالیاتی عنصر شامل کرنے کے گُر سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانی لکھتے ہیں جس سے ان کے افسانوں میں حزن وملال وآلام کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہو گئی ہے۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ ان کے متنوع موضوعات کا ایک حصہ ہے۔ ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے منظر عام پر آ گئے ہیں۔

جون ۱۹۶۸ء کے بیسویں صدی دہلی میں ان کی ایک کہانی ''دوسری ملاقات'' نے مجھے ان کے قریب لایا۔ اُس زمانے میں میری چند کہانیاں ''بیسویں صدی'' میں چھپی تھیں۔ ان کی ایک اور کہانی ''اُلجھے لمحوں کے چہرے'' مطبوعہ نگینہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں سرینگر سے انہیں ملنے جموں پہنچا۔ نور شاہ پیر مٹھا محلے میں کسٹوڈین کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ میں جیوتیشور

پتھک ، مالک رام آنند اور ایک فوجی افسر راہی بے وفا کے ہمراہ اُن کے گھر گیا۔ اُن دنوں جموں میں زبردست ادبی ماحول موجود تھا۔ سرینگر میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری، برج پریمی اور کچھ غیر ریاستی ادباء شعراء جو بسلسلہ ملازمت سرینگر میں مقیم تھے، سرگرم تھے۔ ان میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، کمال احمد صدیقی ، شبیب رضوی، طارق غازی، اسرار احمد آزاد، مونس رضا شامل ہیں۔ یہ حضرات اکثر ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے جہاں ان سے ملاقات رہتی تھی لیکن نور شاہ کو میں نے کبھی کسی ادبی جلسے میں یا پھر ریڈیو، ٹی وی میں نہ دیکھا۔ صرف ان سے ہماری ملاقات صفحاتِ قرطاس کی وساطت سے رہتی تھی۔ کشمیر کی سرزمین پر ہونے والی ادبی کانفرنسوں میں بھی نور شاہ کہیں نظر نہیں آتے تھے، نہ ان کا ذکر خیر ہوتا تھا۔ لیکن مجھے پہلی مرتبہ کرشن چندر سے سونہ وار گیسٹ ہاؤس میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو انہوں نے بلا جھجک کہا کہ وہ خود کبھی کشمیر نہیں آئے لیکن انہوں نے کشمیر کو نور شاہ، حامدی اور ٹھاکر پونچھی کی کہانیوں میں دیکھا ہے۔ عصمت چغتائی نے مظہر امام صاحب کی موجودگی میں بارہمولہ کی ایک ادبی مجلس میں کہا کہ وہ نور شاہ کی کہانیاں پڑھتی ہیں۔ جب پہلی مرتبہ ممبئی گیا تو جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی ان میں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، حسن کمال، نقش لائلپوری، محبوب راہی اور مہندر ناتھ شامل ہیں، سب ادباء نے نور شاہ کا ذکر کیا۔ نور شاہ صرف ایک کہانی کار ہی نہیں وہ ایک طویل کہانی کا عنوان ہے جو گزشتہ ۵۰ سال سے کشمیر کے ادبی اُفق پر لکھا ہے اور تادم تحریر ادبی دنیا کو منور کر رہا ہے۔

............☆☆☆............

● ......سلیم سالک

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

انسان ہمیشہ اپنی یادوں کو سرمایہ سمجھ کر محفوظ رکھنے کی کوشش ازل سے کرتا آیا ہے۔ کیونکہ یادوں کو بیش بہا خزانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ اپنی یادوں کو محفوظ رکھنے کے لئے روزنامچہ یا ڈائری لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، تاکہ غیر معمولی واقعات و حادثات یادداشتی بیاض میں محفوظ رہ سکے۔ چینی محاورہ مشہور ہے کہ اگر بات کو مختصر وقت کے لئے یاد رکھنا ہے تو ذہنی یادداشت پر بھروسہ کرسکتے ہیں لیکن جب بات کو صدیوں تک محفوظ رکھنے کا ارادہ ہو تو اس کو تحریری صورت دینا ناگزیر ہے۔

ڈائری میں مصنف نہ صرف اپنی روزمرہ مصروفیات کا انکشاف کرتا ہے بلکہ اپنی انفرادی شخصیت کی سچی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ ڈائری کی مدد سے ہم مصنف کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے واقف ہوجاتے ہیں جو کہیں اور کسی ذریعہ سے ملنا ناممکن ہوتے ہیں۔ ان سے نفسیاتی مطالعہ میں بڑی مدد ملتی ہے ساتھ ہی تجربات اور معلومات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ عام طور پر ڈائری لکھنے والے کچھ محتاط ہو کر لکھتے ہیں اور بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بے کم و کاست اپنے تاثرات کو صفحہ قرطاس کے حوالے کردیتے ہیں۔ ڈائری کے مطالعہ سے مصنف کے رجحان، ذوق، پسند اور زاویۂ نگاہ سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔

انگریزی زبان میں ڈائری لکھنے کا باقاعدہ آغاز ایولن (Eveln) اور پیپس (Pepys) نے اٹھارویں صدی کے شروع میں کیا۔ انگریزی زبان کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس میں

ڈائری کا سلسلہ بہت دیر تک چلا، جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ اردو میں ڈائری تذکروں کی شکل میں ملتی ہے قدیم شعرأ جب کسی کے متعلق اپنے تاثرات ڈائری میں قلمبند کرتے، تو کچھ باتوں کا خاص اہتمام کرتے جن میں شاعر کے مختصر حالات و کلام پر اپنی ذاتی رائے اور کلام کا مختصر انتخاب ہوتا جو بعد میں ادبی تاریخ رقم کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتے رہے۔ انشاؔ نے باقاعدہ ترکی زبان میں روزنامچہ تحریر کیا۔ لیکن اُردو میں ادبی ڈائری لکھنے کا سہرا مولوی مظہر علی سندیلویؔ کے سر ہے جنہوں نے باقاعدہ اس صنف میں پیش رو کی حیثیت حاصل کی لیکن بعد میں اس کی کوئی خاص روایت نہ چل سکی، البتہ خواجہ حسن نظامیؔ نے سالہا سال ڈائری پابندی سے لکھی۔ اختر انصاریؔ کی ادبی ڈائری بہت مشہور ہوئی۔ انہوں نے اپنے معاصرین کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ مشہور معروف مزاح نگار ابن انشا نے ''آوارہ گرد کی ڈائری'' اور قاضی عبدالغفار نے ''مجنون کی ڈائری'' کے عنوان سے بڑی دلچسپ کتابیں لکھیں، جن میں اس دور کی عکاسی ملتی ہے۔

جہاں تک نور شاہؔ کا تعلق ہے انہوں نے ادب میں صنف افسانہ کے حوالے سے ایک اعلیٰ مقام پایا ہے۔ اس کے علاوہ ناول اور ڈرامے لکھ کر اپنی تخلیق تشنگی کو بھی کسی حد تک تکمیل کو پہنچایا ہے لیکن کچھ عرصہ سے وہ اپنے ماضی کے حسین دریچوں کو وا کرنے میں خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ اُس وقت کے ہفتہ روزہ اخبار اور موجودہ روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں بلاناغہ اور باقاعدہ اپنی ڈائری کے اوراق قلمبند کر رہے ہیں جو ریاست میں ڈائری رقم کرنے کی نقش اول کوشش ہے۔

شاہ صاحب کی ادبی ڈائری یادرفتگان پر مشتمل ہے۔ انہوں نے ریاست میں ہونی والی ادبی اور ثقافتی چہل پہل کو بہت قریب سے دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ ایک جز ولاینفک حصہ ادا کیا ہے۔ ان کا ادبی سفر پچاس سال کو محیط ہے جو اپنے آپ میں ایک کارنامہ ہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً غیر معمولی واقعات کو خام مواد کی صورت میں جمع کیا تھا جو اب ڈائری کے قالب میں سما گیا ہے۔ شاہ صاحب کی ادبی ڈائری کی سب سے بڑی خوبی زبان کا تخلیقی برتاؤ ہے۔ انہوں نے ڈائری میں قلمی خاکے، ہمعصر ادبأ کے تعلقات، رسائل کی ورق گردانی اور ناسٹیلجیا کے لاشعوری

نہاں خانوں کے پردے اٹھائے ہیں۔

شاہ صاحب کی ادبی ڈائری ہفتہ روزہ اخبار ''کشمیر عظمیٰ'' میں باون قسطوں میں سلسلہ وار شائع ہوئی۔ ڈائری کسی منصوبہ بند طریقے پر قلم بند نہیں کی گئی ہے بلکہ مصنف نے مختلف اوقات میں اپنی یادداشت رقم کی ہے۔ اس لئے تاریخی تسلسل قائم نہیں رہ سکا ہے۔ ان اوراق میں مصنف کی دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی ہے جو قاری کو مسحور کرنے کے لئے کافی ہے۔ ڈائری کا سرسری مطالعہ کرنے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک افسانہ نگار کی ڈائری ہے اکثر و بیشتر اوراق میں افسانہ اور افسانہ نگاروں کے متعلق پڑھنے کو ملتا ہے۔ بین الاقوامی سطح کے افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، کرشن چندر، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور کے ساتھ ساتھ ان افسانہ نگاروں کا ذکر بھی مفصل ہے جن کا ادب کے ساتھ سچا کمٹ منٹ تھا لیکن گردشِ زمانہ کے ہاتھوں اوراق پارنیہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ جن میں وجے سوری، رام کمار ابرول، پشکر ناتھ، سوم ناتھ زتشی، غلام رسول سنتوش، علی محمد لون، محی الدین شاہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ریاست میں افسانوں کے حوالے سے جائزہ بھی لیا ہے خصوصاً جب بشیر گاش کی ترتیب کردہ افسانوی مجموعہ کی بات کرتے ہیں تو صاف لفظوں میں یہ اعتراف کرتے ہیں ''کہ بشر گاش نے ''ارمغانِ کاشمر'' کا ایک تفصیلی دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں پھولوں کی مہک بھی ہے اور کانٹوں کی چبھن بھی، کڑواہٹ کچھ زیادہ ہی ہے اس کڑواہٹ کا ذمہ وار کسی حد تک میں بھی ہوں''۔ اسی طرح اپنی افسانہ نگاری کی وجہ تسمیہ بھی بلاخوف و تردد بیان کرتے ہیں۔

> ''یہ بات شاید بہت کم نئے قلم کار، کہانی کار، شاعر، ادیب اور قارئین جانتے ہونگے کہ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک زمانہ شاہدہ شریں سے کیا تھا۔ اب میرے ان دوستوں کے ذہن میں ایک سوال ابھرا ہوگا کہ میں نے اپنی جنس کب، کہاں اور کیسے تبدیل کردی، نور شاہ سے شاہدہ شریں اور شاہدہ شرین سے نور شاہ کیسے بن گیا،...... ایک کہانی اردو دنیا کے ایک نامور مدیر کے نام ارسال کی، کہانی ارسال کرنے کے لمحے سے اس وقت تک یعنی جب تک مدیرِ محترم کا جوابی

رقعہ نہیں ملا۔ دل کئی کئی زاویوں سے سوچتا رہا، جواب آیا اور جواب وہی تھا جو نئے نئے لکھنے
والوں کو عام طور سے ملتا ہے یعنی آپ کی کہانی رسالے کے معیار پر پوری نہیں اُترتی اور ہم اسے
شائع کرنے سے معذور ہیں۔ اپنی کہانی کا یہ انجام دیکھ کر ظاہر ہے دل ٹوٹ گیا ہوگا لیکن افسانوی
ذہن ایک اور چال چلا۔ اب میں نے کہانی اور اپنا نام بدلنے کی ٹھان لی......... بہر حال نئے
عنوان اور نئے نام سے کہانی مدیر محترم کو بھجوائی گئی، اب کے جو خط ملا وہ نہایت ہی دلچسپ تھا۔ یہ
بات آپ کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ وہی کہانی دوسرے نام یعنی ایک خوبصورت نسوانی
نام سے شائع ہوئی اور اس طرح شاہدہ شریں کا جنم ہوا''۔

طویل اقتباس دینے کا یہی مقصد ہے شاہ صاحب کی ذہنی کیفیت کو سمجھا جائے۔ ورنہ
آج کے دور میں سچائی کا ذکر کرنا کارے اردو والا معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان اعترافات کو
پڑھ کر ہر سنجیدہ قاری کے دل میں شاہ صاحب کے لئے عزت بڑھے گی۔

شاہ صاحب نے ان محفلوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جن میں وہ دوسرے ادیبوں کے
ساتھ محفلیں جماتے تھے۔ ساتھ ہی معاصرین کی عزت افزائی اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی کے
نمونے بھی ملتے ہیں جو ایک بڑے فنکار کی نشانی مانی جاتی ہے۔ ڈائری میں پرانے رسائل کی
ورق گردانی بھی ملتی ہے۔ ''بیسویں صدی'' کا ذکر کئی بار آیا ہے وہ اس لئے کہ مصنف کو پورے
ایشیاء میں متعارف کرانے میں ''بیسویں صدی'' کا خاص رول رہا ہے۔ لیکن ماہنامہ ''کتاب''
کی اُس کوشش کو بھی سراہا ہے جب انہوں نے اردو افسانے کے حوالے سے ایک ایسا سوال نامہ
مرتب کیا تھا جس کی اہمیت وافادیت آج بھی مسلم ہیں۔ شب خون بند ہونے پر افسوس ظاہر
کرتے ہیں تو نئے رسائل اجرا ہونے پر مبارک باد بھی دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر انسان اپنی پشتینی جگہ سے ہجرت کرے تو پھر بھی لاشعور کے نہاں
خانوں میں وہ جگہ موجود رہتی ہے جو تخلیق کار کی تحریروں میں گاہ بگاہ نادانستہ طور در آتی ہے۔ شاہ
صاحب نے زندگی کا بہت حصہ ڈل کے کنارے پر گزارا ہے جس کے آثار ان کے افسانوں میں

بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔لیکن ڈائری کے اوراق پر بھی اس کے اثرات نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔

"زبرون اور مہادیوں کے برف پوش پہاڑ اسی کائنات کا ایک حصہ ہیں اور ان پہاڑوں کی گود میں محوخواب ڈل جھیل کتنی بڑی پیاری دنیا ہے۔"

شاہ صاحب نے ڈائری میں افسانوی اسلوب اپنا کر ڈائری کو دلچسپ اور دلآویز بنایا ہے جس سے قاری ڈائری کے اوراق پڑھتے ہوئے کوئی تھکن محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک ورق پڑھنے کے بعد دوسرا ورق پڑھنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے، جو اس ڈائری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ڈائری میں غیر محسوس طریقے پر ریاست کی سماجی، ادبی اور ثقافتی پہلوؤں پر اتنا مواد جمع ہوا ہے کہ جب بھی ریاستی سطح پر کوئی تاریخ مرتب کی جائے گی تو شاہ صاحب کی ڈائری کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا۔

غرض شاہ صاحب کی ڈائری کا غائر مطالعہ کر کے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے پوری زندگی میں ادب کو سنجیدگی سے لیا ہے۔ جہاں تک ڈائری کا تعلق ہے، اس میں غیر جانبدارانہ طرز تحریر اپنا کر ایک نیا اسلوب اپنانے کی کوشش کی ہے، جو قابلِ تعریف ہی نہیں بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔



●...... ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

نور شاہ کی اُردو شناسی

نور شاہ دبستان جموں و کشمیر کے ایک بزرگ اُردو ادیب ہیں اور وہ خالص اُردو کی پرورش کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ انگریزی زبان کا جاننا ہر کسی ادیب کے لئے ہی نہیں بلکہ ایک عام آدمی کے لئے بھی ضروری ہے۔ مگر ہمارے ادیبوں خاص کر وادیٔ کشمیر کے قلم کاروں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ انگریزی کو چھوڑ کر کم از کم دو دو زبانوں میں لکھتے ہیں۔ یعنی اُردو کے ساتھ ساتھ اکثر کشمیری میں بھی لکھتے ہیں۔ پھر زیادہ تر کشمیری کے ہی ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس نور شاہ نے جم کر اُردو کے ساتھ دل لگایا اور اُردو دنیا میں اُسے وہ مقام بغیر کسی اثر و رسوخ یا سیاسی پشت پناہی، چاپلوسی و چال بازی، اقتدار کے بل بوتے یا اپنے شاگردوں کی وجہ سے نہیں دے دیا گیا، جس کے مستحق ہیں۔ انہیں جو کچھ بھی ملا، وہ انہیں صدفی صد اپنے قلم کی جولانی، محنت اور خلوص کی وجہ سے ملا۔

وہ ریاستی حکومت میں ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد تا ایں دم وہ اردو زبان و ادب کی خدمت خلوص اور بڑی نیک نیتی سے کر رہے ہیں، جس کا بین ثبوت ہمارے پاس ان کے نصف درجن سے زائد افسانوں کے مجموعے، یہی مقدار ان کے ناولوں/ ناولیٹوں کی بھی ہے اور اس کے علاوہ ان کی ادبی ڈائری، بند کمرے کی کھڑکی، ادبی خاکے ''کہاں گئے یہ لوگ'' کے ساتھ ساتھ ان کی مرتب کردہ کتابیں وغیرہ شامل ہیں۔ نور شاہ تین ناولٹ وغیرہ جیسے فن پارے دے کر فکشن کی دنیا میں اپنا الگ مقام حاصل کر لیا۔

نور شاہ کی پہچان بطور فکشن نگار کے ہے اور وہ نہ کوئی ادبی نقاد ہے اور نہ محقق، البتہ ان کا

کام، ان کی لگن اور اُردو زبان سے والہانہ محبت انہیں ریاست کے اُردو شناسوں کی صف میں بھی لاکر کھڑا کردیتی ہے۔ ہوا یوں کہ برسوں پہلے جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر نے انہیں ایک بڑا پروجیکٹ تفویض کیا جس کو انہوں نے بحسن وخوبی انجام دے دیا اور اس طرح ان کے ہاتھوں سے ۴۶۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ایک یادگار کتاب (یا انتھالوجی) انتخاب اُردو ادب (وادیٔ کشمیر) ۱۹۴۷ء۔۱۹۷۱ء (ترتیب وتہذیب نور شاہ) منظرِ عام پر آکر آج تک ریاست میں اُردو کے حوالے سے ایک اہم ڈاکومنٹ کے طور پر ثابت ہوئی ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں نور شاہ نے ''پیش گفتار'' عنوان کے تحت اپنے طویل بیان میں کشمیر میں اُردو کے تعلق سے ڈھیر ساری پُر مغز باتیں کیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بٹوارے کے بعد اگرچہ اُردو کو بعض جگہوں پر علاقائی حیثیت حاصل ہوسکی، مگر پھر بھی اس کی ترقی وترویج کے راستے مسدود ہوکر رہ گئے، البتہ ریاست جموں وکشمیر ہی ایک ایسی ریاست ہے جہاں اسے سرکاری حیثیت نئے آئین نے دے دی۔

نور شاہ کے مطابق یہاں پٹھان دور کے خاتمے کے ساتھ اور سکھوں کے اقتدار میں آنے کے ساتھ ہی اُردو کا چلن ہونے لگا۔ یہاں موصوف اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ جس کو بڑے پیشہ ور محققوں اور اُردو شناسوں نے چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطابق آزادی تک یہاں اُردو ادب کی روایت مکمل ہوچکی تھی اور ۱۹۴۶ء وادی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی گئی۔ اسی طرح وادی میں اُردو ادیبوں کا اُردو چھوڑ کر مقامی زبانوں کی طرف رُخ کرنا، ان کے مطابق وہ اس لئے ہوتا ہے، کیونکہ یہاں ان زبانوں کو سرکار کی طرف سے فوقیت ملتی ہے۔

نور شاہ نے اپنے بیان میں اس دور کے ادب کا مختلف سطحوں پر اور ادیبوں کا بھی ایک مفصل جائزہ پیش کرنے کی ایک اچھی سعی کی ہے۔ انہوں نے اس دور میں ایک ایسا اہم سوال کھڑا کیا ہے کہ جس کے متلاشی آج بھی یہاں کے لوگ ہیں۔

ملاحظہ فرمائیے یہ اقتباس:

''باہر اردو کے ناقدین نے یہاں کی سرگرمیوں کو ہمیشہ ہی نظر انداز کیا ہے اور آج بھی اُن کا رویہ نہایت ہی ہمت شکن اور مایوس کُن ہے۔ اسے اُردو زبان کی بدنصیبی ہی سمجھئے کہ جو زبان یہاں سرکاری سرپرستی میں پنپ رہی ہے، اُس کے اپنے ناقدین اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اُن کی نظریں صرف دہلی، اُتر پردیش اور بہار میں ہی مرکوز ہیں، جہاں یہ زبان دھیرے دھیرے دم توڑ رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کشمیری کبھی اہل زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، لیکن انہیں اپنی زبان دانی پر پورا بھروسہ ہے اور وہ اُردو کے لئے بڑی محبت اور خلوص رکھتے ہیں۔'' صفحہ ۱۱

نور شاہ کی باتیں، تو صحیح ہیں، لیکن ہمیں آج بھی یہ سوچنا ہے کہ ریاست کے ناقدین اور محققوں نے ریاست کے ادب اور ادیبوں کے بارے میں کتنا لکھا ہے۔ سروری کے بعد ایسا اہم کام ریاست کے کس نقاد نے کیا ہے۔ ہندوستان یا کہیں اور علاقائی سطح پر وہ پہلے اپنا اپنا Local Literary Establishment خود بناتے ہیں اور پھر وہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔

دلی یا بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے سیاسی، سماجی، سائنسی، کاروباری یا دیگر لوگ دوسروں کی نظروں میں رہتے ہیں، ٹھیک یہی حال ادیبوں، دانشوروں یا اُردو والوں کا بھی ہے۔ ہمیں اپنی اُردو زبان پر فخر ہے اور اسے ہمیں ہر محاذ پر ثابت کرنا ہوگا اور پھر وہ دِن دور نہیں جب دنیا میں کشمیر کے اردو والوں کو عزت کی نظروں سے ضرور دیکھا جائے گا۔ نور شاہ نے ''بڑے شوق سے سن رہا ہے زمانہ'' کے تحت کشمیر کے ۲۳ اُردو افسانوں کا انتخاب کیا ہے اور پریم ناتھ پردیسی سے لے کر ہر بھجن سنگھ ساگر تک تقریباً ہر اہم افسانہ نگار کو شامل کیا ہے۔

''صہبائے آبگینۂ گداز'' عنوان دے کر شہ زور کاشمیری سے اشرف ساحل تک پندرہ اہم نظموں کے بعد ''اک ہنگامے پہ موقوف ہے رونق'' کے تحت تین ڈراموں، گھروندے (علی محمد لون)، شاہکار (سجود سیلانی) اور ایک رات کا مہمان (بنسی نردوش) کا انتخاب کیا۔ ''داغ جگر سوختہ'' میں میر غلام رسول نازکی سے ایرج کاشمیری تک ۲۲ غزلوں کا انتخاب کیا اور ''فروغ فکر'' کے تحت ۱۳ تنقیدی و تحقیقی مقالات بھی شامل کئے ہیں یہاں حامدی کاشمیری کا بھی ایک تنقیدی

مضمون ہونا چاہیئے تھا۔

اگر ناول یا ناولیٹ کا کوئی ٹکڑا یا حصہ بھی اس انتھالوجی میں شامل کیا جاتا۔ انشائیہ اور خاکہ بھی تھوڑا تھوڑا شامل ہوتا۔ ایک آدھ صحافت کا ٹکڑا یا کوئی تاریخی بیان بھی پیش کیا جاتا، تو اس طرح یہ مجموعہ وادی کے اُردو ادب کے تمام اصناف یا پورے لٹریچر کو cover کر جاتا۔ اس سے اس کی زیادہ سے زیادہ ضخامت سوڈیڑھ سو صفحات بڑھ جاتی ہے، اب اگر اس کی گنجائش نہ تھی، تو افسانے والے حصے کا حجم بھی کچھ کم کیا جاسکتا ہے۔

اکبر حیدری کا ایک تحقیقی مضمون شامل ہوتا، اس کے برعکس ''سرشار و اودھ پنچ'' صرف سوا دو صفحات سے اُن کی اصل پہچان نہیں بن پاتی ہے۔

کشمیر میں کام کررہے غیر ریاستی ادیبوں کو اس انتخاب میں شامل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس مجموعے میں علاقائی سطح پر ہمیں خالص یہاں کے ہی ادباء کو پیش کرنا چاہیئے تھا تا کہ ہمارا معیار کھٹا میٹھا سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجاتا۔ ہم جیسے ہیں ویسے ہی اچھے ہیں دوسروں کی بیساکھوں پر چلنا اچھا نہیں ہے۔



●...... ڈاکٹر ریاض توحیدی

نور شاہ.... کشمیر کہانی کے آئینے میں

سڈنی کیز (Sidney Keyes) دوسری جنگِ عظیم میں عملی طور پر شریک تھا۔ اس کا شعری مجموعہ "The Cruel Solstise" ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی قرات کے دوران قاری کی سوچ پر موت کی خوفناکی چھا جاتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاری سے سڈنی کیز اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس نے اپنی ایک نظم کا عنوان ہی "جنگی شاعر" (War Poets) رکھ دیا، جس میں وہ اپنے مجروح جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"میں وہ شخص ہوں جو الفاظ کی تلاش میں بھٹکتا رہا مگر میرے ہاتھ میں ایک تیر ہی لگا۔"

نور شاہ (کشمیر) کی تصنیف "کشمیر کہانی" کے بیشتر افسانے بھی مذکورہ قسم کی اندوہ ناک صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے موت کے سیاہ سایوں کا خوفناک منظر پیش کرتے ہیں۔ کتاب کا پہلا افسانہ "یہی سچ ہے!" میں اس قسم کی صورت حال کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

"میں جب بھی اپنے گھر کی کھڑکی سے اس کھلے کھلے سے وسیع قبرستان کی جانب دیکھتا ہوں تو مجھے اُن کچی پکی قبروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ہے جن پر لکھی ہوئی عبارتیں اب لفظ اور دائروں میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ یہ مٹتے ہوئے الفاظ جیسے کوئی کہانی دہرا رہے ہوں۔ میں اس کہانی کی تلاش میں اپنے گھر سے باہر آتا ہوں اور قبرستان کی جانب بڑھنے لگتا ہوں۔ یہاں روشنی ہوتے ہوئے اندھیرے ہیں، یہاں ہر جانب موت کے سائے منڈلاتے نظر آتے ہیں۔"

(کشمیر کہانی۔ افسانہ 'یہی سچ ہے!' ص ۱۳)

افسانے کی یہ منظر کشی قاری کی سوچ کو ایک مخصوص ماحول کی طرف مائل کر دیتی ہے اور پھر درجہ ذیل اقتباس کے ذریعے ''یہی سچ ہے'' کا فن کارانہ انکشاف ہو جاتا ہے:

''یہ لڑکھڑاتے ہوئے پتے اور ابھرتے ہوئے مٹی کے ڈھیر تاریخ کے اوراق کو الٹ پلٹ کر کے نہ جانے مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ دھند اور اندھیرے گھٹتے بڑھتے سایوں کو جنم دے رہے ہیں اور ان سایوں میں دفعتاً ایک قبر کا منہ کھل جاتا ہے اور اس میں سے ایک شخص ایک نوجوان خوبرو شخص، جس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید، آنکھیں سرخ اور ہونٹ ادھ کھلے ہیں، باہر آتا ہے اور میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں اپنی بے نور آنکھوں سے اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن سوچیں ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔ اب میں اسے پہچان پایا ہوں، میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے اخباروں میں پہلے بہت پہلے ...... ارے یہ تو اپنا سلمان ہے۔ میرا محلے دار، میرا ہمسایہ... لیکن یہ یہاں اس قبرستان میں.... اس کے بارے میں تو سنتے تھے کہ پچھلے چار برسوں سے لاپتہ ہے۔''

(کشمیر کہانی۔ افسانہ 'یہی سچ ہے!' ص ۱۳)

اس طرح سے افسانے کے مختلف کرداروں، جو قبروں سے ایک ایک کر نکل آتے ہیں، یہی کڑوا سچ سامنے آتا ہے جس کے کڑوے گھونٹ پی پی کر کشمیری پچھلے پچیس برسوں سے مر مر کے جی رہے ہیں۔ سلمان نہ صرف اس کڑوے سچ کی علامت ہے بلکہ یہ ان سینکڑوں معصوم کشمیریوں کے خونِ ناحق کی بھی علامت ہیں جنہیں ظالم ہاتھوں نے غائب کر کے بے نام قبروں کے اندھیاروں میں ہمیشہ کے لئے سُلا دیا اور جن کے گھر والے برسوں سے انصاف گھروں کے در کھٹکھٹا رہے ہیں کہ شاید وہاں سے ان کے اپنوں کی واپسی کی کسی خوشخبری کا اعلان ہو جائے لیکن افسوس صد افسوس! وہ اس کڑوی سچائی سے بے خبر ہیں کہ وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے کیونکہ ان کے جسم بے نام قبروں میں خاک ہو چکے ہیں۔

افسانہ ''اڑان'' میں کشمیر کی درد بھری کہانی کی تخلیقی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانے کا ایک کردار بوڑھا عقاب ہے۔ وہ مسجد کے اونچے گنبد پر بیٹھ کر قبرستان کی قبروں کو گھورتا رہتا ہے شاید کچھ تلاش کرر ہا ہو کیونکہ پہلے تو یہ قبرستان اتنا بڑا نہیں تھا لیکن چند برسوں کے اندر ہی یہ قبروں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی دوران کسی انسانی پنجرے کو قبر سے باہر آتا دیکھ کر عقاب اپنے پر پھڑ پھڑا کر ہوشیار ہو جاتا ہے۔ پنجرہ نما انسان جب نزدیک آتا ہے تو عقاب اسے پوچھ بیٹھتا ہے کہ وہ کون ہے اور اس نے عقاب کی سی دنیا کیوں چھوڑ دی؟ اس کے بعد افسانہ نگار نے مردہ جسم کے پنجرے کی زبان سے اپنے مارے جانے اور کشمیریوں کے جذبات واحساسات کو کچلنے کی عکاسی یوں کی ہے:

''تم آسمان کی بلندیوں میں تب بھی اڑتے تھے اور اب بھی اڑ رہے ہو اور ہم....... ہم نے جب تمہاری طرح بلندیوں کو چھونے کی کوشش کی، آزاد فضاؤں کو چھونے کی آرزو کی۔ تہذیبی قدروں کی آبیاری اور انسانی عظمت کی بلندیوں کے لئے اپنی آواز بلند کی تو ہم سے ہماری دنیا چھین لی گئی۔ ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔ ہمارے لئے دو قدم چلنا مشکل ہو گیا اور جب ہم نے اپنے پاؤں کو اپنے وجود کو ان بیڑیوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی تو ہماری بے بس بے حرکت اور بے آواز جسموں کو ان قبروں کی گہرائیوں میں دھکیل دیا گیا۔''

(کشمیر کہانی۔ افسانہ اڑان ص ۲۸)

افسانے کا مرکزی کردار ''انسانی پنجر'' کشمیر کے ان سینکڑوں انقلابی انسانوں کی ترجمانی کر رہا ہے جنہوں نے شعوری طور پر غلامی کے گھٹن زدہ ماحول میں عقاب بننے کی کوشش کی تاکہ وہ آزاد فضاؤں میں اڑان بھر سکے لیکن کالے دیوؤں نے ان کے پر نوچ ڈالے اور انہیں زندگی کی سانسوں سے آزاد کر ڈالا۔ عقاب اس کی درد بھری کہانی سن کر جب دوبارہ پوچھتا ہے کہ اب وہ قبر سے باہر کس لئے آیا ہے؟ تو اس کا جواب سن کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اگرچہ جسمانی طور پر مر چکا ہے لیکن اس کی روح آج بھی آزادی کا سورج دیکھنے کے لئے تڑپ رہی

ہے۔لیکن یہاں کے اندھیرے سے پھر مایوس ہو جاتا ہے:

''ذرا سی آہٹ سنائی دی تو قبروں کے اندھیاروں سے باہر نکل آیا۔یہ دیکھنے کے لئے شاید صبح کی بے داغ روشنی نے اس دھرتی کو اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا لیکن یہاں یہاں تو اب بھی گھٹن ہے، مایوسی ہے، خالی ہاتھ اور خالی پیٹ ہیں، خون خرابہ ہے، ناانصافی اور نابرابری کا ماحول ہے۔ ظلم ہے اور ظالم، بندوق ہے اور بندوق سے اگلتی گولیاں بھی.....یہاں ہر صبح اپنے ساتھ موت کا پیغام لاتی ہے اور ہر رات لاتعداد روحیں بھٹک کر رہ جاتی ہیں۔''

(کشمیر کہانی۔افسانہ اڑان ص ۲۸)

مظلوم انسان کی دکھ بھری کہانی سن کر بوڑھے عقاب کی روح کانپ اٹھی اور بھوک ہونے کے باوجود اس نے اپنے شکار یعنی ''مینا'' کی جان بخش دی۔شاید وہ سوچنے لگا کہ اب انسانوں اور حیوانوں کے ظلم میں تھوڑا فرق تو ہونا چاہئے۔افسانہ نگار عقاب کی بدلتی فطرت کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''بوڑھے عقاب کی آنکھوں سے جلتے ہوئے آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک آئیں اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کی پیاس بجھ گئی ہو۔اور اس کی بھوک مٹ گئی ہو۔''

(کشمیر کہانی۔افسانہ اڑان ص ۲۹)

کشمیر کے حالات کب کون سا رخ اختیار کریں گے، کوئی بھی انسان کچھ وثوق سے کہہ نہیں سکتا ہے۔پچھلے کئی برسوں سے جہاں ایک طرف ایک لاکھ سے زائد کشمیری ابدی نیند سُلائے گئے وہاں دوسری جانب اسکولی بچوں کو بھی آگ برساتی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔افسانہ ''لمبی عمر کی لکیریں'' کا موضوع بھی ایک ایسے طالبِ علم کی موت ہے جو نہ صرف خود گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہے بلکہ اس کی کتابوں کے سفید ورق بھی سرخ ہو چکے ہیں۔ہر طرف ویرانی ہی ویرانی اور مایوسی ہی مایوسی چھائی ہوئی ہے۔راوی خود بھی افسانے کا کردار بنا ہوا ہے اور فائرنگ کی زد میں آکر ایک دس بارہ برس کے نامعلوم طالب علم کی ہوئی موت کا منظر یوں دکھاتا ہے:

''سامنے سڑک پر دس بارہ سالہ عمر کے ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی۔خون سے لت پت، بہت خون بہہ چکا تھا۔احساسات اور خیالات، موت اور زندگی کی پیچیدگیوں میں کھو کر اذیت ناک کیفیتوں سے گزر رہے تھے، میری نگاہوں کے سامنے وقت کا تیز لاوا بہا اور جم گیا............وہ بچہ جس نے نہ دنیا دیکھی تھی اور نہ ہی دنیا داری، کر اس فائرنگ میں اپنی جان کھو چکا تھا۔

اس کی کتابوں سے بھرا بستہ چھلنی ہو چکا تھا اور کتابیں سڑک پر بکھری پڑی تھیں۔ان کتابوں میں پوشیدہ علم سرخ سرخ خون کا روپ اپنا کر سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔''

(کشمیر کہانی۔افسانہ، لمبی عمر کی لکیریں ص ۳۰)

جس طرح ایک تاریخ نویس کیلئے کسی خطہ کی تاریخ رقم کرنے کے دوران سماجی ماحول کی آشنائی ضروری ہے۔کیونکہ سماجی ماحول ہی تحریر کے لئے بنیادی مواد فراہم کرتا ہے، اسی طرح کسی بھی باشعور تخلیق کار کی تخلیقی سوچ پر سماجی ماحول کا اثر انداز ہونا ایک فطری عمل ہے۔کسی بھی زبان کے ادبیات میں یہ صورتِ حال ضرور نظر آتی ہے۔افسانہ ''بے زمینی کا کرب'' بھی کشمیر کے موجودہ کرب انگیز سماجی ماحول کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس میں کوئی رومان پرور کہانی بیان نہیں کی گئی ہے جو کہ کشمیر کے خوبصورت مناظر کے زیر اثر لکھی جاتی تھی بلکہ اس افسانے میں کشمیر کا موجودہ درد پوشیدہ ہے۔وہ درد جواب کشمیر کے ہر انسان کی زندگی کا حصہ بنا ہوا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار دسویں جماعت کا ایک ایسا معصوم طالب علم ہے جس کی ساری دنیا گھر سے اسکول تک محدود ہوتی ہے۔اس کے شب و روز کا معمول پڑھنا لکھنا، اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ پارک میں کھیلنا کودنا، رات کو ٹی۔وی دیکھنا اور پھر سو جانا ہوتا ہے۔وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے۔اسے نہ دہشت گرد کے خوف ناک الفاظ کی جانکاری ہوتی ہے اور نہ ہی کسی پستول یا بارود کی پہچان لیکن ان خوفناک الفاظ کی جھنکار اس کے کانوں سے اس وقت ٹکراتی ہے جب وہ اسکول سے گھر واپس لوٹتا ہے تو اپنے محلے کی گلی کے نکڑ پر چند وردی پوش افراد کو دیکھتا ہے، جو راہ چلتے

لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنے کے ساتھ ساتھ جامہ تلاشی بھی لے رہے ہوتے ہیں۔وہ جب گلی کے قریب پہنچتا ہے تو ایک وردی پوش کی انگلی کے اشارے سے وہ رک جاتا ہے۔وردی پوش قریب آ کر پوچھتا ہے کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے اور بیگ میں کیا ہے؟وہ جواب میں کہتا ہے کہ وہ اسکول سے آ رہا ہے اور بیگ میں کتابیں ہیں۔اس کے بعد افسانہ نگار نے مرکزی کردار''امجد'' کی معصومانہ سوچ اور وردی پوش کی دہشت پسند سوچ کی عکاسی اس طرح سے ظاہر کی ہے۔امجد کا جواب سن کر وردی پوش پھر پوچھتا ہے:

''کچھ اور بھی ہوگا۔''

''نہیں تو۔صرف کتابیں ہیں۔''امجد نے معصوم لہجے میں جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے،پستول...گولہ بارود؟''

پستول کا نام امجد کے لئے نیا نہیں تھا۔اکثر کسی بڑے تہوار پر بازار سے بچوں کے نقلی پستول خریدے تھے لیکن گولہ بارود..اس نام سے وہ نا آشنا تھا۔

''یہ گولہ بارود کیا ہوتا ہے؟''امجد نے پوچھا۔

وردی پوش نے کوئی جواب نہ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے جانے کے لئے کہہ دیا۔جاتے جاتے وردی پوش کی آواز اس کانوں سے ٹکرائی''دہشت گرد کی اولاد...!''

یہ سن کر وہ رک گیا اور مڑ کر دیکھا۔وردی پوش اب کسی دوسرے شخص کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔

''یہ دہشت گرد کیا ہوتا ہے۔''اس نے من ہی من میں سوچا۔

گھر لوٹنے پر بھی امجد کے کانوں سے''دہشت گرد'' کے الفاظ ٹکرا رہے تھے۔اس نے جب اپنے والدین کو یہ سب واقعہ سنایا تو ان کی آنکھوں میں خوف و ڈر کے تاثرات صاف نظر آنے لگے لیکن وہ حیران و پریشان ہو کر خاموش ہو گئے۔اب بستی کے اندر بارود کی بو پھیل چکی تھی۔کسی بھی وقت گولیوں کی گن گرج اور بارود پھٹنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں اور انسانی جانیں تلف ہو رہی تھیں۔اب امجد گولی بارود،پستول،مار دھاڑ،گرفتاری اور کریک ڈاون وغیرہ سبھی الفاظ سے

مانوس ہو چکا تھا۔ایک صبح جب بستی کا کریک ڈاون کیا گیا تو شناختی پریڈ کے دوران وردی پوش افراد نے امجد کو بھی فوجی گاڑی میں ڈال دیا۔لوگ یہ دہشت ناک صورت حال دیکھ کر احتجاج کے لئے آگے بڑھنے لگے لیکن وردی پوشوں نے ہتھیار کے زور پر انہیں روک دیا۔امجد کا باپ اپنے معصوم بیٹے کی گرفتاری دیکھ کر وردی پوشوں سے منت سماجت کرنے لگا:

''یہ بے قصور ہے' کم سن ہے' اُسے کیوں لے جا رہے ہو' کہاں لے جا رہے ہو.

لیکن جیپسی امجد کو لے کر نکل چکی تھی!!''

معصوم امجد کی تلاش میں ہر جگہ کے چکر کاٹے گے۔کسی بھی سرکاری ادارے یا پولیس اسٹیشن سے کوئی مناسب کاروائی نہیں کی گی ۔آخر کار امجد کا والد اس فوجی کیمپ کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوا لیکن جب وہ ان سے اپنے گرفتار شدہ بیٹے کے بارے میں پوچھ بیٹھا تو وہاں سے جواب ملا کہ ان لوگوں کو رہا کیا گیا ہے۔اس کے بعد افسانہ نگار نے جس دردانگیز طریقے سے امجد کے باپ کی بے بسی اور فوجیوں کے غیر انسانی تیور کو ظاہر کیا ہے' وہ کشمیر کے سینکڑوں گمشدہ افراد کی درد بھری کہانی کا ایک کڑوا سچ ہے:

''تو میرا بیٹا امجد کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا

''ہمارے پاس نہیں ہے' وہ کہاں ہے ہم نہیں جانتے۔اسے تلاش کرنا اب تمہارا کام ہے ہمارا نہیں۔''

اب کی بار امجد کی گم شدگی کے بارے میں ایف آئی آر درج تو کی گئی لیکن ایسا کرنے سے نہ تو امجد ملا نہ امجد کی لاش اور نہ ہی

اس کی بے نام قبر...!''

نور شاہ صاحب کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف تو باشعور ناقدین اور قارئین کرتے رہتے ہیں.یہ ان کی تخلیقی توانائی کی پرواز ہے کہ نصف صدی سے اردو افسانے کے منظرنامے پر چھائے ہوئے ہیں اور عصر حال تک موصوف کے نو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔نور شاہ کی افسانوی

کہانی کے دو روپ ہیں۔ ایک رومان اور دوسرا حقیقت۔ فنی طور پر اگرچہ دونوں کو پیش کرنے کے لئے تخلیقی صلاحیت درکار ہوتی ہے، تاہم رومان کے بدلے حقیقت بیان کرنے میں مقصدیت کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ایک تخلیق کار کی تخلیق میں جب سماجی حقیقت نگاری کا رنگ شامل ہو جاتا ہے تو وہ اپنی سماجی ذمہ داری کا حق بھی ادا کرتا ہے اور اس کی تخلیق بھی سماج کے زخمی روح کی تاریخ بن جاتی ہے۔ اس تناظر میں نور شاہ کے وہ افسانے جو کشمیریوں کے دکھ، درد اور کرب انگیز حالات کی فنی عکاسی کرتے ہیں، کسی تواریخ سے کم نہیں ہیں۔ اس کا عیاں ثبوت زیر نظر تصنیف ''کشمیر کہانی'' کے بیشتر افسانے ہیں۔ کشمیر کے تعلق سے نور شاہ کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں کہ ''وہ بطور خاص کشمیر کی روحِ عصر کے موثر ترجمان ہیں اور ان کے طفیل ہی خود نور شاہ کا شمار ایک عرصہ سے اردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔'' (کتاب' یہ کیسا ہے جنون!۔ نور شاہ ص ٦)

کشمیر میں پچھلے پچیس برسوں سے جو مزاحمتی ادب (افسانے) تخلیق ہوا ہے، اس کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ کشمیر کے بیشتر تخلیق کار بلا خوف و تردد اور کسی مصلحت پسندی کے قلم کا صحیح حق ادا کر رہے ہیں۔ کشمیر جس پُر آشوب دور سے گزر رہا ہے، افسانوی ادب میں اس کی عکاسی پُر درد انداز سے کی گئی ہے اور ہو رہی ہے۔ چند احباب کے مضامین پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ وہ ان افسانوں سے بے خبر ہیں اس لئے وہ گلہ کرتے رہتے ہیں کہ کشمیر کے افسانہ نگار اپنی کہانیوں میں یہاں کی زمینی صورت حال کی منظر کشی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ گلہ اسی وقت دور ہو جائیگا جب ہم ان تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے لئے وقت نکالیں گے۔



●......ڈاکٹر نزاکت حسین

نور شاہ کی ناول نگاری

نور شاہ نے اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور حقیقت کے امتزاج سے زندگی کی حقیقی تصویر کشی کی ہے یوں تو انہوں نے افسانے اور ڈرامے زیادہ لکھے ہیں لیکن ان کے ناول بھی ادبی دنیا میں کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے دو ناول ''پائل کے زخم'' اور ''نیلی جھیل کالے سائے'' ہیں۔ ان میں انہوں نے کشمیر کی مفلوک الحال اور مجبور لوگوں کی زندگی، ان کے خواب، ارمان اور رنج وغم کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''نور شاہ کے تین ناولٹ'' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مجموعے میں ''آدھی رات کا سورج''، ''آؤ سو جائیں'' اور ''لمحے اور زنجیریں'' شامل ہیں۔ یہ تینوں ناولٹ نور شاہ کی ذاتی وارداتوں اور تجربوں پر مبنی ہے۔

''آدھی رات کا سورج'' کے ذریعے نور شاہ نے معاشرے میں پائی جانے والی خامیوں کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں لکھا ہوا یہ ناولٹ آج کے دور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناولٹ آنے والی نئی نسل کی لڑکیوں کے لئے ذریعۂ پیغام ہے کہ وہ اپنی من مانی نہ کریں۔ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف ایسے کسی بھی راستے کو نہ اپنائیں جس سے انہیں اپنا پریوار، اپنی عزت اور اپنا وقار سب کچھ کھونا پڑے۔ ناول نگار نے اس ناولٹ کی مرکزی کردار کے ذریعے ظاہر کیا ہے کہ نوجوان لڑکیاں جو فلموں میں کام کرنے کی خواہش لے کر ممبئی جاتی ہیں اور پھر کیسے وہاں کے بڑے لوگوں کی جنسی ہوس کا شکار بنتی ہیں۔ سبق آموز بھی ہے اور قاری کو متاثر بھی کرتا ہے۔

''آؤ سو جائیں''، میں مصنف نے جنسی ونفسیاتی خواہشات کے ساتھ ساتھ کشمیر کی نیم تاریخ کو بھی علامتوں اور اشاروں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس ناولٹ میں عشق و محبت کے قصے، احباب کے بچھڑنے کا غم اور کشمیر کی عوام پر ہوئے ظلم وستم وغیرہ چھوٹے چھوٹے واقعات کا بیان ملتا ہے۔ ان واقعات کے ساتھ ساتھ کشمیر کے لیڈروں پر طنز، فرقہ پرستوں سے دور رہنے کا سبق، حب الوطنی کا جذبہ اور آپسی بھائی چارے کا پیغام بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناولٹ میں ایک ایسی عورت کے کردار کی نقاب کشائی کی گئی ہے جس کی زندگی کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔ ہر ایک سے دوستی کرنا اور پھر ان کے ساتھ بیٹھ کر شراب پینا اُس کا خاصہ ہوتا ہے مصنف نے اس کے کردار کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز سے کی ہے اس ناولٹ کے مطالعے سے قارئین کو یہ سبق ملتا ہے کہ ایسی بدکردار عورتوں سے دور رہنا چاہیۓ۔ جن سے معاشرے پر بُرا اثر پڑتا ہو۔ اس ناولٹ میں نفسیاتی پیچ وخم کو ایسے پیش کیا گیا ہے کہ قاری مسحور ہو کر تخیلی دنیا کی سیر کرتا ہے۔

''لمحے اور زنجیریں'' کے ذریعے مصنف نے معاشرے میں پائی جانے والی ایسی برائیوں اور خامیوں کو اُجاگر کیا ہے کہ جن سے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی توہین ہوتی ہے۔ قارئین کو ان برائیوں سے بچنے اور خامیوں کو دور کرنے کا سبق ملتا ہے۔ یہ ناولٹ بھی جنسی موضوعات پر مبنی ہے۔ اس ناولٹ کے دونوں مرکزی کردار الگ الگ شادہ شدہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مسلسل ناجائز تعلقات بنائے رکھتے ہیں۔ تاج کی خاطر اختر اپنے اہلِ و عیال سے بھی دور ہو جاتا ہے لیکن جب تاج اختر کو چھوڑ کر کسی اور سے جنسی تعلقات بنا لیتی ہے تو اس وقت اختر پچھتاتا ہے۔ ''لمحے اور زنجیریں' کے مطالعے سے قاری کو یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک شادی شدہ انسان کا کسی غیر عورت سے ناجائز تعلقات بنانا اس کے ازدواجی زندگی کے لئے کتنا الم ناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس ناولٹ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شادی شدہ انسان کی زندگی کا معیار غیر شادی شدہ سے مختلف ہونا چاہیۓ۔

نور شاہ کی تصنیفات میں زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل زیادہ جگہ پاتے دکھائی دیتے

ہیں۔ زندگی کے تجربات اور مشاہدات سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات زندگی سے بہت قریب نظر آتی ہیں۔ معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں اور خامیوں کی نشاندہی وہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ اپنی کہانیوں میں زندگی کی ہو بہو تصویر کشی کرتے ہیں۔

اس مجموعے میں شامل تینوں ناولٹ میں مصنف نے قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری ،منظر کشی اور زبان و بیان کا استعمال فنی مہارت سے کیا ہے۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے بھی کامیاب ہے کہ اس کے واقعات کا بہاؤ بغیر کسی رخنہ کے آگے بڑھتا ہے۔ واقعات جس طرح اپنی راہِ حسین بناتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار ان تجربات سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے اور انہیں تحریر کرتا جا رہا ہے۔ حقیقت پسند ناول نگار میں یہ بات پائی جاتی ہے نور شاہ کو اس پر دسترس حاصل ہے۔ انہوں نے ان عوامل کے ساتھ ساتھ کی باریکیوں کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔

ان ناولٹوں میں کردار نگاری اعلیٰ درجہ کی ہے سب کرداروں کو مصنف نے مکمل فنکارانہ طریقے سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ گونا گوں کرداروں کے باوجود ایک دوسرے کو ہر لحاظ سے الگ رکھا ہے۔ ان کے کرداروں کی سخت گیری ان کے مترجم آمیز حالات اور زندگی کے متعلق ان کا رویہ عبرت آمیز بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ نور شاہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ عام طور پر ان کی کہانیوں کا پسِ منظر بالخصوص اور بالعموم کشمیر رہا ہے۔ ان کی منظر نگاری اور اندازِ بیان کی خوبصورتی انہیں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کامیاب ناولٹ ہیں۔ ان کے کردار اپنے معاشرتی اور خاندانی پسِ منظر کے لحاظ سے اپنی اپنی زبانیں استعمال کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ''نور شاہ کے تین ناولٹ'' فن کے آب گیروں کو پوری طرح رواداری کے ساتھ سجائے رکھتی ہے۔

نور شاہ کی عظمت و انفرادیت کا راز اس میں مضمع ہے کہ انہوں نے نئے نئے تجربات سے

اپنے سارے مراحل کو قاری کے سامنے مکمل طور پر من وعن پیش کردیا ہے۔ یہ نور شاہ کی حقیقت شعاری کا کرشمہ ہے۔ جس نے اس مجموعے کو زندگی کا حقیقی رنگ عطا کردیا ہے۔ اُن کا طرزِ تحریر اس قدر دلکش ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس مجموعے میں مصنف نے سماجی رشتوں پر بھی نکتہ چینی کی ہے اور یہ دکھایا کہ سماج میں رہنے والے مختلف طبقے کے لوگ کس طرح اپنے چہروں پر حیوانیت کا خول چڑھائے ہوئے ہیں۔ مجموعہ ''نور شاہ کے تین ناولٹ'' کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ نور شاہ اردو فکشن کی دنیا میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور اردو فکشن میں بالخصوص ریاستی ادب میں ان کا منفرد مقام ومرتبہ ہے۔

..........●●● ....

●......سعید خورشید کاظمی

نورشاہ۔افسانے کا ایک درخشندہ ستارہ

نورشاہ جو اردو افسانوی ادب کے ایک نہایت معتبر اور مشہور و معروف کہانی کار ہیں۔اردو ادب کو فیض یاب کر رہے ہیں۔بقول نورشاہ اُنہوں نے اُس وقت لکھنا شروع کیا جب ریاست کے کئی معتبر افسانہ نگار پورے برصغیر کے افسانوی منظرنامے پر چھائے ہوئے تھے جن میں حامدی کاشمیری، ٹھاکر پونچھی، مالک رام آنند، موہن یاور، برج پریمی وغیرہ شامل ہیں۔اُن کے ہمعصر افسانہ نگاروں میں وریندر پٹواری، پشکر ناتھ، وحشی سعید، ویدراہی، برج کتیال، علی محمد لون، اختر محی الدین، ہری کرشن کول، غلام رسول سنتوش، مخمور بدخشی، کے نام لئے جاسکتے ہیں۔انہیں کہنہ مشق ادیبوں کی صف میں جنہوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت کی کُھل کر وکالت کی اپنی محنت، ریاضت، مشاہدہ اور مطالعہ کے بل بُوتے پر نورشاہ اور اُن کے ہمعصروں نے بھی اپنی اہمیت کا سکّہ جمایا اور افسانوی ادب میں ایک درخشندہ ستارہ بن کر اُبھرے۔نورشاہ اپنی تخلیقات کی بنا پر ایک ناقابلِ تسخیر ادیب کی حیثیت سے جانے مانے جاتے ہیں۔اُس وقت کے افسانوں اور کہانیوں میں جب وادی حقیقی طور پر پیار اور محبت سے لبریز تھی نورشاہ نے رومانی کہانیاں لکھ کر اپنے طرزِ ادائیگی کو اہل قلم سے منوایا۔ایک عرصہ تک نورشاہ عشق کے حوالے اور حسن پرستی کے جذبہ سے معمور رومان پرور کہانیوں سے اہل ذوق کو محظوظ کرتے رہے۔پروفیسر قدوس جاوید نے نورشاہ کو شہنشاہ رومان کہا ہے اور نورشاہ خود بھی اِس کا اعتراف کرتے ہیں۔اُنہوں نے اپنے ایک افسانوی مجموعہ 'بے ثمر سچ' میں اقرار کیا ہے کہ 'میرے افسانوں کے کردار رومانوی ہیں۔میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے سے رومان کے چشمے ہی

پھوٹتے ہیں......زندگی حسن و عشق سے عبارت ہے اور نسل آدمی کی بقا ان ہی سے قائم ہے۔ وہ وادیٔ دلفریب جہاں کے مرغزاروں، پہاڑوں کی دل کو موہ لینے والی چوٹیوں اور باغات کے دلکش مناظر، چشموں کے ٹھنڈے پانیوں اور صحت افزا مقامات نے ہر کسی کو متاثر کیا کو نور شاہ نے اپنے افسانوں کا ایک اہم حصہ بنایا اور اس کی خوبصورتی کو اہلِ وطن اور سیاحوں سے روشناس کرایا۔ اِس تعلق سے جب اُن کی کہانیوں کو پڑھا جاتا ہے تو قاری اپنے آپ کو اُن روح پرور اور حسین فضاؤں اور نظاروں میں پاتا ہے جس کی تصویر کشی وہ کرتے ہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی تحریروں میں نکھار آتا گیا اور اس ادیب نے اپنا ایک ایسا مقام پیدا کیا کہ بہت سے ایڈیٹر اُن افسانوں کو اپنے رسائل میں چھاپنا باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ اُن کی پہلی کہانی ''گلاب کے پھول'' ماہنامہ بیسویں صدی دہلی میں شائع ہوئی جس کے مدیر خوشتر گرامی تھے اور جن کا حدِ انتخاب بہت سخت تھا اُس رسالہ میں چھپنا اِس بات کی ضمانت تھی کہ ادیب یا شاعر واقعی کل کا ایک نامور تخلیق کار ہوگا۔ اُس کے بعد نور شاہ نے پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا اور شہرت کی وہ منزلیں طے کرتے کرتے آج اُس مقام پر کھڑے ہیں کہ ہر ادب نواز اُنہیں تحسین کی نظر دیکھتا ہے اور افسانوی دُنیا کا تذکرہ اُن کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ کتنے ہی آج کے نئے کہانی کار اُن سے فیضیاب ہوئے ہیں کہنا دُشوار ہے۔ ماضی میں بھی اُنہوں نے اپنے گہرے مطالعہ اور مشاہدہ کے پیشِ نظر قابلِ ستائش کہانیاں اہلِ ادب کو دیں اور آج بھی جب ہر طرف آہیں اور سسکیاں ہیں، زندگی جینا دوبھر ہوا جا رہا ہے، آج کے غیر یقینی اور انتہائی مخدوش حالات، جور و ظلم، قتل و غارت، کسمپرسی، پھلوں اور پھولوں کی خوشبوؤں کی جگہ بارود کی زندگی بموں کی موجودگی اور بدلتے ہوئے اخلاقی رُجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے اور جنتِ کشمیر کو اُجڑتے دیکھ کر بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ ایک سچے ادیب کی مانند سچائی کو بیان کرنے میں کسی حیل و حجت سے کام نہیں لے رہے بلکہ بلاخوف وخطر جو وہ دیکھ، سُن اور محسوس کر رہے ہیں اُسے اپنی کہانیوں میں بیان کر رہے ہیں۔ اُن کے دلی کرب کو اُن کے اِن الفاظ میں جانچیئے:......اس دوران یہ جنت دھیرے دھیرے آہستہ

آہستہ رُک رُک کر ایک نیا روپ اختیار کر گئی......جہنم کا روپ......آگ، شعلے، قتل و غارت، آبرو ریزی، نا انصافی ......' (خواب بھی بکتے ہیں)۔ پروفیسر مجید مضمر کے الفاظ میں رومان سے حقیقت تک کے سفر میں نور شاہ کا تخلیقی برتاؤ' خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ویسے بھی یہ نا قابلِ تردید سچ ہے کہ حساس ادیب اور شاعر اپنے اِرد گرد کے ماحول، اپنے معاشرے اور حالات کے تقاضوں سے آنکھیں نہیں موند سکتا۔ اگر وہ سچ کو سچ کہنے سے ہچکچاتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے فن سے اور اپنے فن پارے سے انصاف نہیں کر رہا کیونکہ ایک صحیح اور سچا فنکار وہی ہے جو وقت کی آواز سنے اور اُسی کے مطابق اپنے خیالات کا اظہار کرے اور لوگوں کو حقیقت سے روشناس کرائے......نور شاہ اس حوالے سے افسانوی ادب کے شہسوار ہیں اور بڑی مہارت سے اپنا فرض نبھا رہے ہیں۔

نور شاہ نے کشمیر کے موجودہ حالات کے پس منظر میں بے شمار افسانے لکھے ہیں لیکن کہیں بھی وہ لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتے بلکہ محبت و آشتی، صلح صفائی، یگانگت اور فرقہ وارانہ بھائی چارے کا سبق پڑھاتے ہیں اور اس طرح اُن کی تخلیقات کو انفرادیت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ چھ دہائیوں سے مسلسل لکھے جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اُن کی تحریروں میں تنوع کا عنصر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر پہلے اُنہوں نے رومانس کے مختلف انداز اور طریقوں کو اپنی کہانیوں کی بُنیاد بنایا تھا تو آج وہ اُن تلخ حقائق اور نفسیاتی کشمکشوں کو ضبط تحریر میں لا رہے ہیں جس سے دُنیا بالعموم اور کشمیر بالخصوص دو چار ہے۔ اُن کا قلم تھکا نہیں، اُن کا ذہن کمزور نہیں ہوا، انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ اور زیادہ ہمت اور جرأت کے ساتھ اپنے تحریری سفر پہ گامزن ہیں۔ اس وقت تک وادیٔ کشمیر کے یہ قد آور اور 'جواں' قلم کار اپنے نو افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور ناولٹ لکھ کر اُردو ادب میں اضافہ کر چکے ہیں۔ افسانہ 'درندے' مجھے اس بدنام زمانہ جنسی وحشت کی یاد دلاتا ہے جب ایک لڑکی کی، اُس کے دوست کے سامنے، چلتی ہوئی بس میں چند جنسی درندوں نے نہ صرف اُس کی عصمت کو تار تار کیا بلکہ اُس کے برہنہ جسم کو بس سے باہر پھینک دیا اس محبت کی دیوی کو جس نے ایک بار اُس کے دوست کے پوچھنے پر کہ وہ اُسے کتنا چاہتی ہے

جواب دیا تھا۔ اتنا چاہتی ہوں کہ میں تمہاری ایک چھوٹی سی آرزو کے لئے اپنا تن من نچھاور کرسکتی ہوں، تمہارے ایک اشارے پر صحرا صحرا ریت چھان سکتی ہوں، ساگر کی گہرائیوں کو ناپ سکتی ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سلا دیا۔ وہ اپنے اُس چاہنے والے کو جو اُس کے واسطے آگ کے دریا پار کرسکتا تھا، اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرسکتا تھا صرف خواب دیکھنے کے لئے چھوڑ گئی۔ دیگر افسانوں پہ بھی اظہار خیال کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ ان میں بھی نور شاہ کی انفرادیت کو دیکھا جاسکتا ہے اور جن میں حقیقی زندگی کے کئی رنگ جھلکتے ہیں مگر بوجہ طوالت یہ ممکن نہیں۔ بس وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلی بار نور شاہ کے افسانچے پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انہوں نے خالد حسین ویریندر پٹواری اور وحشی سعید کی نذر کئے ہیں۔ ان میں بھی وہ تمام موضوع ہیں جن سے آج کل ساری دنیا دو چار ہے۔ ان میں سیاست، کورپشن، جنسیات، مذہبیات کے عکس موجود ہیں لیکن اگر چشم بینا سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ہمیں اپنے اخلاقی فرض کو نبھانے اور اپنے فرائض کو سرانجام دینے کا سبق بھی فراہم کرتے ہیں۔ مُنی بڑے دنوں سے باپ سے تقاضا کررہی تھی کہ اُس کے لئے گُڑیا لائی جائے۔ ماں اُس کو سمجھا رہی تھی کہ چوں کہ ''اس کے ابو جان ریلیف کمیٹی کے صدر ہونے کے باعث بھونچال سے متاثر لوگوں کو دیکھ بھال کرنے میں مصروف ہیں...... راحت کے کاموں سے انہیں فرصت تو ملنے دو۔ منی کا کہنا' امی میں یہ نہیں مان سکتی۔ کل تو ابو دو کنستر گھی اور ایک بوری آٹا لائے تھے اور آج وہ چھ نئے کمبل لائے ہیں، لیکن میری گڑیا لانا بھول گئے' کیا اس بات کی کھلی دلیل' نہیں کہ یہ بزعم خود جنتا کے غمخوار صحیح معنوں میں اُن کے کتنے ہمدرد ہوتے ہیں۔ یہ مرکزی پلاٹ ہے افسانچے 'فرض شناسی' کا۔ افسانچہ 'ڈیوٹی' میں بتایا گیا ہے کہ نئے افسر اعلیٰ کے آنے سے جب بالائی آمدنی کے راستے بند ہونے لگے تو اُس طرح ایک پولیس اسٹیشن کے انچارج غفور نے ایک اور طریقہ اپنایا۔ اُس نے ایک جیب کترے سے جو حوالات میں بند تھا کو کہا کہ وہ دن بھر لوگوں کی جیبیں کاٹتا رہے اور شام ہونے سے پہلے لوٹ آئے دن بھر کی کمائی کے ساتھ۔ اُس دن

جیب کترے نے بنک سے نکلتے ہوئے ایک آدمی کا پرس اڑالیا۔ پانچ ہزار گھر میں دینے کے بعد باقی پانچ ہزار غفور کے حوالے کردیئے۔ وہ خوش تھا کہ اُس کی سکیم کامیاب رہی۔ جب متاثرہ شخص نے رپورٹ درج کروائی کہ اُس کا پرس جس میں دس ہزار روپے تھے کسی نے اُڑالیا ہے تو غفور کا ماتھا ٹنکا۔ رپورٹ درج کرنے اور اُس شخص کی جانے کے بعد اُس نے جیب کترے کو بلایا اور کہا' اتنی بڑی جعلسازی، اتنا بڑا دھوکا...... میرے ساتھ ...... دس ہزار میں سے پانچ ہزار کی رقم اڑالی...... دیکھ اب میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں، لیکن دوسرے ہی لمحے نرمی کے ساتھ اُس کو کہا' اب کی' بار معاف کرتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا...... اب جا کر کھانا کھالو سوجاؤ...... کل پھر تمہیں ڈیوٹی پر جانا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی ڈیوٹی سے بہت سے آفیسر نابلد ہوں۔ نور شاہ کی یہ سکیم انہیں 'راہ، راست پر لاسکتی ہے۔'

نور شاہ نے اس مجموعے کے چوتھے باب میں ہری کرشن کول، صوفی غلام محمد، محمد امین کامل، اختر محی الدین اور محی الدین ریشی کے ایک ایک کشمیری افسانے کو اُردو کا روپ دے کر کشمیری نہ جاننے والے قاری پہ ایک احسان کیا ہے اور اُسے یہ جان کر یقیناً مسرت ہوگی کہ اس زبان کا افسانوی ادب بھی مالا مال ہے۔ یہ کہانیاں پڑھ کر احساس ہوا کہ کشمیری قلم کاروں کی تخلیقات کے، منتخب ہی سہی، لگاتار اُردو اور دوسری زبانوں یعنی پنجابی، ڈوگری وغیرہ میں بھی ترجمے ہونے چاہئیں تاکہ اُن زبانوں کے قاری بھی جان سکیں کہ اس زبان کے فنکار بھی ادب کا دامن بھر رہے ہیں۔ ستمبر ۲۰۱۴ء میں جو تاریخی تباہی متواتر بارشوں اور اُن کے نتیجے میں تباہ کن سیلاب نے پہنچائی اُس پر پانچ کہانیاں ہیں جن میں انہوں نے افسانوی رنگ دے کر اُس کرب اور درد کا بھرپور اظہار کیا ہے جس سے اہل کشمیر تب ہی دوچار نہیں ہوئے بلکہ اب تک اُس کے نتائج کا سامنا کر رہے ہیں اہلِ سیاست کی سیاسی شعبدہ بازیوں کی 'کرم فرمائیوں' کے سبب۔

...........●●● ....

●...... فاروق احمد وانی

نور شاہ۔ تحریکات اور رجحانات کے تناظر میں

اردو ادب میں جہاں کئی تحریکیں رونما ہوئیں وہیں کئی رجحانات بھی وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہے۔ اردو کی ادبی تاریخ کا کوئی بھی دور تحریکات ورجحانات سے خالی نہیں رہا۔ ہر زمانے میں ہمارے ادیب وشاعر کسی نہ کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ رہ کر سرگرم عمل رہے۔

اردو ادب کی ان تحریکوں میں ابہام گوئی کی تحریک، فورٹ ولیم کالج کی تحریک، علی گڑھ تحریک، انجمن پنجاب کی تحریک، اقبال کی تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدید تحریک اور مابعد جدید تحریک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تحریکیں اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں رونما ہوئیں۔ ان میں بعض تحریکات کا اثر بہت جلد ختم ہوگیا اور بعض کا اثر ابھی تک دکھائی دے رہا ہے۔ اگر ہم رومانی تحریک کی بات کریں تو یہ تحریک علی گڑھ تحریک کے ردعمل میں پیدا ہوئی ہے اور اس کا تصور انگریزی ادب سے اردو ادب میں آیا ہے۔ اس تحریک سے وابستہ طبقہ مقصدیت کی بجائے تخیل کی کارفرمائی اور جذبہ اور خیال کی آزادی چاہتا تھا۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں نے جو ادب لکھا، وہ رومانی ادب کہلایا۔ پروفیسر احتشام حسین رومان کے بارے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

”رومان سے مراد حسن وعشق کا افلاطونی اور تخیل بیان نہیں بلکہ روایات سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت، ان دیکھے حسن کی جستجو، وفور تخیل اور وفور جذبات، انانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادیِ خیال، حس سے لطف اٹھانے میں ناآسودگی کا احساس اور اس کا

کرب۔ ان سب کو میں رومانیت کہتا ہوں، رومان اسے بھی کہتا ہوں جو حقائق کی جستجو، مادی اسباب سے زیادہ خیالات وتصورات کی رنگین دنیا میں کرتا ہے۔"

انور سدید، اردو ادب کے ارتقا میں تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۲

رومانی تحریک کے پانچ اہم پہلو جن پر زور دیا جاتا تھا درج ذیل ہیں۔ جذباتیت میں انتہا پسندی، فطرت پسندی، عقل سے بیزاری، مسرت کی تلاش اور ماورائیت قابل ذکر ہیں۔ اس تحریک کا آغاز سر سید احمد خان اور الطاف حسین حالؔی کی اصلاحی تحریک کے بعد ہوا۔ اس کے اولین نمونے عبدالحلیم شرر کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔ اس کا اثر براہ راست شعروادب پر پڑا۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری، امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری، سجاد حیدر یلدرم، عنایت اللہ دہلوی، جلیل قدوائی، ظفر قریشی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ملکی سطح کے ان ادیبوں کا اثر ریاستی سطح کے ادیبوں پر بھی پڑا۔ ریاست جموں وکشمیر کے ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس تحریک سے متاثر ہونے والے ادیبوں میں پریم ناتھ پردیسی، محمد دین فوق، پریم ناتھ در، تیرتھ کاشمیری اور نور شاہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں نور شاہ رومانی ادب میں پیش پیش رہے۔ نور شاہ بنیادی طور پر رومانی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں رومان کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں تخلیقی فن کی عام روش، حسن فطرت سے محبت اور عام قارئین کی پسندیدگی کے سبب ان کی کہانیوں پر حسن پرستی اور رومانیت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے اور بعض ناقدین کی نظروں میں رومانیت نور شاہ کے فن کی بنیادی شناخت ہے۔ نور شاہ اپنے افسانوں میں رومانی طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں:

"مجھے اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میرے افسانوں کے اکثر وبیشتر کردار رومانوی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں، زندگی حسن وعشق

سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان سے قائم ہے۔میری کہانیوں میں ہر دم اور ہر آن حسن کی پرچھائیاں منڈلاتی نظر آتی ہیں۔شاید میں بہت زیادہ حسن پرست ہوں اور شاید اسی لیے حسین جلوؤں اور منظروں کو اپنے قلم کے کیمرے میں اتار کر میں اندر چھپے ہوئے افسانہ نگار کی حسن پرستی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتا ہوں۔" نور شاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)، ص ۷

نور شاہ ایک تخلیقی فن کار ہیں۔ان کی تخلیقات کا پس منظر ریاست جموں وکشمیر کی خوبصورت وادیاں، دلفریب مناظر اور صحت افزا مقامات ہیں۔ان کی عکاسی وہ بڑی ہنر مندی سے کرتے ہیں۔انھوں نے جوانی کے ایام ڈل جھیل کے اردگرد کے ماحول میں گزارے اور اسی ماحول سے ترغیب پا کر انھوں نے افسانے کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور عمر بھر اس کے ہو کر رہ گئے۔

نور شاہ کے افسانے موضوع، کردار نگاری، مکالمہ نگاری وغیرہ کے لحاظ سے انوکھے ہیں۔پروفیسر شکیل الرحمٰن نور شاہ کے افسانوں میں رومانی خصوصیت کے متعلق رقمطراز ہیں:

"نور شاہ کے رومانی کردار اجنبی نہیں، ان سے حقیقت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔"

معروف افسانہ نگار اور ادیب ڈاکٹر منصور احمد منصور نور شاہ کی افسانہ نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں:

"نور شاہ کے افسانوی فضا پر رومانیت کی شفق چھٹکی ہوئی ہے، وہ زندگی کے ہر انداز اور پہلو کو اس کج رویوں اور غلط کاریوں کو رومان میں گوندھ کر پیش کرتے ہیں۔ان کے فکر و نظر کے پس پردہ رومان کی جو ٹھاٹھیں مارتی ہوئی لہریں ہیں، وہ ہر چیز کو بھگو کر رکھ دیتی ہیں۔چنانچہ نور شاہ کے یہاں بھرپور رومانی فضا تنی ہوئی ملتی ہے۔"

ڈاکٹر منصور احمد منصور، پریم ناتھ در اور جدید افسانہ

نور شاہ کی رومانیت موضوع اور اسلوب کے علاوہ واقعہ بھی رومانی فکر کے سانچے میں ڈھلا ہوا ملتا ہے۔افسانہ "پتھر دل" سے ایک اقتباس دیکھیں:

''یہی موسم !۔۔یہی وقت !۔۔یہی راستہ !!

اپنی تاریکیوں میں تاروں بھری راتوں کی جگمگاہٹ جگائے ہوئے۔میری نگاہوں کے سامنے دیکھتے دیکھتے موسم، وقت اور راستے میں ایک عجیب سا تصادم ہوا فضاؤں، غنودگی، کہانیوں کی کہکشاں اور راتوں کی جگمگاہٹ ایک دوسرے میں غیر اختیاری طور پر تحلیل ہوگئیں اور ایک نئی خوش بخت کہانی کی صبح جاگی !۔''　نورشاہ، بے گھاٹ کی ناؤ (افسانوی مجموعہ)، ص ۴۸

افسانہ ''میری آرزو میری تمنا'' بھی ایک رومانی افسانہ ہے۔یوں تو نورشاہ زندگی کی حقیقتوں کا افسانہ نگار ہیں۔نورشاہ نے جس دور میں افسانے لکھنے شروع کیے، وہ دور رومان کا دور تھا لیکن ان کے یہاں محض تصوراتی وتخیلاتی رومان نہیں ہے بلکہ نورشاہ کے افسانوں میں حقیقت کی تپتی زمین میں کھلنے والا رومان ملتا ہے جو نورشاہ کے فن کارانہ رویے کے سبب بے حد فطری ہوگیا ہے۔اس افسانے میں ایک ڈاکٹر راجندر اور ایک گلوکارہ شانتا کی کہانی پیش کی گئی ہے۔جذبات میں ڈوبی ہوئی ہلکی پھلکی کہانی، حسین اور پُر درد انداز میں دھیمی دھیمی جذباتیت کے ساتھ تصور وتخیل، تشبیہ واستعارہ کی مدد سے کامیابی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔اس افسانہ کا ایک اقتباس دیکھیں:

''یہ تنہا گوشہ ہمارے ملاپ کا مندر ہے، آؤ یہاں پھول چڑھائیں۔۔۔۔۔اور پھر آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ بھی تو ہے۔۔۔۔راجندر نے شانتا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے چوم لیا۔نہرو پارک کی شام نہ جانے کب سے منتظر تھی اس مختصر لمحے کے لیے۔'' ۱۰

نورشاہ، بے گھاٹ کی ناؤ (افسانوی مجموعہ)، ص ۱۰۳

''بارش کا پہلا قطرہ'' ایک رومانی افسانہ ہے، جس میں ایک ڈاکٹر کی روداد بیان کی گئی ہے جو قریب المرگ مریضوں کا علاج کرتا ہے، لیکن خود اپنے دل کی محبت میں ناکامی کا روگ پالے ہوئے ہے۔ڈاکٹر ہونے کے ناطے مریضوں کی زندگی بچانا اس کا کام اور فرض ہوتا ہے۔آخر میں ایک مریض شفیقہ نام کی لڑکی سے محبت ہوجاتی ہے۔اس افسانے کا ایک

اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ڈاکٹر۔۔۔کہو۔۔۔تم نے کبھی پیار کیا ہے؟

میں اپنی پلکیں اٹھا کر دیکھ رہا ہوں، سینی ٹوریم کی طرف۔اب میں کھڑکی کے اور قریب آ گیا ہوں۔میں نے اپنا بازو کھڑکی سے باہر پھیلا دیا ہے۔بارش کا پہلا قطرہ میری ہتھیلی پر کانپ رہا ہے اور میرے من کی اجڑی ہوئی بنجر دھرتی میں ایک بار پھر شگاف سا پڑ گیا ہے۔''

نور شاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)، ص ۱۴۱

افسانوی مجموعہ ''بے ثمر سچ'' میں دیپک بدکی نے نور شاہ کی عظمت اور انفرادیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''نور شاہ افسانہ نگاری کے اس رومانی اسکول سے وابستہ رہے ہیں، جو سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری سے جا ملتا ہے۔ان کے یہاں عشق کی جولانیاں ہیں۔ہجر کی کسک، انتظار کی وارفتگی ہے اور ملن کی آشا ہے۔'' نور شاہ، بے ثمر سچ (افسانوی مجموعہ)، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲

نور شاہ کے اکثر افسانے رومانی ہیں۔''زنجیریں، دائرے، آگ اور دھواں، جو میرے قریب، خوابوں کا سفر، بند آنکھوں کا سفر، تیسرا شوہر، ایک زخم اور سہی، کل کا دکھ، میرے حصے کا خواب'' وغیرہ عمدہ افسانے ہیں۔یہ سارے افسانے نور شاہ کی فنی بصیرت کی دلیل ہیں۔افسانہ ''دائرے'' جو ڈائری، خطوط اور اخباری خبر کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار پروفیسر احمد فرقان نامی شخص ہے جو اپنی ملازمت کی وجہ سے اپنی شریک حیات زیتون سے جدا ہو جاتا ہے اور اسے خط میں لکھتا ہے کہ تم سے جدا ہونے کے بعد مجھے سارا جہاں ویرانہ سا لگ رہا ہے۔سلمیٰ اس افسانے کا ایک اہم کردار ہے۔سلمیٰ پروفیسر کے پاس پڑھنے کے لیے آتی ہے، مگر پڑھنے کی بجائے وہ پروفیسر سے رومانی انداز کی باتیں چھیڑتی ہیں۔افسانے کا ایک قتباس ملاحظہ فرمائیں:

''عجیب سی لڑکی ہے، میں جب غالب کی بات چھیڑتا ہوں تو وہ عامر خان کی اداکاری کی تعریف

کرنے لگتی ہے۔میں اردوادب میں جدیدیت کی بات کرتا ہوں تو وہ سائرہ بانو اور دلیپ کمار کی
شادی کا پس منظر پیش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ان دونوں کی عمروں میں کس قدر تفاوت ہے اور پھر
وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے، اور اسی لمحے مجھے اس کی آنکھوں میں چھپی بغاوت سے
خوف آنے لگتا ہے، میں اپنی نظر پھیر لیتا ہوں۔''

نورشاہ، آسمان پھول اور لہو (افسانوی مجموعہ) ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۸

''جو میرے قریب ہے'' رومانی نوعیت کا افسانہ ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار نیلی ہے، جو محبت کے مفہوم سے صحیح طور پر نا آشنا ہے۔وہ پانچ اشخاص سے یکے بعد دیگرے محبت کرتی ہے۔ایک ایک کر کے وہ سب کو چھوڑ دیتی ہے۔آخر میں اسے منوہر نگینہ سے محبت ہو جاتی ہے، جو بہت اچھا تیراک ہے، لیکن ایک مرتبہ جب وہ اسے میلے کچیلے لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو اس کی محبت نفرت میں بدل جاتی ہے۔پھر دیو سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔''

نورشاہ کا رومانی رجحان مناظر اور فرد کے داخلی ہیجانات اور اس کی اندرونی کیفیتوں کو جذب کر کے سامنے لاتا ہے۔ان کے افسانوں کا محور تلاش حسن اور احساس جمال ہے مگر انہوں نے سماجی مسائل اور نفسیات پر بھی ایک گہری نظر ڈالی ہے۔ان کے کچھ افسانے ایسے ہیں جن میں معاشرے کی صحیح عکاسی ملتی ہے۔مثال کے طور پر ''بن برسے بادل'' میں محبت کو روپیوں کے بھینٹ چڑھتے دکھایا گیا ہے۔ناتھ اور اوشا ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن ان کے درمیان دولت کی دیوار کھڑی ہے۔رومان پرور لمحات میں اوشا اس دیوار کو ریت کا ڈھیر کہتی ہے، جبکہ محبت کو دولت سے آگے کی چیز قرار دیتی ہے، لیکن رومان پرور فضاؤں سے نکل کر جب وہ حقائق کی دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں، تو اوشا دولت کی دیوار کے سائے میں ناتھ کو ننگی دھوپ میں جھلستے دیکھ کر لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے۔

بن برسے بادل، ایک لمبی عمر کی تنہائی، پھول کی تنہائی، رات کا سورج، میری کہانی کا سچ'' اور ''عکس''، وغیرہ ایسے افسانے ہیں، جس میں نورشاہ نے انسانی نفسیات کو رومان میں ڈال کر

خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔نور شاہ نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور فنکارانہ انداز سے اس کی عکاسی کی ہے،انہوں نے جو کچھ لکھا ہے گردوپیش کے حالات کا خوردبین نگاہوں سے مطالعہ کر کے لکھا ہے۔ان کا انداز بیان بہت نرالا ہے۔

رومانیت کے علاوہ نور شاہ ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔علی گڑھ تحریک کے بعد بڑی اور شعوری تحریک جس کی بدولت اردو شعروادب میں تبدیلیاں رونما ہوئی۔

اردو میں ترقی پسند تحریک پہلی منظم تحریک تھی،جس کا ایک باضابطہ منشور تھا۔اس تحریک کی کوششیں شعوری اور مقصد واضح تھا۔ترقی پسند ادب کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ادب کو سماج کے حقیقی اور ضروری مسائل سے بحث کرنا چاہیے۔اس کو عام زندگی،تہذیب ومعاشرت،سیاست بلکہ تمام شعبوں کی خاطر خواہ ترجمانی کرنی چاہیے۔اس کے موضوع کو افادی بنانا چاہیے،نہ کہ روایت پرست اور تصوراتی ادب کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ زندگی اور اس کے مسائل سے زیادہ قریب ہو۔ادب کو زندگی کے مسائل سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کر کے بہترین ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔

ترقی پسند تحریک نے مجموعی اعتبار سے اردو ادب کے تمام شعبوں کو متاثر کیا ہے۔ افسانہ نگاروں میں پریم چند،حیات اللہ انصاری،کرشن چندر،راجندر سنگھ بیدی،سعادت حسن منٹو،عصمت چغتائی،اختر اورینوی،احمد ندیم قاسمی اور اختری انصاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ریاست جموں وکشمیر کے ادیبوں نے بھی اس تحریک کے تحت ادب تخلیق کیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کے افسانہ نگار اس تحریک سے اچھی طرح متاثر ہوئے۔ریاست جموں وکشمیر میں جس دور میں افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی،ترقی پسند تحریک اس وقت پورے شباب پر تھی۔یہاں کے افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی،پریم ناتھ تیرتھ،ٹھاکر پونچھی،پشکر ناتھ، قدرت اللہ شہاب اور نور شاہ وغیرہ نے اس تحریک سے متاثر ہو کر افسانے تخلیق کیے۔

ان ادیبوں نے ترقی پسند ادب کا برملا اظہار اپنی تخلیقات میں کیا۔اس وقت ریاست

جموں وکشمیر کے نوجوان طلبا بھی ان تحریروں کی ورق گردانی کرتے رہے جس کا اثر ان کے لاشعور پر براہ راست پڑا۔نور شاہ نے اگر چہ آزادی کے بعد لکھنے کی شروعات کی ،لیکن اس وقت بھی ترقی پسندی کا اثر باقی تھا۔نور شاہ نے بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے۔ان کے یہاں ترقی پسند عناصر جگہ جگہ ملتے ہیں۔مساوات اور انصاف کی وکالت انہوں نے ہمیشہ اپنے افسانوں میں کی ہے۔اس طرح بے انصافی اور استحصال کے خلاف نفرت اور غم وغصے کے اظہار میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے،لیکن ان کی افسانہ نگاری کی روح نہ تو جدیدیت ہے اور نہ ہی ترقی پسندی، بلکہ رومانیت ہے اور رومان ہی کو وہ زندگی کی بنیادی سچائی مانتے ہیں۔اپنے افسانوی مجموعے ''گیلے پتھروں کی مہک'' میں وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں:

''میں نے ادب کی دنیا میں پہلا قدم رکھا،تو ترقی پسندی ادیبوں اور ادب کا اثر ایک حد تک باقی تھا،اُدھر ان ہی دنوں اردو ادب کے دروازے پر جدیدیت کی جادوگرنی بھی دستک دے رہی تھی۔مجھے شور سے پہلے بھی وحشت ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔میرا خیال ہے کہ دھیمی آواز میں لہجے کو یقین کے ساتھ برتا جاتا ہے۔یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی سرگوشیوں میں بھی بات کرنا اچھا لگتا ہے۔ویسے بلند آواز میں بات کرنا نہ جرم ہے اور نہ ہی غیر قدرتی ،لیکن ایسا تب ہوگا، جب آپ کا مخاطب آپ سے بہت دور ہو،چونکہ میری کہانیوں کے کردار میرے بہت قریب رہتے ہیں،اور میں ان کرداروں میں گھل مل جاتا ہوں،اس لیے دھیمی آواز میں بات کرنے کا قائل ہوں۔ترقی پسند ادب سے میں نے کوئی شے،شعوری یا غیر شعوری طور پر اگر اپنائی ہے تو وہ ناانصافی اور استحصال کے خلاف بات کرنے کا حوصلہ،جدید ادب میں جو تکنیکی اور ہیئتی تجربے ہو رہے ہیں،ان کا بھی کچھ نہ کچھ اثر میں نے قبول کیا ہے۔''

نور شاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)،ص ۷

نور شاہ نے زندگی کو سنجیدگی اور قریب سے دیکھا ہے اور اسے فنکارانہ انداز میں اپنے فن پاروں کی زینت بنایا ہے۔زندگی کے ہر پہلو کو ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔پروفیسر عبدالقادر

سروری ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کچھ یوں لکھتے ہیں:

”کہانی لکھنے میں انھیں نہ صرف ذوق ہے، بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے۔ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح وہ ہر موضوع سے ایک موثر اور ہر موقف سے دلچسپ مرقع پیدا کر سکتے ہیں۔۔اس کے عہد کے افسانہ نگاروں کی طرح انہیں بھی مظلوم اور مفلوک الحال انسانوں سے ہمدردی ہے۔اکثر انسانوں میں انسان دوستی کے جذبے سے کام لیتے ہیں۔کشمیری عوام کی زندگی، ان کے جذبات، ان کے رنج وغم، ان کی مسرتوں، ان کی تمناؤں اور خواہشات کے کتنے مرقع ان کے افسانوں میں کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔بیانیہ کے سلسلے سے گریز، نور شاہ کی ایک عادت ہے اور اس سے افسانے میں ایک وضع پیدا ہو جاتی ہے۔“

پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ سوم) ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۴۔۲۲۵

نورشاہ کا رومانی اسلوب گردوپیش کی زندگی کے پس منظر میں پھیل جاتا ہے۔حالات کی کج روی اور سماجی ناانصافی کا عکس ان کے اسلوب میں نمایاں ہے۔جس کی مثال ان کا ایک افسانہ ”بے گھاٹ کی ناؤ“ ہے۔یہ نور شاہ کا ایک اہم افسانہ ہے۔یہ کہانی رنج وغم میں ڈوبی ہوئی ایک لڑکی کی المناک زندگی کے اردگرد گھومتی ہے۔کہانی کے مرکزی کردار زونی اور پشکر ہیں۔یہ کہانی زونی کی بدنصیب زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔پشکر تبدیلیِ آب وہوا کے لیے ایک گاؤں میں چلا جاتا ہے۔ہر رات ٹہلتے ہوئے چناروں میں ایک لڑکی کو روتے اور سسکتے ہوئے دیکھتا ہے۔گاؤں والوں سے پوچھتا ہے تو وہ اسے اس کے قریب جانے سے منع کرتے ہیں، کہ یہ ایک منحوس عورت ہے۔اس کے سر پر بھوتوں کا بڑا سایہ ہے۔

زونی کی پیدائش کے وقت ہی اس کی ماں مرجاتی ہے۔جس عورت نے اسے دودھ دینا چاہا، اس کا بچہ مر گیا اور پھر جب اس کے جوان ہونے پر اس کی شادی ایک نوجوان سے طے ہوئی، لیکن شادی سے پہلے ہی اس نوجوان کو جنگل میں سانپ نے ڈس لیا اور وہ مر گیا۔اس لیے لوگ اسے منحوس اور چڑیل کہہ کر دھتکارتے ہیں۔اسکول جانے سے روکا، کہیں سے شادی بیاہ کا

پیغام آیا تو اس کے منحوس ہونے کا چرچا۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"تم لوگوں نے میری بیٹی کو پاگل بنا دیا ہے۔ آج تک میں تم لوگوں کے دباؤ میں آتا رہا، خاموش رہا۔ مگر آج مجھے بولنے دو بابو جی! اس کی ماں اس کے پیدا ہوتے ہی مرگئی۔ اس لیے کہ سالہا سال سے بیمار تھی۔ جس عورت نے اسے دودھ دینا چاہا، اس کا بچہ مرگیا، اس لیے کہ ان دِنوں گاؤں میں چیچک کی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ سینکڑوں بچے اس بیماری کا شکار ہوئے۔ بابو جی، اس میں منحوسیت کا کیا سوال؟ یہ کہہ کر بوڑھا زور زور سے رونے لگا۔"

نورشاہ، بے گھاٹ کی ناؤ (افسانوی مجموعہ)، ص ۱۴۱

پشکر زونی سے شادی پر آمادہ ہوتا ہے، لوگ مذہب کی دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پشکر کو جبراً گاؤں سے نکال دیتے ہیں۔ زونی خودکشی کر لیتی ہے، اور چناروں کی چھاؤں میں ایک آواز سنائی دیتی ہے:

"بابو جی میں منحوس ہوں، سب یہی کہتے ہیں۔ آپ صرف ایک بار اپنی زبان سے بھی کہہ دیجیے۔ زندگی میں صرف آپ ہی ملے، جنھوں نے مجھے منحوس نہیں سمجھا۔ آخر کیوں؟ میں جا رہی ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔" نورشاہ، بے گھاٹ کی ناؤ (افسانوی مجموعہ)، ص ۱۶۳

اس طرح یہ المناک اور دردناک کہانی اپنے انجام کو پہنچ جاتی اور قاری کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ نورشاہ کے افسانے زخمی دلوں کی دھڑکنیں ہیں، سماجی کج رویوں پر بہاتے ہوئے آنسو ہیں۔ ان کی کہانیوں میں کشمیر ابھرتا ہے، اور زندگی کی المناکی عیاں ہو جاتی ہے۔

"گیلے پتھروں کی مہک" نورشاہ کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ اس میں جدید اسلوب، رومانیت کے ساتھ ساتھ ترقی پسند افکار و خیالات بھی ملتے ہیں۔ گل محمد اس افسانے کا ایک اہم کردار ہے۔ اس افسانے کے ذریعے نورشاہ کے ترقی پسند خیالات (گل محمد کے حوالے سے، جو ایک لکڑی کاٹنے والا مزدور ہے) کھل کر ظاہر ہوتے ہیں۔ گل محمد اپنے

دور دراز گاؤں سے پیسے کمانے کے لیے لولاب آتا ہے۔وہ خوب سارے پیسے کمانا چاہتا ہے، تا کہ وہ اپنے بچپن کی دوست مریم کے ظالم اور لالچی چچا کو بہت سارے روپے دے کر مریم کے ساتھ شادی کر سکے لیکن مریم کا چچا اس سے پہلے ہی مریم کا سودا ایک شکاری سے کر دیتا ہے۔نور شاہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زندگی میں پیار کرنے کا حق غریبوں اور مزدوروں کو بھی ہے اور ان سے ان کا یہ حق چھیننا نہیں چاہیے اور نہ ہی ان کا یہ حق چھینا جا سکتا ہے۔لیکن سرمایہ دار اور امیر ہمیشہ ناانصافی سے کام لیتے ہیں اور غریبوں کی محبت پہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔اقتباس دیکھیں:

''پھر بابو جی مریم کا باپ مرگیا، وہ اپنے چاچا غفور خان کے پاس رہنے لگی، غفور خان بڑا چالاک آدمی تھا، بڑا ہی مکار۔تین بیبیاں ہیں اس کی بابو جی! غفور خان مریم پر ظلم کرتا ہے۔بڑی مشکل سے روٹی دیتا ہے۔''

''تم نے مریم کی شادی کیوں نہیں کی۔؟''

غفور کہتا ہے پہلے بہت سے روپے لاد۔پھر شادی کی بات کرو۔اس لیے باجوجی یہاں آیا ہوں۔نوکری کرتا ہوں پیسہ کمانے کے لیے۔''

نور شاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)، ص ۲۰

نور شاہ کا افسانہ ''آگے خاموشی ہے'' ایک سماجی افسانہ ہے۔اس میں ایک لڑکا غربت کے مارے خودکشی کا ارادہ کرتا ہے۔چنانچہ وہ اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیتا ہے اور پھانسی کے پھندے کو پنکھے سے باندھ لیتا ہے۔اس کے بعد اسٹول پر چڑھ کر پھندے کو گلے میں ڈالتا ہے، مگر وہ خودکشی کرنے سے قبل یہ سوچتا ہے کہ اس کے والد کی موت کے بعد اس کے گھر کا کیا ہوگا۔

بنیادی طور پر اس افسانے کا موضوع غربت اور اس سے پیدا ہونے والے حالات ہیں جس کی چکی میں آج کتنے ہی خاندان پس رہے ہیں۔اس سے تنگ آ کر بہت سے لوگ

خودکشی کی طرف بھی مائل ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ افسانہ رشتہ داروں اور دوست احباب کے عدم تعاون کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے، کہ جب کوئی آدمی غریب ہو جاتا ہے تو اس کے رشتہ دار اور دوست احباب اس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں، اور اس کی مدد کرنا گویا ایک طرح سے گناہ سمجھتے ہیں۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میں تو پاپا کے مرنے کے بعد بے حد چاہت کے باجود کسی کی سپورٹ نہ بن سکا۔ چاچا اور چاچی نے کوئی مدد نہ کی، کوئی سپورٹ نہ دی۔ اپنے سالے کے میٹرک پاس بیٹے کو اچھی خاصی سرکاری نوکری دلوادی، جب کہ میں نے الیکٹرانکس میں ڈگری حاصل کر لی ہے، وہ میرے لیے بھی کچھ کر سکتے تھے، کافی جان پہچان ہے۔ ان کی زندگی اور ان کے گھر پر ہر آسائش میسر ہے۔''

نور شاہ، آسمان پھول اور لہو (افسانوی مجموعہ) ۲۰۰۵ء، ص ۲۸

اردو ادب میں اس طرح کے موضوع پر بے شمار افسانے لکھے گئے، جس میں بے روزگاری کے سبب لوگ خودکشی کر لیتے ہیں، لیکن نور شاہ نے اس افسانے کے مرکزی کردار کے توسط سے اس مسئلے کا خاطر خواہ حل بھی بتایا ہے۔ انہوں نے یہ بتانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے کہ موت کو گلے لگانا بزدلی کی علامت ہے۔ زندگی صرف اپنے لیے ہی نہیں جی جاتی بلکہ اسے دوسروں کی خوشی کا احترام بھی کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نور شاہ کے یہاں زیادہ تر رومانی افسانے ملتے ہیں، لیکن ان کے افسانوں میں ترقی پسندی کے جابجا مثالیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پروفیسر مجید مضمران کے تخلیقی سفر کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''رومان سے حقیقت تک کے سفر میں نور شاہ کا تخلیقی برتاؤ ریاست میں اردو افسانے کو ہیئتی اور موضوعاتی سطح پر کئی نوع کی تجربات سے آشنا کرتا ہے، اور اردو افسانے کے مجموعی عالمی سرمائے میں یہاں کے خارجی اور داخلی منظر کے حوالے سے ایک انفراد عطا کرتا ہے۔''

نور شاہ، جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار، ص ۷۔۸

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نور شاہ نہ صرف رومانیت کی طرف مائل ہیں، بلکہ

انہوں نے ترقی پسندی کو بھی اپنایا ہے۔اس طرح کے افسانوں میں ''وہ ایک شخص تھا، ہیلنگ ٹچ، زمین کھولے گی زبان اپنی، لکیریں، ٹوٹتے لمحوں کا بیان'' وغیرہ عمدہ افسانے ہیں، جس میں ترقی پسند خیالات کی عکاسی کی گئی ہے۔

بیسویں صدی کے چھٹے دہے میں ایک اور ادبی تحریک کا فروغ ہوا، جو جدیدیت کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تحریک دراصل ترقی پسند تحریک کے خلاف ایک ردعمل تھا۔جدیدیت کے نظریہ سازوں کا کہنا تھا کہ ادیب کی وابستگی کسی سیاسی نظریے یا کسی سیاسی گروہ کے پروگرام یا پالیسی سے نہیں بلکہ ادیب کی اپنی ذات سے ہونی چاہیے۔اس سے وابستہ حامیوں نے عصری آگہی پر زور دیا۔اس کے زیر اثر سیاسی مسائل کی جگہ عہد حاضر کے انسان کے مسائل نے لے لی، لیکن اس کے مخالفین نے اسے ایک غلط موڑ دیا اور اس کی غلط تعبیر کی اور کہنے لگے کہ جدید ادیب کو انسانیت اور سماج سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

جدیدیت کے اثرات براہ راست اردو شعروادب پر پڑے۔اس رجحان کا اثر ملکی سطح کے ساتھ ساتھ ریاستی سطح کے شعراء وادباء نے بھی قبول کیا۔اس رجحان کے تحت جو افسانے لکھے گئے وہ افکار وخیالات کے اعتبار سے اتنے جدید اور نادر نہ تھے، جتنے اسلوب اور تخلیقی رویے کے اعتبار سے تھے۔ایک طرح جہاں بلراج مین را، سریندر پرکاش، ظفر اوگانوی وغیرہ نے علامتی وتجریدی اسلوب اپنایا، وہیں احتشام حسین، زاہد مناوری اور حسین الحق وغیرہ نے اساطیری اسلوب اپنایا۔

کشمیر سے تعلق رکھنے والے جدید افسانہ نگاروں میں نور شاہ کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔نور شاہ نے اس رجحان کے تحت علامتی، تجریدی اور داستانی ہر طرح کے اسلوب میں افسانے لکھے۔لیکن نور شاہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی افسانے کے فنی تقاضوں کے خلاف ورزی نہیں کی۔ پلاٹ، کردار اور واقعات کو ہر افسانے میں برتا ہے، اس کے باوجود ان کے افسانے جدید افسانے ہیں۔شروع میں ان کے افسانوں کو جدید افسانہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، جن میں پلاٹ کو نہ برتا گیا ہو۔جدید افسانہ نگار بھی اس پر زور دیتے ہیں کہ افسانہ میں اسلوب

اور پلاٹ ضروری ہے۔ پلاٹ کے بغیر کہانی میں کہانی پن کا ہونا ناممکن ہے۔نور شاہ نے جدید افسانہ نگاروں کو راستہ دکھایا۔ اگر چہ وہ ایک رومانی افسانہ نگار ہیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے کئی اہم اور عمدہ جدید افسانے لکھے، جس میں علامتی، استعاراتی، اساطیری اور تجریدی افسانے شامل ہیں۔

نور شاہ کا ایک اہم افسانہ ''دوسرے شوہر کی خواب گاہ'' ایک جدید افسانہ ہے۔اس افسانے کا موضوع تخلیق انسان ہے۔ مرد شروع ہی سے عورت کے آگے کمزور رہا ہے۔عورت کی بنا پر ہی مرد نے سب سے پہلے ثمر ممنوع چکھا، اور اس کی پاداش میں اس کو جنت سے نکال دیا گیا۔اس وقت سے یہ سلسلہ جاری ہے، اور یہ سلسلہ مرد اور عورت کی لامحدود کڑیوں کو جنم دیتا ہے۔نور شاہ نے اس حقیقت کو استعاراتی انداز میں بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''یہ اب سے کئی لاکھ برس پہلے کی بات ہے کہ یہاں ایک جنگل آباد تھا اور اس جنگل کے عین درمیان ایک بے حد اندھیری گپھا تھی، وہ گپھا ہر نو ماہ بعد روتی اور چیختی تھی، رونے اور چیخنے کے بعد اچانک گپھا کے اندر سے انسانی خدوخال کے گوشت پوست کا ایک محرک ٹکڑا باہر نکل آتا تھا، اور جنگل میں پازیبوں کی چھن چھن سنائی دیتی تھی۔''
>
> نور شاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)، ص ۷۵

نمرتا راوی کو بار بار ہر جنم میں ملتی ہے۔ گویا مرد کے لیے عورت مقدر رہے، البتہ انسان کو زوال بھی آتا ہے، اور جسمانی وجود کا خاتمہ بھی ہوتا ہے۔ مرد کے زوال کے بعد عورت دوسرے مرد کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اور دوسرے کی خواب کی تعبیر بن جاتی ہے۔راوی جب نمرتا سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے، تو نمرتا کسی اور کے پاس چلی جاتی ہے۔

افسانہ ''چراغ گل کردو'' بھی ایک جدید افسانہ ہے، یہ افسانہ خود کلامی (Monologue) کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔خاموشی اور تنہائی کے ماحول میں افسانے

کا مرکزی کردار، دوسرے سبھی کرداروں کو یاد کر رہا ہے، جنھیں اس نے اپنا سمجھ بیٹھا۔ ان کرداروں میں ایک کلپنا ہے، جو مقامی کالج میں پڑھاتی ہے، لیکن جب اس نے کلپنا کو اپنانا چاہا تو وہ اسے یہ کہہ کر چھوڑ گئی کہ ''میرا منگیتر شہر سے آ ہی رہا ہوگا'۔ یہ سننے کے بعد اسے نوراں کی یاد آتی ہے۔ نوراں کو بھی اس نے چاہا۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے یوں کہتا ہے:

''نوراں جال ایک ہے، نہایت ہی نرم و نازک جال میں اس جال میں پھنسنا نہیں چاہتا۔''

نور شاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)، ص ۶۴

پھر آگے سوچتا ہے کہ اسد کا کیا ہوگا؟ مگر آخر کار نوراں ہمیشہ کے لیے اسد کی ہو جاتی ہے۔ کلپنا اور نوراں کے بعد صوفیہ اس کی زندگی میں آتی ہے، البتہ ایک بار پھر وہ اپنے عزیز دوست کے لیے قربانی دیتا ہے، اور صوفیہ کی شادی زاہد سے ہو جاتی ہے۔ ہر بار وہ کسی نہ کسی شہزادی کا انتخاب کرتا ہے، اور ہر بار کوئی دیو آ کر شہزادی کو اٹھا لے جاتا ہے۔

افسانہ ''بلیک آؤٹ'' بھی خود کلامی کی تکنیک میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ افسانے میں راوی شراب پی پی کر جب تھک جاتا ہے تو اپنے مکان سے باہر نکل کر دیکھتا ہے کہ اتنا زیادہ سناٹا کیوں ہے؟ اس کے سامنے صرف تین مرد اور ایک لڑکی ہے۔ مردوں کی ہوسناک نگاہیں لڑکی پر پڑ رہی ہے، لیکن وہ اس وجہ سے خاموش ہیں کہ موم بتی جل رہی ہے اور اس کی روشنی کی وجہ سے وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اچانک ایک جیٹ جہاز کی آواز سے کان گونجنے لگتے ہیں، اور وہ مرد اس لڑکی کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں، جیسے شیر اپنے شکار کو گھسیٹ کر اپنے غار میں لے جاتا ہے۔

افسانہ ''پل صراط'' بھی خود کلامی کی تکنیک میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس میں افسانہ نگار اپنے وجود کے ماضی، حال اور مستقبل کے شعور کو ایک ساتھ بیدار کر لینا چاہتا ہے۔ اس کی یہ سوچ اس کے لیے عذاب بن جاتی ہے، اور وہ سوچتا ہے:

''کاش میری سوچوں کا دم ایک ہی بار گھٹ جاتا اور اس گھٹن میں میرا ماضی، حال اور مستقبل ایک ہو کر ایک ہی بار پل صراط کو پار کرتے کرتے اس گہری ندی میں ڈوب جاتا، جو کسی یاد کی دھند میں

لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ بہتی ہے۔"

نور شاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ)،ص۷۰۔۷۱

اس ضمن میں ان کے کئی افسانوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جن میں خود کلامی کی تکنیک کو برتا گیا ہے۔ "یہی سچ ہے، کرب ریز، پل صراط، اپنے آپ کا قیدی، آگ اور دھواں" وغیرہ اس طرح کے افسانے ہیں۔

نور شاہ کے افسانوں میں جدیدیت کا اثر اگرچہ کم ہے،لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں استعاراتی اور علامتی اسلوب پایا جاتا ہے۔ان کے کئی افسانوں میں "عقاب، باز، کتا، ہڈیوں کا ڈھانچہ، برف، چنار، ابابیلیں، سفید رنگ" وغیرہ افسانوں میں بطور علامت استعمال ہوئے ہیں۔ "اڑان" ایک علامتی نوعیت کا افسانہ ہے۔ اس میں نور شاہ نے ہڈیوں کے ڈھانچے کو انسانی دنیا کے نمائندہ کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے، اور عقاب کو حیوانی دنیا کے نمائندے کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مصنف نے اس میں ویران قبرستان کی منظر کشی کی ہے، کہ یہاں ایک بوڑھا عقاب وارد ہوتا ہے۔ خوب گرمی کے باوجود یہ عقاب بیس سال سے یہیں ہے، وہ اپنا سر پروں میں چھپائے بیٹھا ہوا ہے۔ دفعتاً وہ ایک آواز سنتا ہے، اور وہ ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیکھتا ہے، دونوں آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ کہتا ہے کہ میں نے جب بلند پروازی کی کوشش کی، بلند مرتبے کی کوشش کی، تو مجھے گنبد پر بٹھایا گیا۔ اس پر بھی بس نہ چلا تو مجھے انھوں نے قبر میں دھکیل دیا۔ عقاب اس سے پوچھتا ہے کہ اب یہاں کیا لینے آئے ہو، تو وہ واپس کہتا ہے کہ:

"یہ دیکھنے کے لیے شاید صبح کی اس بے داغ روشنی نے اس دھرتی کو اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا، لیکن یہاں ---- یہاں تو اب بھی گھٹن ہے، مایوسی ہے، خالی ہاتھ اور خالی پیٹ ہیں، خون خرابہ ہے، ناانصافی اور نابرابری کا ماحول ہے، ظلم ہے اور ظالم بھی، بندوق ہے اور بندوق سے اگلتی گولیاں بھی ---- یہاں ہر صبح اپنے ساتھ موت کا پیغام لاتی ہے، اور ہر رات لاتعداد

روحیں بھڑک کر رہ جاتی ہیں۔"

نور شاہ، کشمیر کہانی، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸

بوڑھا عقاب ان باتوں پر چونک جاتا ہے کہ اس کی اور میری دنیا میں بھوک اور پیاس مشترک ہے۔ اسی طرح ان کا ایک افسانہ "مجروح قافلے کی داستان" ہے، اس میں نور شاہ نے ابابیل اور باز کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے، جس میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔

نور شاہ نے ان افسانوں کے علاوہ بہت سارے ایسے افسانے لکھے ہیں، جن میں علامتی اور استعاراتی اسلوب کو اپنایا ہے۔ ان افسانوں میں "بے نام بستی، ایک کہانی چار کڑیاں، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نور شاہ اپنے افسانوں میں بیک تکنیک سے خوب کام لیتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں "آگے خاموشی، جو میرے قریب ہے، ایک کہانی چار کڑیاں، دلہن، ایک لمحے کی تنہائی، سوداگر، نہ کہی جانے والی بات، تیسرا شوہر، ایک زخم اور سہی، خواب بکتے ہیں، اندھیرے اجالے، بند آنکھوں کا سفر، اپنے آپ کا قیدی، خوابوں کا سفر، میرے حصے کے خواب، گیلی مٹی" وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔

نور شاہ کے افسانوں میں بیانیہ تکنیک کے ساتھ ساتھ فلیش (FlashBackTechnique) بھی ملتی ۔ افسانہ "دلہن"، فلیش بیک تکنیک میں لکھا گیا ایک خیالی افسانہ ہے، کیونکہ منوہر لاج کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات ان حسین وادیوں میں گزرے ہوئے یادگار لمحے کو بھلانا نہیں چاہتا ہے۔ ماضی کی یادیں منوہر کے لیے قیمتی سرمائے سے کسی طرح کم نہیں تھیں۔ نور شاہ نے اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

"اس نے اپنی آنکھیں مسل دیں، لیکن آنکھیں مسلنے سے کیا ہوتا ہے۔ بس ایک لمحے کے لیے تاریکی سی چھا جاتی ہے، اور پھر حقیقتیں اور نکھر کر روشن ہو کر سامنے آجاتی ہیں، جیسے لاج اس کے سامنے تھی۔"

نور شاہ، آسمان، پھول اور لہو، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

جدیت کے تحت افسانہ نگاروں نے منی کہانیاں لکھیں۔نورشاہ نے بھی یہ تجربہ کیا ہے ،لیکن نورشاہ نے اپنے تجربہ سے اور اپنی فنی پختگی سے کام لے کر منی کہانی کو بھی دلچسپ اور معنی خیز بنادیا ہے۔افسانوی مجموعہ ''گیلے پتھروں کی مہک'' میں شامل افسانہ ''خودکشی'' اسی قبیل کی کہانی ہے۔اس افسانے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میں جس بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک بس دندناتی آئی اور ایک معصوم بچے کو کچلتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔خون سے لت پت اس معصوم سی لاش کے قریب بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ میں بھی قریب سرک آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ معصوم سی لاش کی ٹھنڈی کلائی کے قریب اس کی لمبی عمر کی لکیر ہنس رہی ہے۔''

نورشاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ) ص ۱۲۵

جدید افسانہ نگاروں میں ایک رجحان قدیم داستانوں، اساطیری حکایتوں اور قصوں کی بنیاد پر افسانے لکھنے کا بھی رہا ہے۔نورشاہ نے بھی اس طرح کے افسانے لکھے ہیں، جس کی مثال ان کا ایک افسانہ ''ایک راجا تھا ایک رانی تھی'' ہے۔نورشاہ نے مشرقی ممالک میں دادی اماں کی زبانی سنائی جانے والی کہانی ''ایک راجا تھا ایک رانی تھی'' کی روایت کو اپنے افسانے کی بنیاد بنایا ہے۔اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''دادی اماں سنایا کرتی تھیں، ایک تھا راجہ، اس کی تھی ایک بڑی سلطنت، سارے ملک میں اس کا سکہ اور حکم چلتا تھا۔ اسے ایک رانی کی تلاش تھی۔ اس نے حکم دیا کہ شہر کا دروازہ کھول دیا جائے۔اس دروازے سے جو عورت سب سے پہلے داخل ہوگی، وہ راجہ کی رانی بنے گی۔''

نورشاہ، گیلے پتھروں کی مہک (افسانوی مجموعہ) ص ۹۲

بہرکیف نورشاہ نے جدیدیت کے رجحان کے تحت بہت سے اچھے افسانے لکھے، جو کہ ان کے فنی مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

''نورشاہ ایک فرد کی جبلتوں پر اکثر اپنی کہانیوں میں فوکس کرتے ہیں۔نورشاہ کی کہانیوں کا یہ خاص متاثر کن اور فکر انگیز ہوتا ہے۔عصر حاضر کے معروف کہانی کاروں کا ایک اہم رول کہانی کو

اساطیری، داستانی، خیالی اور مافوق الفطرت کرداروں اور واقعات سے باہر نکال کر حقیقت نگاری سے ہمکنار کرنا بھی ہے۔ کسی افسانہ نگار کی بیدار مغزی اور روشن خیالی کا یہ واضح ثبوت ہے کہ وہ وقت کے ساتھ چلے افسردہ نہ بنے۔"

ماہنامہ "حکیم الامت" جلد ۴، شمارہ ۱۲، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۲۹

نور شاہ نے اپنے افسانے کے ذریعے کشمیر کی دلفریب وادیوں کے جیتے جاگتے مرقع پیش کیے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کی زرخیز مٹی رچی بسی ہے۔ انکے افسانوں میں کشمیر کی فضاؤں کی خوبصورت انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کے صحت افزا مقامات جن میں گلمرگ، پہل گام، مغل باغات، جیل ولر، دریائے جہلم، جیل ڈل۔ مغل روڈ سرینگر شہر کے ساتھ ساتھ کشمیر کے گاؤں کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ نور شاہ کے ایسے افسانوں میں "اشرف المخلوقات، خوشبو کا سفر، دستک، صلیب، کہانی ایک علیا کی، اندھیرے اجالے، یہ جو میرے قریب ہے، گیلے پتھروں کی مہک، تتلی، بارش کا پہلا قطرہ، اجنبی شہر کے لوگ "وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ نور شاہ نے کشمیر کے موجودہ نامسائد صورت حال کی عکاسی فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانوں میں "وہ جو ایک شخص تھا، لکیریں، زمین کھولے گی زبان اپنی، ہیلنگ ٹچ، سوداگر، کوئی رونے والا نہیں، آسمان پھول اور لہو، ایک زخم اور سہی، آگ اور دھواں، خواب بکتے ہیں، مجروح قافلے کی داستان، گھر سے گھر تک، جھیل اور سائے، یہی سچ ہے، کرب ریزے، لمبی عمر کی لکیریں، سرخ بستی، بے زمینی کا کرب، دلدل، اڑان" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

الغرض نور شاہ ایک سچے فنکار ہیں، ایک سچے ادیب کی شناخت اس کے اسلوب سے ہوتی ہے۔ وہی ادیب زندہ جاوید رہتا ہے، جس کا نیا اسلوب اور نیا اسٹائل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں نور شاہ بہت آگے نکل چکے ہیں۔

نور شاہ اگرچہ بنیادی طور پر رومانی افسانہ نگار ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے

ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی قبول کیے، اور ساتھ ہی ساتھ جدیدیت اور کشمیریت جیسے رجحان کے عمدہ نمونے ان کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ایک بڑے ادیب کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ کسی محدود دائرے میں سمٹ کرنہیں رہتا، بلکہ حالات کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اسلوب اور رویہ میں بھی تبدیلیاں لاتا ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نورشاہ ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کے اس افسانوی انفرادیت کے بارے میں چاندنی بیگم رقمطراز ہیں:

''کہانیوں اورافسانوں کی دنیامیں لوگ اپنامقام بناتے ہیں،مگرنورشاہ نے اپنے طرز بیان اور اندازتحریر سے خودہی ایک نئی دنیابسائی ہے،اور یہ دنیا بے شک جنت سے کچھ کم نہیں۔''

نورشاہ، بے ثمر سچ (افسانوی مجموعہ)، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹

............●●● ....

نقد و نظر

●...... ڈاکٹر سیفی سرونجی

کیسا ہے یہ جنوں۔۔۔ایک جائزہ

یہ مت سمجھنا کہ خون میں ہے
کرشمہ سارا جنون میں ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی فن کار اپنے فن سے جنون کی حد تک پیار کرتا ہے تو ایک دن اس کا یہی جنون اسے عالمی شہرت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔نور شاہ نے بھی اپنے فن سے جنون کی حد تک پیار کیا اور پھر اسی جنون نے انہیں دنیائے ادب میں ایک ممتاز مقام عطا کیا۔یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ جب ایک فنکار پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس کے قلم سے ایسی تخلیق جنم لیتی ہے کہ وہ ادب کا شاہکار بن جاتی ہے۔نور شاہ نے اپنی پچاس سال سے زیادہ عرصے میں ایسی ایسی تخلیقات پیش کی ہیں کہ جن کی تفصیل کیلئے تو الگ سے کتاب آنی چاہئے۔جو اس تبصرے میں گنجائش نہیں ہے۔انہوں نے اپنی پوری زندگی صرف لکھنے پڑھنے میں صرف کی ہے اور جنون کی حد تک اپنے آپ کو ادب کیلئے وقف رکھا ہے، فی الحال میرے سامنے ان کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ''کیسا ہے یہ جنون'' جس میں گیارہ افسانے کچھ ریڈیائی ڈرامے ہیں، کچھ تراجم کچھ سیلاب کی کہانیاں، فلمی فیچر بھی ہیں۔ان کے علاوہ دیپک بدکی، اشرف آثاری، پروفیسر قدوس جاوید اور شمع افروز زیدی کے مضامین ہیں۔جو نور شاہ کہانیوں سے متعلق ہیں۔اس کتاب میں سب سے پہلی کہانی ''کیسا ہے یہ جنون'' جسے نور شاہ نے اولیت دی ہے اور اسی کہانی پر کتاب کا نام رکھا ہے۔ظاہر ہے یہ کہانی انہیں زیادہ پسند رہی ہوگی اور واقعی جب کہانی پڑھی تو ذہین کے

دریچے کھلتے چلے گئے۔ یوں تو اس کہانی میں صرف ایک ایسے بچے کی داستان ہے، جو بچپن سے ہی باپ کی محبت سے محروم رہتا ہے۔ وہ تنہائی میں اپنی ماں اور دادی کی آنکھوں میں جو درد محسوس کرتا ہے، اسے نور شاہ نے بڑے ہی دردناک انداز میں بیان کیا ہے اور درد کی پوری کیفیت کو پیش کر دیا ہے کہ درد کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ درد کی ٹیس کو جس طرح محسوس کیا ہے، اسی انداز میں بیان کیا ہے کہ بارہ سال کے ایک معصوم بچے کی جنونی کیفیت جو اپنے باپ کی یادیں ہوتی ہیں۔ فضل جو کہ اس کا باپ ہے اور برسوں سے جیل میں سزا کاٹ رہا ہے اور دادی اس امید میں جی رہے ہیں۔ ایک دن وہ ضرور آئے گا۔ کہ وہ بے قصور ہے، آج اگر ہم دیکھیں تو کشمیر کے ہر گھر کا ایک فرد اپنی بے گناہی کی سزا کاٹ رہا ہے۔ نور شاہ نے یہ کہانی نہیں بلکہ کشمیری کی پچاس سالہ خون سے بھری داستان کو قلم بند کیا ہے اور تعریف کی بات یہ ہے کہ سب کچھ اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے اور کہانی میں ایسے بے شمار نوجوانوں کے درد کو بیان کیا ہے۔ جو کسی نہ کسی طور پر ظلم کا شکار ہوئے ہیں اور پھر ہر اس گھر میں جس کا بیٹا، بھائی، خاوند جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہیں۔ کہیں بے روزگاری میں مبتلا ہیں اور سسک سسک کر جی رہے ہیں، اس امید پر کہ ایک دن ان کا بیٹا، بھائی شوہر آئے گا اور ہمارے غموں کا اندازہ کرے گا۔ لیکن بقول کسی شاعر کے۔

کون بھلا فریاد کو سنتا کسی کو اتنی فرصت تھی
دیواروں پر نام لکھا ہے لیکن مرنے والوں نے

نور شاہ نے اپنی کہانیوں میں جس کرب اور درد کو بیان کیا ہے، وہ واقعی دل ہلا دینے والا ہے۔ ''کیسا ہے یہ جنون'' میں افسانے بھی ہیں، ریڈیائی ڈرامے بھی ہیں اور سیلاب کی کہانیاں بھی گویا نور شاہ نے کشمیر کے ماحول اور اپنے آس پاس کے بکھرے ہوئے ماحول کو جس درد کرب سے تخلیقی ادب دیا ہے۔ وہ ایک بڑے فنکار کا بڑا کمال ہے۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا، دل سے محسوس کیا ہے اور اسے کہیں کہانی، کہیں مضمون تو کہیں کسی افسانچے میں بیان کر دیا ہے۔ یہاں ان کی تحریر کے کچھ نمونے پیش کرتا ہوں:

افسانچے

کیا روپ کیا سروپ :"اور پھر جب عنایت نے چھ برس بعد اپنے گھر کے آنگن میں قدم رکھا تو دور و نزدیک کے بہت سارے ہمسائے اس کے باپ کو غسل دے رہے تھے، اور دفنانے کے لئے انتظامات میں مصروف تھے۔ عنایت کی اچانک آمد پر ان کے چہروں پر ایک انجان سی خوشی ٹپکنے لگی کہ اپنے باپ کی میت کو کاندھا دینے کے لئے آخر اس کا بیٹا آ ہی گیا۔ اس دنیا میں سالہا سال اکیلے پن کی تپش میں جلنے کے بعد اب شاید دوسری دنیا میں اس کی روح کو سکون میسر ہوگا۔ عنایت نے کندھے پر لٹکے ہوئے بیگ کو نیچے رکھ کر کھولا اور اس میں سے اپنا کیمرہ نکال کر میت کی تصویریں لینے لگا۔ تصویریں لینے کے بعد کیمرے کو دوبارہ بیگ میں ڈال دیا۔ Very sad but you please carry on ان تصویروں کو اپنے بچوں کو لندن میل کروں گا۔ اپنے گرینڈ پاپا کی تصویریں دیکھ کر وہ خوب enjoy کریں گے۔"

نصیحت :"جب خالد کو ایک بڑے شہر میں ایک بڑی کمپنی میں اچھی خاصی سروس ملی تو اس نے اپنے والد محترم کو اس کی اطلاع دی۔ والد محترم یہ جان کر زیادہ خوش ہوئے کہ اس کے بیٹے کو رہنے کے لئے ایک بنگلہ ملا ہے اور گھومنے پھرنے کے لئے ایک کار بھی۔ بھلا ایک باپ کے لئے اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ لیکن کچھ سوچنے کے بعد اس نے اپنے بیٹے کو لکھا۔ "میرا مالک تمہیں دن دونی اور رات چوگنی ترقی دے لیکن بیٹا اپنے نئے شہر میں گھر کے دروازے پر تم ایسا کوئی چوکیدار نہ رکھنا، جس سے ڈر کر ہمیں بھی تم سے ملے بغیر لوٹ کر آنا پڑے۔"

نور شاہ نے ان دونوں کہانیوں میں بھی ایک طویل داستان بیان کر دی ہے اور آج کل کی نئی نسل کے رویے، اس کی سوچ اور ماں باپ کو ایک کھلونے کی طرح سمجھنے کی پوری کیفیت بیان کر دی کہ وہ اپنے باپ کے جنازے کی تصویر بھی اس لئے کھینچ رہا ہے کہ اپنے بچوں کو دکھائے اور وہ انہیں دیکھ کر مزیں لیں۔ گویا اب ماں باپ بچوں کے لئے ایک کھلونا یا ایک عجائب گھر میں رہنے والی کوئی عجوبہ چیز ہو گئے ہیں۔ نور شاہ نے دونوں افسانچوں میں نئی اور پرانی تہذیب اور نئی

نسل کی سوچ کو اس خوبصورت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا بھی ایک گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی نور شاہ ایک بڑے فنکار ہیں۔ زبان و بیان پر انہیں عبور حاصل ہے اور کہانی کے فن کے تو وہ استاد ہیں اس لئے ان کی کہانیاں نہ صرف دلچسپ ہوتی ہیں بلکہ ان میں اتنی تاثیر ہوتی ہے کہ آدمی دل پکڑ کر رہ جاتا ہے اور یہ سب جنون کا ہی کرشمہ ہے۔



● ...... ڈاکٹر مشتاق حیدر

قفس اُداس ہے۔۔۔ایک تنقیدی نگاہ

ناولٹ ’’قفس اُداس ہے‘‘ وادی کے معتبر ترین فکشن نگار جناب نورشاہ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔نورشاہ فن کی ماورائی کرشمہ سازیوں پر یقین رکھتے ہیں اور زندگی وسماج کے تمام مسائل کا حل بھی فن ہی میں ڈھونڈتے ہیں۔اُنہیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ فن خصوصاً فنونِ لطیفہ انسانی زندگی کے جملہ مسائلہ کا حل ہیں۔

نورشاہ ترقی پسند دور سے لکھ رہے ہیں اور وہ ادب کے بدلتے رجحانات سے پوری طرح واقف ہیں۔انہوں نے ترقی پسندی کے عروج وزوال کو دیکھا بھی ہے، جیا بھی ہے اور برتا بھی ہے۔جدیدیت کی گھن گرج کو انہوں نے محسوس بھی کیا ہے اور اظہارِ ذات کے لئے بروئے کار بھی لایا ہے۔آج جب مابعد جدیدیت کا دور دورہ ہے نورشاہ اپنے تخلیقی سفر کو جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔ان بدلتے ادوار اور رجحانات میں جو چیز نہیں بدلی ہے وہ نورشاہ اور اُن جیسے فنکاروں کا انسانی جذبات واحساسات کے ساتھ کیا جانے والا اُن کا معاملہ ہے۔

انسان کے سینے میں جب تک دل دھڑک رہا ہے تب تک جذبات واحساسات کے طوفان بھی اُٹھتے رہیں گے اور یہ جذبات واحساسات نسل درنسل منتقل ہوتے رہیں گے۔اسی وجہ سے انسان کو سمجھنے کے لئے بڑے بڑے عالموں اور سائنس دانوں نے انسان کے ذہن ودل کو ٹٹولنے اور سمجھنے کی بار بار کوششیں کی ہیں۔ناقدوں اور ادیبوں نے بھی اس دنیا اور انسان کے

درمیان رشتوں کو سمجھنے کے لئے جبلت اور جذبہ کی کارفرمائیوں پر غور وفکر بھی کیا ہے اور خامہ فرسائیاں بھی۔

ناولٹ ''قفس اداس ہے'' مذکورہ بالا حقیقت کا بین اظہار ہے۔ اس ناولٹ کو ہم ایک طویل مختصر افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں وحدتِ تاثر کے ساتھ ساتھ دیگر کئی ایسے فنی عوامل نظر آتے ہیں جو اِسے افسانے کی ذیل میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ اس ناولٹ میں وحدتِ زماں پائی جاتی ہے جو ناول کے مقابلے میں افسانے کی عمومی خصوصیت تصور کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی ذیلی ابواب کی غیر موجودگی اس کے متن کو ایک وحدت عطا کرتی ہے۔ البتہ افسانے کے برعکس ناول یا ناولٹ میں ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ آنے والے واقعات کے سائے بہت پہلے ہی لہراتے نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے تحیر کا عنصر ایک خاص درجے سے آگے نہیں بڑھ پاتا ہے۔ زیرِ نظر فن پارے کی یہی خاصیت اِسے افسانے کی قلمرو سے نکال کر ناول کی سلطنت میں لے آتی ہے۔

''قفس اُداس ہے'' کا مرکزی کردار سلونی اسکول جانے والی ایک ایسی لڑکی کا نام ہے جو بچپن کی سرحد اور نوجوانی کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ اُس کی ماں میریا اُسے گھر کے ایک خاص کمرے سے دور رکھتی ہے جس میں اُس کی خالہ صنوبر کی یادگار چیزیں رکھی ہوئیں ہیں۔ صنوبر یعنی سلونی کی خالہ بچپن میں زبردست رقص کیا کرتی تھی۔ جوان ہو کر وہ پوری طرح رقص میں گم ہوئی۔ وہ رقص کے فن کو قدرت کی ایک عظیم نعمت سمجھتی تھی۔ ایک ایسی نعمت جو کسی بندے کو نصیب ہوتی ہے۔ اُس کا ماننا تھا کہ دنیا فن اور فنکار کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس لئے فنکار کو چاہیئے کہ فن کے اظہار میں کسی طرح کے بُخل سے کام نہ لے۔ اُس کے گھر کے افراد کا نظریہ اس کے برعکس تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ رقص کرنا شرفاء کی شان کے منافی ہے۔ لہٰذا صنوبر کو اُس سے دور رہنا چاہیئے۔ ایک مقامی ہوٹل کا مالک صنوبر کو اپنے ہوٹل میں شام کو اپنے رقص کا مظاہرہ کرنے کی پیشکش کرتا ہے۔ صنوبر یہ پیشکش پیسے کی خاطر نہیں بلکہ اپنے فن کے مظاہرے کی خاطر قبول کرتی

ہے۔اس طرح وہ اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف چل پڑتی ہے اور نتیجتاً پورا گھر ایک بڑے حزنیہ میں گھِر جاتا ہے۔صنوبرا اپنے ایک مداح فوجی پریتم کے عشق میں گرفتار ہو کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک نئی دنیا بسانے کی خاطر شہر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ یہ سب باتیں سلونی کو ماں کی غیر موجودگی میں اُس ممنوع کمرے میں رکھی ایک ڈائری سے پتہ چلتی ہیں۔

سلونی! اپنی خالہ کی طرح اپنے اندر رقص کرنے کی اتھاہ خواہش کو کلبلاتے ہوئے محسوس کرتی ہے۔اپنی ماں میریا کی رقص کے تئیں نفرت صنوبر کو رقص کے لئے مزیداً اُکساتی ہے۔ نتیجتاً وہ بھی اپنی خالہ کے نقشِ قدم پر چل پڑتی ہے اور کچھ ہی دنوں میں اپنے اسکول اور بعدازاں کالج میں ایک مشاق رقاصہ کے طور پر مقبول ہو جاتی ہے۔

اپنی ماں کے بیان کے برعکس سلونی کو پڑوس کی ایک عورت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی خالہ زندہ ہے اور وہ اپنی بہن کو خط بھی لکھتی ہے۔سلونی کو تلاشِ بسیار کے بعد گھر میں اپنی خالہ کا ایک خط ملتا ہے جس سے ایڈریس نوٹ کر کے سلونی بنا کسی کو کچھ بتائے اپنی خالہ سے ملنے ممبئی کے لئے روانہ ہوتی ہے۔مذکورہ پتے پر پہنچ کر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہت پہلے کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔سلونی کچھ دنوں تک ایک ہوٹل میں رکتی ہے اور پھر پیسے ختم ہوتے ہی پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔اسے فن کی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا کے مسائل اور مصائب سے آمنا سامنا ہوتا ہے۔اپنی انا کی وجہ سے وہ گھر جانا نہیں چاہتی،ایسے میں ہوٹل کا مالک رحمان دادا اُس کے لئے مسیحا ثابت ہوتا ہے۔رحمان دادا اُسے ایک مقامی ہوٹل ''ہوٹل انورادھا'' میں رقص کر کے اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد سلونی کو احساس ہوتا ہے کہ لوگ ''ہوٹل انورادھا'' میں اُس کے فن کی قدردانی کے لئے نہیں بلکہ اُس کی جسمانی خوبصورتی کی آگ سے اپنی آنکھوں کو سینکنے کے لئے اُس کا رقص دیکھنے آتے ہیں۔فن،فن کی قدردانی ایسے مثالی آدرشوں کے بت چکنا چور ہو جاتے ہیں۔اب سلونی زندگی کے اُس موڑ پر آگئی جہاں سے واپسی کے سارے راستے بند

ہوگئے ہیں۔ یہ پھول جسے واہ واہ اور قدر دانی کی پیاس تھی۔ ایسا ہی پیاسا تھا۔ سلونی خود کلامی کے عالم میں گویا ہوئی۔

"یہاں آ کر مجھے کیا ملا۔ گھورتی ہوئی نگاہیں جن میں اشارے پوشیدہ ہیں۔ مسکراتے ہوئے لب جن میں پیغام بکھرتے ہیں۔ ان اشاروں اور ان پیغاموں میں میرے فن کی کوئی قدر نہیں۔ یہ اشارے اور یہ پیغام میرے جسم کے لئے ہیں۔ میری جوانی کے لئے ہیں...... کاش کوئی میری روح میں اُترنے کی کوشش کرتا"

دھیرے دھیرے سلونی پر اس دنیا کی اصلیت کھلتی گئی۔ اس نے دیکھا کہ انسان اپنے چہرے پر کئی چہرے لگائے پھرتا ہے۔ خوبصورت چہرے اور خوبصورت لباس والے لوگ اندر کتنے بدصورت ہوتے ہیں۔

سلونی کو ایک اور رفنکار منوہر کی شکل میں ملا جو فلموں کے لئے گیت لکھ کر اپنا مقدر آزمانے کے لئے ممبئی آیا تھا۔ منوہر سلونی کو سیڑھی بنا کر کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ فلمی دنیا کی نبض پہچان چکا تھا اور اُس نے اپنے اندر کے فنکار کے خالص پن کو مکر و فریب سے مٹیالا کر دیا تھا۔

منوہر سلونی کے فلیٹ میں آ کر رہنے لگا اور سلونی نے اُسے اپنا سب کچھ سونپ دیا۔ لیکن جب ایک دن سلونی نے اپنے کانوں سے سنا کہ منوہر آگے بڑھنے کے لئے ایک پرڈیوسر کے ہاتھ سلونی کو سونپنے کے لئے تیار ہو گیا ہے تو اُس کی دنیا لرزہ بر اندام ہوئی۔ اُسے احساس ہوا کہ پھول کی پیاس تیزاب سے بجھائی گئی ہے۔ سلونی ہوٹل انورادھا میں اس طرح رقص کرنے لگی گویا وہ اپنے فن سے اپنی زندگی کا انتقام لے رہی تھی۔ آخرش وہ سنگ مرمر کے فرش پر اس طرح بے ہوش ہو کر گر پڑی کہ جب اُس نے نرسنگ ہوم میں اپنی آنکھ کھولی تو اس کا حمل گر چکا تھا۔

ہوٹل انورادھا کے مالک مسٹر کھنہ نے نرسنگ ہوم کے ریکارڈ میں معدے کی بیماری لکھوا کر کیس رفع دفع کروا دیا۔ ڈاکٹروں نے اعلان کیا کہ سلونی اب آگے کبھی رقص نہ کر پائے گی کیونکہ فرش پر گرنے سے اس کی ٹانگ کی ہڈی میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد ہوٹل انورادھا کا مالک مسٹر کھنہ اُسے گھر لینے کے لئے آیا۔ کھنہ جسے سلونی ہمیشہ ایک خراب انسان سمجھتی تھی آج ایک ہمدرد کی شکل میں سامنے کھڑا تھا۔ مسٹر کھنہ نے سلونی سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ اُس نے سلونی کو بتایا کہ اُس کی بیوی انورادھا بچے کو جنم دیتے ہی اس دنیا سے چلی گئی اور وہ چاہتا ہے کہ سلونی اُس کی جگہ لے لے۔ سلونی جواب میں کہتی ہے: ''عورت زندگی میں ایک ہی بار پیار کرتی ہے۔ ایک ہی بار پیار کے ساگر میں ڈوب جاتی ہے...... وہ (منوہر) میرے لئے اور میں اُس کے لئے مر چکی ہوں لیکن محبت تو نہیں مرتی، محبت تو امر ہے...... میں اپنے وطن کو لوٹ جاؤں گی۔''

اس ناولٹ میں ناولٹ نگار جہاں ایک طرف انسان کے اندر چھپے حیوانی خصائل کو سامنے لاتا ہے وہیں عشق، محبت اور انسان دوستی جیسے لطیف احساسات و جذبات کے لافانی اور ابدی خصائص کی وکالت بھی کرتا ہے۔

اس پورے ناولٹ کی فضا حقیقت اور تخیل کے بیچ معلق نظر آتی ہے۔ ناول نگار مرکزی کردار کا اپنی ماں کے مقابلے میں اپنی خالہ کی راہ پر چل نکلنے کا کوئی مضبوط جواز پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ابتدا میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار سلونی کے من میں پیدا ہونی والی خواہشوں اور امنگوں کا جواز کسی نفسیاتی یا وراثتی پسِ منظر میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی قاری اس خوش فہمی سے باہر نکل آتا ہے۔ کہانی کے کئی واقعات میں اچانک پن نظر آتا ہے جس سے کہیں کہیں پلاٹ میں جھول پیدا ہو گیا ہے۔ کئی کردار اضافی معلوم ہوتے ہیں جنہیں ناول نگار کچھ دیر تک بلا جواز کہانی کے ساتھ ساتھ کھینچ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہوٹل انوارادھا کے مالک مسٹر کھنہ کا کردار غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ کردار آخر پر کچھ حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن اُس کی حرکات یا افعال کہانی میں غیر ضروری پیوند سے زیادہ کوئی اور تاثر پیدا نہیں کر سکے ہیں۔

میریا اور صنوبر جیسے نام جہاں قاری کے ذہن میں عیسائی کرداروں کا نقش اُبھارتے ہیں، وہیں پریتم اور کھنہ قاری کے ذہن میں ہندوں کرداروں کی شبیہہ بناتے ہیں۔ اسی طرح

ذیلی کرداروں کے نام بھی قاری کے ذہن میں کسی خاص معاشرے کا توانا عکس اتارنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ نتیجتاً کرداروں کی زبان اور اُن کی شخصیت کے درمیان ہم آہنگی کی موجودگی یا غیر موجودگی کے بارے میں کوئی حتمی رائے پیدا نہیں ہو پاتی ہے۔ جبکہ ناول میں عموماً کرداروں کی زبان، ان کے ادا کئے گئے جملوں کی بناوٹ اور لب ولہجہ ترسیل معنی و منظر کے لئے اہم رول ادا کرتے ہیں۔

(بشکریہ شیرازہ اُردو، کلچرل اکیڈیمی)

..........●●● ....

●...... راجہ نذر بونیاری

کشمیر کہانی۔ ایک جائزہ

''کشمیر کہانی'' نور شاہ کے بیس اُردو افسانوں اور تین ڈراموں پر مشتمل کتاب کا نام ہے۔ ''کشمیر کہانی'' ۲۰۱۴ء میں طبع ہونے والی اُن کی تازہ ترین کتاب ہے۔ کتاب کا سرورق دیکھنے والے کو اپنی طرف نہ صرف متوجہ کرتا ہے بلکہ اسے پڑھنے کی تحریک بھی دیتا ہے۔ کتاب کا عنوان سادہ اور عام فہم ہے اور اگر اس کے نیچے افسانے/ ڈرامے نہ لکھا ہوتا تو یہ ہر گز نفسِ مضمون کی دلالت نہیں کرتا۔

کشمیر کہانی بھی ''ہماری کہانی'' ہی ہے اور جوں جوں آپ یہ کہانی پڑھتے جائیں گے آپ کو کسی جگہ یہ محسوس نہیں ہوگا کہ یہ بیس کہانیاں ہیں بلکہ صرف ایک کہانی کا گمان ہوگا۔ ایک المناک داستان جس کے صرف چند کردار ہیں...... اور ساری کہانی انہی کرداروں کے گرد گھومتی ہے...... یہ کہانی ہے علیا کی جو اس سُرخ بستی کے دلدل دھنستا جا رہا ہے...... اور تقدیر کے سوداگر نے اُس کے ہاتھ میں لمبی عمر کی لکیریں دیکھ کر کہا تھا...... تمہاری اُڑان بہت اُونچی ہوگی۔ ان کرب ریزوں کے آگے خاموشی ہے...... یہ مجروح قافلے کی داستان کے کرداروں کا ابدی مسکن ہے۔ اس بستی کے باسیوں کے لواحقین کو تسلیاں دے کر کرب ناک زندگی جینے کی سزا دی جاتی ہے اور وہ اِن خاموش وادیوں میں زندگی کا سفر جاری رکھتے ہوئے بالآخر مر جاتے ہیں......

نور شاہ کو یہ المیہ داستان رقم کرنے کی تحریک کس نے دی......؟ سچ تو یہ ہے کہ نور شاہ ایک

انسان ہے، ایک ادیب اور دانشور ہے۔ ایک کہانی کار اور حساس ذہن رکھنے والا صاحبِ نظر اور اپنے سینے کے اندر ایک دردمند دل رکھنے والا انسان ہے۔ اُس کی کہانیوں کے کردار اس کے اپنے ماحول میں رہنے والے لوگ ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ''میں جب اپنے گھر کی کھڑکی سے اُس کھلے کھلے سے وسیع قبرستان کی جانب دیکھتا ہوں تو مجھے اُن کچی پکی قبرون کے سوا کچھ نظر نہیں آتا جن پر لکھی ہوئی عبارتیں اب لفظ اور دائروں میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ میں اس کہانی کی تلاش میں اپنے گھر سے باہر آتا ہوں اور قبرستان کی جانب بڑھنے لگتا ہوں یہاں روشنی ہوتے ہوئے بھی اندھیرے ہیں...... اور روحیں سرگرشیاں کرتی ہیں...... میں اِن روحوں کو دیکھ نہیں سکتا ۔لیکن اپنے دل کی دھڑکنیں تو گن سکتا ہوں۔ اپنے لبوں کی تھرتھراہٹ تو محسوس کرسکتا ہوں۔''

نورشاہ ایک افسانہ نگار ہے...... جس شخص نے ساری عمر جنون سے سمجھوتہ کرلیا ہو...... وہ اپنے سامنے دل خراش واقعات رونما ہوتے ہوئے بھلا کیسے خاموش بیٹھ سکتا ہے۔ خالق نے اُس کے ہاتھ میں ایک طاقتور ہتھیار ''قلم'' تھما دیا ہے...... اور اُس کی کاٹ ایٹم بم سے بھی زیادہ ہے۔ اُس کے سامنے صفحۂ قرطاس ہے اور وہ اپنے ضمیر سے آنے والی صدائے احتجاج اس پر درج کرر ہا ہے۔

کشمیر کہانی دراصل وادی میں ہونے والے افسوس ناک واقعات کی منظرکشی کرتی ہے جنہوں نے ہر اُس ذی ہوش انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے جو بچشم خود ان حالات کا شاہد اور گواہ ہے۔ آپسی محبت اور انسانی رشتوں میں غیر معمولی دراڑیں، اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے بیزاری اور انحراف، مادری زبان سے لاتعلقی ...... خوبصورتی اور ماحولیاتی توازن کو بگاڑنے کی مذموم حرکات...... یہ سب اور ابھی بہت کچھ ہے کشمیر کی کہانی میں یہ کہانی نورشاہ نے خونِ جگر سے رقم کرلی ہے۔ یہ کشمیر کی تاریخ ہے جس کو لکھنے کے لئے فاضل مصنف نے ادبی زبان اور لہجے کا استعمال کیا ہے۔

وہ اپنے احساسات اور طبیعت کے ردِعمل کو ضبطِ تحریر میں لانے کیلئے جس کسی بھی Device کا استعمال کرتے ہیں، یہ اُن کا حق ہے۔ وہ کسی بھی میڈیم کا استعمال کریں لیکن اپنی قوم کو اُس کی

ماضی کی کہانی ضرور سنائیں اور یہ قوم ان دنوں جس جان لیوا بیماری کی شکار ہے اس بیماری کا علاج بھی بتائیں۔ بقولِ ڈاکٹر اشرف آثاری ''گزشتہ سال سے کشمیر میں ہی لگ بھگ دوسو کے قریب اُردو کتابیں شائع ہوئی ہوں گی۔ اِن میں کہیں نہ کہیں کشمیر کا درد جابسا ہوگا اور ضرور ہوگا۔ فرق بس اتنا ہے کہ کوئی اس صدمے سے لہولہان ہے، کوئی دم بخود اور کوما میں ہے۔ کوئی رو رو کر چلا رہا ہے۔ کسی کے خود بخود آنسو بہہ رہے ہیں۔''

''کشمیر کی کہانی'' میں شامل تین ڈرامے (۱) میری دھرتی میری جنت (۲) سفر زندگی کا اور (۳) وادیاں خاموش ہیں، اُن کی بیس کہانیوں کی تقسیم کے عین مطابق ہی ہیں۔ یہاں نور شاہ صاحب ایک کیمرہ مین لگتے ہیں جنہوں نے اُن واقعات اور مناظر کی عکس بندی زبردست مہارت اور چابک دستی سے کی ہے جنہیں اُنہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔

''کشمیر کہانی'' میں نور شاہ صاحب نے جو زبان استعمال کی ہے، یہ خالصتاً آرٹ کی زبان ہے۔ آرٹسٹ ہم میں حُسن کا احساس اور سچائی کو برداشت کرنے کا مادہ اور محبت کی گرمی پیدا کرتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ہمارے اندر اس انداز سے جگہ بنالیتا ہے کہ ہماری روح روشن ہو جاتی ہے اور جذبۂ حُسن سے سرشار ہو جاتی ہے۔ نور شاہ کی تحریروں میں آہوں، کراہوں اور آنسوؤں کے باوجود مایوسی کا عنصر کہیں نظر نہیں آتا ہے۔

(ماخوذ: شیرازہ ''جموں وکشمیر میں اُردو افسانہ نمبر)

...........●●● ....

● ...... رؤف راحت

نور شاہ کے ناولٹ۔ ایک سرسری جائزہ

۱۹۵۵ء کے بعد جدیدیت کی آمد آمد تھی ہر نیا قلمکار اس نئے رجحان سے اتنا متاثر تھا کہ کئی لکھنے والے اندھی تقلید کر کے تجریدیت اور علامت کی بھول بھلیوں میں ایسے کھو گئے کہ ان کا کہیں نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس کچھ تخلیق کاروں نے روایتی طرز اختیار کر کے ایسی کہانیاں لکھیں جن کی اساس زندگی کے مختلف النوع تجربات واحساسات پر مبنی تھی۔ انہوں نے کہانی میں کہانی پن کو بحال رکھا، جو اُس دور میں ایک انحرافی اقدام کے مترادف سمجھا جاتا تھا، جب تخلیق کار اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے خول سے نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہاں تک قاری کی موت واقع ہوتی اگر نور شاہ جیسے تخلیق کار سامنے نہیں آتے۔

نور شاہ صاحب نے اپنے تخلیقی صلاحیتوں کو صرف افسانوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے باقاعدہ ناول بھی لکھے جن میں ایک ناولٹ شاعر کے ناولٹ نمبر میں بھی شائع ہوا ہے۔ آج تک ان کے چھ افسانوی مجموعے اور تین ناول چھپ کر قارئین ادب سے داد وصول کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ڈائیری اور خاکوں کے حوالے سے دو کتابیں ''بند کمرے کی کھڑکی'' اور ''کہاں گئے یہ لوگ'' بھی تصنیف فرمائی۔ جو ان کی ادب کے ساتھ سچے کمٹ منٹ کو ظاہر کرتی ہیں۔

شاہ صاحب نے رومانی اسلوب اپنا کر عصری زندگی کے تقاضوں کو خوبصورت انداز

میں تینوں ناولٹ میں پیش کیا۔ شاہ صاحب اپنے موقف ''زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں'' پر قائم ودائم ہیں۔ انہوں نے رومانیت کے پس منظر میں چند گونگے کرداروں کو زبان دینے کی کوشش کی ہے، چند مبہم مبہم سی کہانیوں میں روح پھونکنے کی سعی کی ہے، چند حسین وجمیل اور پُر فریب چہروں سے نقاب سرکانے کی جرأت بھی کی ہے۔ جہاں تک اُردو ادب میں رومانیت کا تعلق ہے تو سجاد حیدر یلدرم نے ابتداء سے ہی شعوری طور پر اس کا آغاز کیا۔ بعد میں اس رجحان کو پروان چڑھانے میں سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری، مجنون گورکھپوری، جیسے مقتدر افسانہ نگاروں نے اہم رول ادا کیا۔ اگر دیکھا جائے تو نور شاہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب ناولٹ میں شاعرانہ اسلوب اختیار کیا ہے اگر چہ ناولٹ کے لئے شاعرانہ اسلوب اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن شاہ صاحب کی تحریروں کی چاشنی اور حلاوت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جب تخلیق کار ایسا طریقہ کار اختیار کرتا ہے جو قاری پر گراں نہیں گزرتا ہے۔ تو ایسا طرزِ اسلوب اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

شاہ صاحب کے ناولٹ میں نفسیاتی پیچ وخم کو ایسے پیش کرتے ہیں کہ قاری مسحور ہو کر ایک تخیلی دنیا کی سیر کرتا ہے۔ کہانی میں ابتدائی صورت پیش آنے سے پہلے ہی وہ اختتامی مکالمے ایسے ادا کرتے ہیں کہ پڑھنے والے میں تجسس بڑھتا ہے اور وہ شش پنج میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس بات کی تصدیق علی محمد لون کی اس بات سے ہوتی ہے:۔

> نور شاہ کی اپنی زندگی اس کے چہرے کے خدوخال کی طرح ہموار رہی ہے لیکن اس کی تخلیقات میں بڑے نشیب وفراز ہیں وہ خود شاید جن حالات، ذہنی کیفیات اور انسانی نفسیات کی بھول ......سے نہیں گذرا اُن سے اپنے کرداروں کو دوچار کر کے معیاری ادب تخلیق کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں.....!!

اکثر تخلیق کاروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ لکھتے لکھتے اوب جاتے ہیں یا ہوا دیکھ کر رخ بدلتے ہیں۔ اس کے برعکس نور شاہ پانچ دہائیوں سے مسلسل اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں

جو اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے تخلیقی سوتوں کو خشک ہونے کے بجائے ہمیشہ رومان پرور اور معطر ذہنیت سے خود کو سیراب رکھا اور اپنے ہی مسلک و مذہب پر قائم و دائم رہے۔

بہت عرصہ قبل نور شاہ نے تین ناولٹ قلم بند کئے تھے، جن میں ''آؤ سو جائیں'' شاعر ممبئی کے ناولٹ نمبر (1971) میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے ناولٹ لمحے اور ''زنجیریں'' اور ''آدھی رات کا سورج'' قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔



●...... سعید خورشید کاظمی

کیسا ہے یہ جنون ۔۔۔۔ تبصرہ

زمانۂ طالب علمی سے لے کر جب تک یہ دو رسالے 'بیسویں صدی' اور 'شمع' چھپتے رہے، میرے مستقل مطالعہ میں تھے۔ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ یا وہ شمع میں بھی چھپتے تھے یا نہیں لیکن بیسویں صدی میں جموں وکشمیر کے جو دو افسانہ نگار برابر اپنی جگہ بنائے ہوئے تھے وہ نور شاہ اور پشکر ناتھ بی، اے تھے۔ دونوں کی کہانیاں پڑھ کر مجھے عجب طمانیت حاصل ہوتی تھی۔ خوشتر گرامی کی زیر ادارت نکلنے والے اس مشہور اور معتبر ادبی ماہنامے میں کسی افسانہ نویس کے افسانے یا شاعر کے کلام کا جگہ پا جانا اس بات کا بین ثبوت ہوتا تھا کہ وہ ادیب اور شاعر واقعی سراہے جانے کے لائق ہیں۔ نور شاہ کے دوسرے رسائل میں بھی، جو کبھی پڑھنے کا اتفاق ہوتا تھا، جب کوئی افسانہ دیکھتا تھا تو اُسے سب سے پہلے پڑھتا تھا۔ ممکن ہے یہ شاید اس لئے ہو کہ وہ میری ریاست کے ایک ہونہار ادیب تھے۔ آج نور شاہ اُردو افسانوی ادب کے ایک درخشندہ اور تابندہ ستارے ہیں اور اُردو ادب میں اُن کا ایک درجہ اور مقام ہے۔ یقیناً وہ اس کے حقدار بھی ہیں کیونکہ وہ کہانی لکھنے کی بلندیوں تک پہنچ چکے ہیں۔ ساٹھ برس سے بھی زیادہ وہ اس میدان کے آج بھی بے تاج بادشاہ ہیں،۔ اُن کی کہانیوں میں الگ الگ موضوع ہوتے ہیں جنہیں وہ ہر بار الگ انداز سے پیش کرتے ہیں اور یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اُن کے تخلیقی چشمہ کی روانی میں کوئی کمی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اُن کی کہانیوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ ادیب اور شاعر وقت کا نباض ہوتا ہے۔ اُس کی تخلیق اِرد گرد کے حالات کی مستعار شدہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے اپنے طور پر اور اپنے انداز کے مطابق ان حالات کی تصویر کشی کر کے اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔ ایک ہی

واقعہ کو کئی لوگ اپنی اپنی نظر اور سمجھ کے مطابق دیکھتے اور نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کا انداز بیاں دل کے تاروں کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور پڑھنے والا دیر تک اُس کے اثر کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتا۔

پروفیسر حامدی کاشمیریؔ کا کہنا ہے کہ...... وہ (نور شاہ) اپنے افسانوں کو روایت کی زنجیروں میں جکڑ بند نہیں ہونے دیتا بلکہ افسانے کے پہلے ہی جملے سے بیان کنندہ زندہ اور متحرک ہو جاتا ہے...... پروفیسر قدوس جاوید نور شاہ کی تحریروں کے بارے میں کہتے ہیں...... وہ افسانہ لکھتا نہیں، اپنے پورے وجود کے ساتھ افسانہ جیتا ہے، کیوں کہ افسانہ/ ناول محض لسانی وادبی اظہار نہیں، فکشن کے وجود کے اندر اور باہر کی زندگی اور زمانہ کے مضمرات اور امکانات کو اپنے تمام تر تخلیقی اور دانشورانہ امکانات کے ساتھ جینے کا فنی اور جمالیاتی وسیلہ ہوتا ہے......

ان دو معتبر تنقید نگاروں کے کہے ہوئے الفاظ کی حقیقت سے آشنا ہونا ہو تو نور شاہ کی تازہ تخلیق ''کیسا ہے یہ جنون'' کا مطالعہ کریں جس میں اُن کے گیارہ افسانے تین ریڈیائی ڈرامے، انتیس افسانچے، پانچ کشمیری کہانیوں کا اُردو روپ، تین فلمی فیچر، دو بچوں اور پانچ سیلاب کی کہانیاں ہیں۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ تمام تحریریں اُن کی کسی کتاب میں موجود ہیں یا نہیں لیکن لگتا ہے کہ انہوں نے انتخاب کیا ہے اور بہت خوب انتخاب ہے۔ وادیٔ کشمیر پچھلی دو دہائیوں سے بھی زیادہ جن نامساعد اور مشکل ادوار سے گزری اور گزر رہی ہے اُس سے ریاست کے ادیب اور شاعر ہی نہیں بلکہ ملک کے دوسرے صاحب قلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ نور شاہ جیسے حساس کہانی کار بھلا کس طرح ان سے ظاہر ہونے والی تلخیوں اور زیادتیوں سے منہ موڑ سکتے تھے۔ اس مجموعہ کی پہلی کہانی جو کتاب کا سرورق بھی ہے 'کیسا ہے یہ جنون' غالباً اس واقعہ کو پیش کرتی ہے جب چند برس پہلے ایک انسان کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا تھا قطع نظر اس کے کہ وہ حقیقتاً مجرم تھا یا نہیں۔ اس پہ تمام حلقوں میں شدید طور پر مذمت کی گئی یہاں تک کہ عدلیہ سے متعلق دانشوروں نے بھی اسے انصاف کا قتل کہا کیوں کہ اُسے اپنی صفائی پیش

کرنے کے مواقع نہیں دیئے گئے۔ یہ افسانہ افضل گورو کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ بیوی ساجدہ کے استفسار پر 'تم نے اپنے ذہن وجگر میں جو خواب سجائے ہیں کیا وہ کبھی سچائی کے دامن کو چھو لیں گے، رنگ بھرنے سے پہلے ٹوٹ تو نہ جائیں گے؟ فضل کا جواب خواب ہمیشہ جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن جب میرے خواب ٹوٹ جائیں گے تو نئی صبح طلوع ہو چکی ہوگی' کیا آنے والے کل کی پیشن گوئی نہیں ہے؟ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ صرف افسانہ نویس ہیں اور اُسی میں اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔ اُنہوں نے دوسرے مضامین بھی زیرِ قلم لائے ہیں۔ 'بند کمرے کی کھڑکی' جو اُن کی ڈائری کے اوراق پر مشتمل کتاب ہے میں اُنہوں نے اپنی ادبی زندگی کے اوراق کو اہلِ نظر کے سامنے رکھا ہے اور انہیں اپنے افسانوی انداز میں الگ الگ کہانیوں کو جاذبِ نظر بنایا ہے۔ اُن کی ایک اور کتاب 'کہاں گئے وہ لوگ' بھی قابلِ تعریف مطالعہ ہے۔ اس میں انہوں نے مختلف ادبی اور دوسری شخصیات کے خاکے اہلِ ادب کی خدمت میں پیش کئے ہیں، اپنے منفرد انداز بیاں میں۔ اس کے علاوہ نور شاہ نے ساٹھ ایسے کہانی کاروں کو اپنی کتاب 'جموں کشمیر کے اُردو افسانہ نگار' میں متعارف کروایا ہے جنہوں نے افسانوی ادب کی ماضی اور حال میں آبیاری کر کے اپنا نام کمایا ہے۔ اُنہوں نے ریڈیو اور دُوردرشن کے لئے بھی سیریل لکھے۔ مختصر یہ کہ نور شاہ اُردو ادب کی ایک معتبر اور قابلِ تعظیم ہستی ہیں جن پر اُردو کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ مجھے بھی فخر ہے کہ اُن کی قُربت حاصل ہے۔



افسانچے

چوکیدار (۱)

زندگی کے نقشے پر اب صرف تین نام رہ گئے تھے اور وہ تینوں ایک ہی زنجیر کے کڑے تھے۔ بیٹا ارشد، بہو دردانہ اور سسر خواجہ صاحب۔ ارشد کی ماں، دردانہ کی ساس اور خواجہ صاحب کی بیوی کا نام اس نقشے سے چند برس قبل غائب ہو چکا تھا۔ وہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ اب بیٹے اور بہو کو خواجہ صاحب کے جانے کا انتظار تھا لیکن وہ جیسے آبِ حیات پی کر زندگی کے نقشے میں رنگ بھر رہے تھے۔ اُن دونوں کی اپنی ایک مجبوری تھی۔ میاں بیوی اپنے اکلوتے بیٹے سے ملنے ملک سے باہر جانا چاہتے تھے۔ پانچ برس قبل وہ اپنی جاب کے سلسلے میں کینڈا چلا گیا تھا اور دوبارہ لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ ہر سال آتے آتے رہ جاتا تھا، کبھی جاب کا اور کبھی چھٹی نہ ملنے کا بہانہ۔ اب تو میاں بیوی نے خود ہی بیٹے سے ملنے کے لئے کینڈا جانے کا من بنا لیا تھا۔ کاغذی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ویسے بھی وہ دونوں میاں بیوی نوکری پیشہ تھے۔ صبح چلے جاتے اور شام اُترنے سے پہلے پہلے گھر لوٹ آتے۔ خواجہ صاحب سارا سارا دن گھر میں اکیلے رہ جاتے۔ کبھی کبھی انہیں احساس ہوتا کہ وہ گھر کا مالک نہیں بلکہ چوکیدار ہے اور پھر اُن کے کینڈا جانے کے دن قریب آنے لگے خواجہ صاحب کی صورت میں بوڑھا ایک مسئلہ بن کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُولڈ ایج ہوم کی صورت میں میاں بیوی کی رضامندی سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اولڈ ایج ہوم شہر کے دو سو کلو میٹر

کی دوری پر واقع تھا۔ خواجہ صاحب کو اولڈ ایج ہوم میں داخل کرنے کے بعد میاں بیوی کینڈا چلے گئے۔ کینڈا کے ماحول میں گھل مل گئے لیکن چھ ماہ بعد جب وہ اپنے ملک، اپنے شہر اور اپنے گھر لوٹ آئے تو خواجہ صاحب کی شکل وصورت ایک بار پھر نظروں کے سامنے گھومنے پھرنے لگی۔ کچھ دن اپنے گھر کو سجا سنوار کر بیٹا اپنے باپ اور بہو اپنے سُسر کو دیکھنے کے لئے اولڈ ایج ہوم کی جانب چل پڑے۔

''میری بات کا یقین کر لیجئے۔ خواجہ صاحب کو اولڈ ایج ہوم میں آئے ہوئے ابھی چند ہی دِن گزرے تھے کہ ایک صاحب اُن سے ملنے آئے۔ وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے'' اولڈ ایج ہوم کا انچارج اپنی صفائی دے رہا تھا۔

''پھر کیا ہوا'' دُردانہ نے پوچھا

''پھر خواجہ صاحب اُن کے ساتھ چلے گئے۔ ہمارے روکنے سے بھی نہیں رُکے''۔

''کہاں گئے وہ دونوں؟''، ارشد جاننا چاہا

''میں نہیں جانتا......البتہ؟''

''البتہ کیا''

''جن کے ساتھ وہ چلے گئے ان کا فون نمبر میرے پاس محفوظ ہے۔'' انچارج نے کاغذ کے ایک پُرزے پر فون نمبر لکھا۔

امید کی ایک کرن لئے وہ دونوں اولڈ ایج ہوم سے لوٹ آئے۔ گھر آ کر فون ملانے لگے فون مل گیا اور کسی اجنبی نے اعتراف کیا کہ خواجہ صاحب اُن کے ہاں رہ رہے ہیں۔ اُن کے گھر کا پتہ حاصل کر کے وہ خواجہ صاحب کی نئی قیام گاہ پر ملنے گئے۔ ایک شاندار مکان تھا، بے حد خوب صورت لان تھا۔ رنگ برنگے پھولوں سے سجا سنورا۔ لان کی دوسری جانب کھیل کا چھوٹا سا میدان تھا۔ خواجہ صاحب چار چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے، بے حد تندرست لگ رہے تھے۔

دور سے اپنے بیٹے اور بہو کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر خوشی یا حیرانگی کی ایک لہر تک نہیں ابھری۔

وہ تینوں خواجہ صاحب کے قریب آئے۔ایک لمحے کے لئے کھیل بند ہو گیا۔

''خواجہ صاحب، آپ کا بیٹا اور آپ کی بہو آپ کو لینے آئے ہیں۔آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔''

''کہاں''

''آپ کے گھر''

''میرے گھر......میرا گھر تو اولڈ ایج ہوم ہے جہاں یہ مجھے چھوڑ آئے تھے اور جہاں سے آپ مجھے یہاں لے آئے۔شاید میرے بوڑھاپے پر ترس کھا کر''۔

''نہیں ایسا مت کہیے خواجہ صاحب۔آج میں آپ کو بتا دوں کہ آپ نے میری زندگی کے اُس موڑ پر میری مدد کی تھی جب میرے پاس کچھ نہ تھا۔آپ کی مدد سے......جی ہاں میں اُس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب آپ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔آپ کی مدد میرے لئے ایک نعمت تھی اور اس نعمت سے میں مالا مال ہو گیا۔مجھے وہ سب کچھ ملا جس کی میں نے تمنا کی تھی، آرزو کی تھی۔''

''مجھے کچھ بھی یاد نہیں آرہا ہے۔''

''آپ کو یاد کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔جب میں نے اولڈ ایج ہوم کے مکینوں میں آپ کا نام دیکھا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔میں آپ کو وہاں سے اپنے گھر لے آیا یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے میری بات مان لی۔''

''بابا میں اولڈ ایج ہوم کی بات نہیں کر رہا ہوں۔میں نے اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں ۔میرے اور دردانہ کے گھر کی بات۔بابا ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔''

''ہاں جانتا ہوں ارشد دونوں کو میری ضرورت ہے لیکن......؟

''لیکن کیا''

''بیٹا میں اپنی زندگی کے پچاسی رَن بنا چکا ہوں۔ اللہ کو منظور ہوگا تو سنچری بنا کر ہی آوٹ ہو جاؤں گا زندگی کے میدان سے اور پھر زندگی کے نقشے سے خود بخود غائب ہو جاؤں گا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خواجہ صاحب......آپ کا بیٹا، آپ کی بہو آپ کو اولڈ ایج ہوم نہیں بلکہ اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔''

''جی ہاں جانتا ہوں...... اُنہیں اپنے گھر میں میری نہیں بلکہ ایک چوکیدار کی ضرورت ہے۔''

اور یہ کہتے ہوئے خواجہ صاحب بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔!!!

............●●●............

عینک والا آدمی (۲)

اپنی بیوی کے بے حد اصرار پر آخر اس نے آئی۔کلنک جانے کا فیصلہ یہ سوچتے ہوئے لیا کہ بینائی خداوند کی جانب سے ایک انمول نعمت ہے اور یہ نعمت زندگی میں صرف ایک بار ملتی ہے اپنی باری پر ڈاکٹر نے پہلے اُس کی آنکھوں کا سرسری معائینہ کیا اور پھر اُس کی دونوں آنکھوں میں دوائی ڈالی اور پچاس منٹ تک آنکھیں بند رکھنے کی ہدایت دی۔

اور جب پچاس منٹ خاموش رہنے کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اُسے لگا جیسے ایک نئی دنیا دیکھ رہا ہو۔ دنیا کوئی نئی نہ تھی البتہ وہ آنکھیں بند کئے سوچ رہا تھا کہ جو نابینا ہیں اُنہیں دنیا کیسی لگتی ہوگی۔ ڈاکٹر نے دوبارہ معائینہ کیا اور پھر سوچتے ہوئے اُسے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ ہر انداز سے دیکھتا رہا۔ کافی دیر خاموشی سے دیکھتا رہا۔ کچھ لکھنے لگتا تو پھر رُک جاتا۔

پھر ڈاکٹر نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ شادی شدہ ہیں؟''۔

''جی ہاں''

''کب شادی ہوئی تھی آپ کی''

''بس چھ ماہ قبل''

'' آپ کی بینائی ٹھیک ہے۔ آنکھوں میں کوئی ، کسی قسم کی کمزوری نہیں ۔ دونوں آنکھیں سلامت ہیں۔ پھر آپ عینک کیوں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے جاننا چاہا۔

''میری بیوی کا اصرار ہے شاید اُسے میری بینائی میں......''

''اچھا یوں کرتے ہیں'' ڈاکٹر نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔'' آپ کی بیوی کی بات بھی مانتے ہیں اور آپ کی آنکھوں کی سلامتی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔''

''وہ کیسے''

''میں ایک نئے ڈیزائن کی ایک خوبصورت سی عینک بناتا ہوں، آپ کو پسند آئے گی اور آپ کی بیوی کو بھی۔ مگر میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا''

''میری جانب سے وہ ایک گفٹ ہوگا۔ میں کوئی قیمت نہیں لوں گا۔''

وہ من ہی من میں سوچنے لگا۔'' یہ کیسا ڈاکٹر ہے بغیر کسی جان پہچان کے گفٹ دے رہا ہے۔ گفٹ قبول کر کے یا نہ کرے......لیکن فوراً ہی اُسے اپنی بیوی کی بات یاد آئی جو گھر سے نکلتے ہوئے اُس نے کہی تھی۔

'' آج میں آپ کی آنکھوں کی خوبصورتی اُن پر لگی عینک کی وساطت سے دیکھنا چاہوں گی۔''

یہ عینک تیار کرنے میں ڈاکٹر کو دو گھنٹے لگ گئے!

اور جب وہ اپنی آنکھوں پر عینک سجا کے آئی۔ کلنک سے باہر آیا تو ڈاکٹر نے من ہی من میں سوچ لیا۔'' اس شخص کو شاید اب بھی اس بات کا احساس ہے کہ اُس کی آنکھوں کی بینائی خراب ہے، کمزور ہے۔ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ اُس کی بیوی کو عینک والے مرد پسند

ہیں اور ابھی تک وہ اپنے خاوند کو بھی عینک والے من پسند مرد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔

لیکن اُس کا انکار......یا میرا انکار......شاید وہ کسی اور عینک والے من پسند مرد کی......؟!

............●●● ....

بہاؤ (۳)

اُن دونوں معصوم معصوم سے، سندر سندر سے بچوں میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دونوں ایک ہی روز پیدا ہوئے تھے اس لئے ہر تعلق سے قریب قریب ہم عمر تھے۔ دوسری بات اس لحاظ سے اہم تھی کہ دونوں کے گھرانوں میں پچاس سالہ پرانے گھریلو تعلقات تھے شاید اس لئے کہ دونوں گھرانے ایک دوسرے ی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے تھے۔ شریفانہ اور مہذبانہ تعلقات کی وجہ سے اُن کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا، ایک دوسرے سے ملنا جلنا معمول کی بات تھی۔ دونوں بچے اسی شفقت اور پیار بھرے ماحول میں پلے بڑھے، ایک ساتھ اسکول میں پڑھائی شروع کی۔ ایک ساتھ کالج گئے۔ اُن کا آپسی پیار اس قدر اُن کے ذہنوں پر حاوی ہو چکا تھا کہ ایک دوسرے کے بغیر اٹھنا بیٹھنا، گھومنا پھرنا اور وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ایک ساتھ رہتے کبھی ایک کے گھر اور کبھی دوسرے کے گھر۔ وقت نے کروٹ بدلی۔ دونوں نے ایک ساتھ انجینئرنگ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ نوکریاں ملتے ہی دونوں کی شادیاں ہوگئیں۔ دونوں کے گھروں میں دلہنیں آگئیں۔ مسرتوں اور خوشیوں کے ڈھیر سے لگ گئے اب وہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں رہنے لگے۔ شادی کے صرف چار ماہ بعد دونوں ہر پندرہ بیس دن بعد اپنے اپنے گھروں سے دو ایک راتوں کے لئے پھر سے غائب رہنے لگے......لیکن اسی دوران ایک نئی بات سامنے آگئی۔ اُن کی بیویاں بھی اُن کی غیر حاضری میں ایک ساتھ کبھی اِس کے گھر میں اور کبھی اُس کے گھر میں اپنی راتیں گزارنے لگ گئیں......اور اس طرح ایک اور بے عنوان کہانی کا آغاز ہو گیا۔

............●●● ....

●...... محمد اقبال لون

تجزیۂ افسانچے

چوکیدار، عینک والا آدمی، بہاؤ

نور شاہ کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے ان کہنہ مشق افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ریاست میں اُردو افسانہ کے حوالے سے بنیاد گزاروں کا کام انجام دیا ہے اور یہاں افسانوی ادب کے لئے مناسب و موزوں ماحول پیدا کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اس قبیل کے افسانہ نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، موہن یاور، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نور شاہ ناول نگار، ڈرامہ نویس، کالم نویس اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں میں وادیٔ کشمیر کے لوگوں کا حسن و جمال، کشمیری تہذیب و تمدن، فن اور ثقافت اور یہاں کے حسین مناظر کا جمال و کمال نمایاں طور پر جھلک رہا ہے۔

زیر تجزیہ اُن کے تین افسانچے چوکیدار، بہاؤ اور عینک والا آدمی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان افسانچوں میں ہمارے سماج اور معاشرے میں پنپ رہی انسانی قدروں کی پامالی، اخلاقی گراوٹ، بے راہ روی اور سماجی ناہمواریوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ پہلا افسانچہ "چوکیدار" اپنے آپ میں سماج کے نام نہاد ٹھیکے داروں، بہی خواہوں اور اصلاح کرنے والوں کے لئے طنز کے تیر و نشتر سے کم نہیں جس میں افسانہ نگار نے بڑی مہارت کے ساتھ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک طرف والدین اپنے بچوں کو بڑھاپے کا سہارا جان کر کس جانفشانی اور فرض شناسی سے پالتے ہیں، دل و

جان سے ان کی پرورش کرتے ہیں اور اُن کی دیکھ ریکھ میں پوری زندگی پریشانیوں، الجھنوں اور سخت تکالیف کا سامنا کرتے ہیں اور مگر اپنے بچوں کو کسی چیز کی کمی کا احساس تک نہیں ہونے دیتے ۔مگر یہی بچے بڑے ہو کر نوکری پانے کے بعد اور خاص کر رشتۂ ازدواج کے بعد نمایاں تبدیلی کے شکار ہو جاتے ہیں۔اپنے والدین کو جائے پناہ یا سہارا دینے کے بجائے اُن سے نہ صرف منہ موڑ لیتے ہیں بلکہ اپنی ذمہ داری کو بالائے طاق رکھ کر انہیں خود خدمت کرنے کی بجائے ایرے غیرے کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں، اولڈ ایج ہومز کے حوالے کر دیتے ہیں جو کہ ان کے اخلاقی اور دینی فرائض کے بالکل منافی ہے۔اس تبدیلی کو شاہ صاحب نے بڑی فنکاری کے ساتھ دکھایا ہے ملاحظہ ہوں افسانچہ کی چند سطور......

''خواجہ صاحب، آپ کا بیٹا اور آپ کی بہو، آپ کو لینے آئے ہیں۔آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔

''کہاں؟''

''آپ کے گھر''

میرے گھر......میرا گھر تو اولڈ ایج ہوم ہے جہاں یہ مجھے چھوڑ آئے تھے اور جہاں سے آپ مجھے یہاں لے آئے،شاید میرے بڑھاپے پر ترس کھا کر''۔

اس افسانچے میں دو نکتے غور طلب ہیں۔اوّل تو یہ کہ افسانچے میں جو خواجہ صاحب کا کردار اُبھرتا ہے۔انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران جو خیر خواہی یا ہمدردی کا کام انجام دیکھے بغیر کئے ہیں اس عالم بے بسی میں وہ نیکی اُن کے کام آجاتی ہے اور جس شخص کے ساتھ انہوں نے یہ نیکی روا رکھی ہے۔اولڈ ایج ہوم میں خواجہ صاحب کا نام دیکھ کر افسانچے کا یہ کردار انہیں اپنے ٹھاٹ بھاٹ اور شان وشوکت والے گھر میں جگہ فراہم کرتا ہے اور حسن سلوک اور بڑی خوش اسلوبی سے اُن کی خاطر مدارت کرتا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے اچھے عمل ضائع نہیں ہوتے ۔دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب ان کے گھر اور ماحول میں اس

طرح گھل مل جاتے ہیں کہ انہیں یہاں سے نکلنے کا بالکل دل نہیں کرتا۔ یہاں تک اُن کی بہو اور بیٹا اگرچہ کافی تلاش و کھوج کے بعد اس گھر پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ دوٹوک الفاظ میں اپنے بیٹے اور بہو پر واضح کر دیتے ہیں کہ آپ لوگوں کو گھر میں میری نہیں بلکہ ایک ''چوکیدار'' کی ضرورت ہے جو آپ کے گھر کی رکھوالی کرے۔ اس افسانچے میں جس سلیقے سے شاہ صاحب نے ایک اہم سماجی Situation کی منظر کشی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

دوسرا افسانچہ ''بہاؤ'' پیار و محبت کی کہانی ہے جو دو پڑوسیوں، دو دوستوں بلکہ دو ہم عمر بچوں کی کہانی ہے جوان کے بچپن سے شروع ہو کر شادی کے بعد تک قائم رہتی ہے۔ اس افسانچہ میں یہ بڑی تجربہ کاری سے دکھایا گیا ہے کہ نونہال دوست زندگی کے مختلف مرحلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح پیار و محبت، شفقت و ہمدردی اور ایثار و خلوص سے پیش آتے ہیں اور زندگی کے نشیب و فراز اور دکھ سکھ میں جذباتی حد تک شریک ہو جاتے ہیں۔ دونوں دوست جنون کی حد تک ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے پر بھی راضی نظر آتے ہیں بلکہ اگر یہ کیا جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اوڑنا بچھونا ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ افسانہ نگار نے اس جذبۂ محبت و خلوص کی فطری منظر کشی کی ہے۔ کہ بغیر کسی دھوکہ و فریب، مکاری، حرص و ہوس کے یہ دوست کس طرح زندگی کی بہاریں گزار رہے ہیں۔ مگر آخر پر عجیب تاثر پیدا ہوتا ہے جس سے ایک طرف خوف و تردد کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف سماجی اور معاشرتی بدلاؤ کی فکر بھی لاحق ہوتی ہے۔ اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ جو ہماری زندگی کا جز ولاینفک یعنی بنتِ حوا کل تک گھر کے باہر جانے سے کتراتی تھی اور مردوں کی طرح اکیلے گھومنے پھرنے میں خوف و ہراس اور ہچکچاہٹ محسوس کرتی تھی آج وہی عورت بغیر کسی خوف و خطر، شرم و حیا اور بلا کسی جھجک کے ایرے غیروں کے گھروں میں دن کیا، راتیں گزارنے پر آمادہ نظر آتی ہے جو کہ ایک صحت مند اور تہذیب یافتہ معاشرہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔

متذکرہ افسانچے میں افسانہ نگار نے بے باک انداز میں اس سماجی بے راہ روی کو

اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جوان کے نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز بیان، فنی مہارت اور اُستاذی کا پتہ دیتی ہیں۔

اس تجزیے کی آخری کڑی نور شاہ کا افسانچہ ''عینک والا آدمی'' موجودہ سماج ومعاشرے کے بدلتے ہوئے رجحانات، رویوں اور انسانی اقدار کو موضوع بناتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار اپنی بیوی کے بے حد اصرار پر عینک استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے حالانکہ اس کی بینائی صحیح سلامت اور محفوظ ہوتی ہے۔ نفسیاتی طور مریض بیوی اپنے شوہر کو صرف عینک کے روپ میں دیکھنے کی متمنی ہے بلکہ اس سے بار بار تقاضا کرتی ہے کہ اس کا شوہر اپنی آنکھوں کی جانچ پڑتال ڈاکٹر سے کرائے۔ آخر ڈاکٹر باریک بینی سے جانچ پڑتال کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ مذکورہ مریض کی آنکھوں میں کوئی نقص نہیں ہے بلکہ اس کی بینائی مکمل طور پر سلامت ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ڈاکٹر سے اس بات پر بضد ہے کہ وہ اپنی بیوی کے اصرار پر اپنی آنکھوں پر عینک استعمال کرنا چاہتے ہیں تا کہ اس کی بیوی اسے دیکھ کر خوش ہو جائے۔ یہاں پر افسانہ نگار نے ڈاکٹر کے کردار سے مافوق الفطری کردار کا مظاہرہ کرایا ہے جو کہ میرے خیال میں عملی اور روزمرہ میں ممکن نہیں، جیسا کہ دکھایا گیا کہ ڈاکٹر اس مریض کو گفٹ میں عینک فراہم کرتے ہیں۔ جو کہ خلاف توقع ہے اور ہمارے معاشرے میں ڈاکٹروں سے ایسی امیدیں رکھنا محال ہے۔ افسانچہ کے آخر پر ایک لطیف نکتہ (Shade) اُبھر کر آتا ہے ملاحظہ کیجیے:

''......لگتا ہے کہ اس کی بیوی کو عینک والے مرد پسند ہیں اور ابھی تک وہ اپنے خاوند کو بھی عینک والے من پسند مرد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے......لیکن اس کے انکار...... یا میرا انکار......شاید وہ کسی اور عینک والے من پسند مرد کی......؟''

اس افسانچے کے اختتام پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ افسانہ نگار نے آخر پر دلچسپ پیرائے میں دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس افسانچے میں بیوی کے کردار کو صرف عینک والے مرد کیوں پسند ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے من پسند عینک والے مرد کے

روپ میں دیکھنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی بیوی کو کسی اور عینک والے من پسند مرد سے قربت رہی ہو اور وہی اس کو بھاتا ہو، اس لئے آج وہ اپنی حقیقی شوہر کو اس روپ میں ڈھال کر اُن کی آنکھوں پر عینک دیکھنا چاہتی ہے۔ شاید وہ اس سے اپنے من پسند عینک والے مرد کی حسرت پوری کر کے دیکھنا چاہتی ہو۔ یقیناً یہ افسانچہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے بلکہ نور شاہ کی فنی کاریگری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ زبان و بیان کا نفیس برتاؤ، دلکش اسلوب کی چاشنی قاری کو دعوت مطالعہ دیتی ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موضوع افسانے کی روح ہے اور افسانہ کردار پلاٹ، زماں و مکاں، وحدت تاثر اور اسلوب تمام اجزاء کو متاثر کرتا ہے اور متحد رکھتا ہے۔ نور شاہ صاحب کے یہ تینوں افسانچے اس حسین امتزاج کی بہترین مثال ہیں۔ ان میں موصوف کا افسانوی انداز بیان، زمانی سوز و گداز، اشاریت، ایمائیت اور رمزیت اُن کے پختہ کار افسانہ نگار ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے معانی اور الفاظ کے مختلف (Shades) کو فنی بالیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ موضوع کتنا دلچسپ ہو، اس کی ترتیب کتنی فنی ہو لیکن اگر اظہار کے لئے مناسب زبان استعمال نہ کی جائے تو تمام تر تکنیکی و فنی محاسن کے باوجود افسانہ کامیاب فن پارہ نہیں بن سکتا۔ اس لئے فن کار کو مناسب لفظیات اور اصطلاحات کے استعمال پر دسترس لازمی ہے تا کہ خیالات کی مکمل طور ترجمانی ممکن ہو۔ اس اعتبار سے افسانے کا فن نور شاہ کی فطرت کے ساتھ پیوست ہے اور زبان و بیان پر عبور اور ان کا منفرد افسانوی ڈکشن انہیں امتیازی مقام عطا کرتا ہے۔



تحفۂ درویش

گلاب کا پھول

شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بھولا بسرا منظر گھوم گیا۔

''دیکھئے بابو جی! گلاب کا پھول اپنے کوٹ میں نہ لگایا کریں۔!''

اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیوں، مٹھو میاں......؟''

اب مٹھو میاں کیا جواب دیتا۔ بس خاموش رہا۔ ویسے مجھے باتیں بنانا آتی ہیں، ویسے میں ہر بات کو سمجھتا ہوں۔ کیا ہوا اگر ان پڑھ ہوں۔ ویسے ہوں تو ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا نور چشم۔ کیا ہوا جو اچھا گھرانا نہ رہا۔ دیکھتے دیکھتے میرے جیسے اور بھی کئی فقیر ہو گئے۔ چپراسی بن جانے سے خاندانی بو باس نہیں جاتی۔ کیا ہوا اگر میری شادی نہ ہوئی۔ ہمارے خاندان کے مردوں نے تو تین تین شادیاں کی تھیں۔ زمین جائیداد نہ رہی۔ سر پر اپنوں کا ہاتھ نہ رہا تو کیا برسوں پرانی خاندانی وجاہت ملیامیٹ ہو گئی۔ پیار کی بھوک ختم ہو گئی۔ جوانی میں بڑھاپا آ سکتا ہے لیکن وہ اندر کے پیار کی حِس کو تو فنا نہیں کر سکتا۔ مٹھو میاں بننے سے تو میں بڈھا نہیں ہو گیا۔ اب تک کی زندگی میں بڑھاپے کا احساس مجھ میں صرف ایک بار جاگا تھا، جب میں نیا نیا چپراسی بھرتی ہو گیا تھا اور دفتر کی ایک خوبصورت الھڑ سی کلرک لڑکی نے مجھے مٹھو چاچا کہہ کر پکارا تھا۔ میں نے ترنگ میں آ کر صاف صاف کہہ دیا تھا۔

میرا نام مٹھو چاچا نہیں۔ چاچا بننے سے پہلے دو تین بچوں کا باپ بننا چاہتا ہوں، اس

لئے مجھے مٹھو رام کہہ کر پکاریئے یا مٹھو میاں حالانکہ میاں کا لقب بھی مجھے پسند نہیں، البتہ اگر چاہو تو مٹھو جی کہہ کر پکار سکتے ہو۔ ہاں مٹھو جی!''

لیکن یہ آخری فقرہ میں نے اُس لڑکی سے نہیں کہا تھا بلکہ صرف اپنے من میں سوچا تھا۔ تب میں کچھ باتیں بابو لوگوں اور بابو چھوکریوں سے کہہ دیتا تھا۔ من میں نہیں سوچتا تھا اور کچھ باتین اپنے من میں سوچتا تھا کہہ نہیں پاتا تھا۔ کچھ ایسی ہی بات تھی اگر بابو مٹھو رام ہوتا تو دوسری بات تھی، لیکن مٹھو میاں ایک چپراسی کی خاکی وردی میں۔ یہ سب کچھ بھلا کیسے زبان پہ لاتا؟ خیر جانے دیجئے۔ بات شام بابو اور گلاب کے پھول کی تھی۔ میں اپنے اندر کے میاں مٹھو کی ٹیں ٹیں بیچ میں لے آیا۔ بیکار سی کھوکھلی ٹیں ٹیں!

کیوں جی۔ لڑکی کا قد پورے پانچ فٹ ہو۔ رنگ ہلکا گندمی ہو، آنکھیں مست مست رُخسار گلابی گلابی اور دانت سپید سپید موتیوں جیسے تو کیا اُسے خوبصورت کہا جا سکتا ہے؟ اگر ہنستے وقت اس کے رخساروں میں ایک ہلکا سا گڑھا پڑ جائے۔ چلتے وقت انگ انگ رقص کرے۔ باتین کرتے وقت کانسی کے کٹورے سے بجنے لگیں تو کیا اُسے خوبصورت کہا جا سکتا ہے؟ رانی کی بات کر رہا ہوں۔ میرے پہلے دفتر میں کلرک تھی۔ جہاں صرف دس بارہ چھوٹے بڑے بابو تھے۔ میرے نئے دفتر میں تو بہت زیادہ عملہ ہے۔ سب کے سب غریب ہیں، اپنی اپنی مجبوریوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ زمانہ ہی مہنگا ہو گیا ہے۔ پہلے دفتر والی بات اب کہاں؟

ہاں تو شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول لگا دیکھا تو پہلے دفتر کی ایک بھولی بسری یاد آ گئی۔ وہ کمرہ یاد آ گیا، جس میں رانی بیٹھتی تھی۔ بھولا بابو اور سعید بابو بیٹھتے تھے دفتر میں دو تین کمرے اور بھی تھے۔ ایک ہیڈ کلرک کاظمی کا کمرہ تھا اور باقی دوسرے چھوٹے موٹے بابو لوگوں کے، لیکن زیادہ چھل پہل رانی ہی کے کمرے میں رہتی۔ ایسی چھل پہل جو صرف اشاروں اور سرگوشیوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ زبانیں عموماً خاموش رہتیں۔ آنکھیں باتیں کرتیں۔ ایسی ہی چھل پہل میں ہر کوئی ایک دوسرے سے بے خبر اور بے نیاز رانی کو اپنانے کی فکر میں تھا۔ ہر کوئی

اس جستجو میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی تگ ودو میں تھا۔ کاظمی صاحب بھی اپنی ادھیڑ، مریل سی عمر میں رانی کی طرف کھینچتا جا رہا تھا، اُس کا قصور نہیں تھا۔ بیوی کے سوا اُسے کسی دوسری عورت کا قرب حاصل نہیں ہوا تھا۔ ہوا بھی کبھی ایسا حادثہ تو پسینے چھوٹ گئے بیوی سامنے آ گئی۔ کاظمی صاحب اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا جس طرح ایسی عمر میں عام طور مرد ڈرتے ہیں لیکن رانی کی اور بات تھی وہ دفتر میں معمولی کلرک تھی۔ ہر گھڑی ہیڈ کلرک سے واسطہ پڑتا۔ بار بار اُسے بُلوایا جاتا۔ دوسرے سمجھتے کام کے لئے بُلایا جاتا ہے لیکن میں سب جانتا تھا۔ ہاں تو کہہ رہا تھا سب بابو لوگ، چھوٹے بڑے بیاہے، بن بیاہے رانی کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے رہتے، ایسا کیوں نہ ہوتا رانی ایک پھول ہی تھی۔ ایک رس بھری ہی تھی۔ میں دیکھتا رہتا۔ بینائی ذرا کم تھی صاف دکھائی نہ دیتا تھا، صاف صاف دیکھنے کے لئے میں نے عینک بھی چڑھا لی اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ بھولا بابو کے سوا اور کوئی میرے ساتھ سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا تھا۔ سب مجھے گھور گھور کر دیکھتے جیسے میں چپراسی نہیں خفیہ پولیس کا آدمی تھا لیکن بھولا بابو کی بات دوسری ہی تھی وہ نام اور شکل ہی کا بھولا نہ تھا دل کا بھی بھولا تھا! اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ رہنے والا بابو! خاموش اور گھمبیر چہرے پر گہری اداسی کی جھلک لئے ہوئے سنجیدگی۔ آواز بھی پیاری مٹھاس بھری، باتیں کرتے آنکھیں خود بخود جُھک جاتیں۔ ہنستے وقت تو چہرے پر شوخی آ جاتی ہے لیکن بھولا بابو کی ہنسی میں بھی سنجیدگی تھی۔ سنجیدگی جس میں دنیاداری کی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے اور خاندانی شرافت کی قدروں کا پاس بھی۔ عمر میں سب سے چھوٹا تھا، سب سے زیادہ معصوم تھا، خوبصورت اور محنتی تھا، جوانی کی ایک خاص عمر میں گہری سنجیدگی اور معمر خاموشی انسان کو روگی بنا دیتی ہے۔ اپنے بزرگ ایسا ہی کہا کرتے تھے، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سنجیدہ اور گھمبیر رہتے ہوئے بھی اس کا چہرہ گلاب کی طرح کِھلا ہوا تھا۔ اپنا کام ختم کر کے دوسروں کا ہاتھ بٹاتا۔ رانی نئی تھی۔ بھلے گھر کی لڑکی تھی، بے سہارا تھی، کلرک بن گئی۔ کلرکی میں کام کم ہوتا۔ مغز کھپائی زیادہ، وہ مغز کھپائی کی عادی نہ تھی جھنجھلا اُٹھتی۔ رو پڑتی، خاموش طبع تھی۔ کسی کو اپنا دُکھ درد بتاتی بھی نہ تھی۔

بتاتی بھی کسے، وہاں چاہنے اپنانے والے تو تھے۔ لیکن ڈر، جھجک کے مارے خاموش بیٹھے صرف تاکتے۔ دل میں چور ہو تو محبت بھی چوری ہی نظروں سے کی جاتی ہے۔ اپنے محلے کے مولوی اللہ رکھا کہا کرتے تھے اور سچ ہی کہا کرتے تھے، لیکن بھولا بابو کی بات ہی کچھ اور تھی، ایک دو بار رانی کو پریشان دیکھا تو اُسے اپنے پاس بُلایا۔

''دیکھئے آپ جتنا کام آرام اور آسانی سے پانچ بجے تک کر سکتی ہیں کر لیا کریں باقی کام میں سنبھال لیا کروں گا۔ احسان نہیں کر رہا۔ یہ انسانی فرض ہے۔ پریشان ہو کر رونا اپنی کمزوری کا مظاہرہ کرنا ہے، جو گناہ سے بدتر ہے۔''

رانی نے اپنی جھکی ہوئی نظروں سے بھولا بابو کو ایسے دیکھا جیسے جس فرشتے کی اُسے تلاش تھی وہ اپنے پاس ہی بیٹھا مل گیا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اپنی خوشی کا اندازہ میں اپنی اُداسی سے لگاتا ہوں۔ اُداس ہو جاؤں تو سمجھ لیتا ہوں کہ آج بہت خوش ہوں۔ کچھ پا لیا ہے۔ اور اس کے بارے میں سوچنا چاہتا ہوں۔ بھولا بابو اور رانی کو ایک دوسرے کے قریب آمنے سامنے دیکھا۔ تو اُداس ہو گیا اور پھر تو میں روز ہی اُداس رہنے لگا۔ اب دونوں کُھل کر باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا بھی دیتے۔ چند دنوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہونے لگا کہ اُداس میں ہی نہیں، دوسرے بابو لوگ بھی اُداس رہنے لگے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں اُداسیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بھولا بابو بدل رہا تھا۔ اُس کی باتیں بدل رہی تھیں ایک عجیب نئی سی تبدیلی عیاں ہو رہی تھی۔ سنجیدگی کے گہرے بادل بھی چھٹنے لگے تھے، لیکن اُس کی تبدیلی اتنی تعجب خیز نہ تھی جتنی کہ رانی کی۔ اب وہ ایک مسکراتی ہوئی کلی بن گئی تھی۔ ہر ایک سے کُھل کر، ہنس کر باتیں کرتی جیسی اس کی اکیلی تنہا زندگی کو کوئی خوبصورت سہارا مل گیا ہو۔ بھولا بابو کی تبدیلی جہاں سب کو کھائے جا رہی تھی، وہاں رانی کی تبدیلی سب کے لئے ایک شگفتہ بہار بن رہی تھی اور بہار کی آمد کے سواگت کی تیاریاں ہر ایک کے چہرے اور لباس سے مترشح تھیں۔ ان ہی دنوں ان تبدیلیوں کے چکر میں ایک خاص بات ہوئی، وہ یہ کہ اب بھولا بابو کے کوٹ میں گلاب کا ایک پھول بھی

دکھائی دینے لگا تھا۔ ویسے تو عام سی بات تھی لیکن وہ عام سی بات خاص یوں ہوگئی کہ لنچ تک گلاب کا پھول بھولا بابو کے کوٹ میں رہتا اور اس کے بعد رانی کی انگلیوں میں چلا جاتا۔ میں نے دیکھا حسبِ فطرت اُداس ہوگیا۔ دوسروں کی نظریں بھی پڑیں حسب عادت جل گئے۔ ایک دن میں نے کاظمی صاحب کے تیور بھی بدلے ہوئے دیکھے۔ کہیں اس نے بھی گلاب کا پھول بھولا بابو کے کوٹ سے اُڑ کر رانی کے ہاتھوں میں پہنچتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً حکم ہوا کہ بھولا بابو کی میز اُس کے خاص کمرے میں لگادی جائے حکم کی تعمیل ہوئی اور میز خاص کمرے میں لگادی گئی۔ بھولا بابو کے لئے کوئی فرق نہ پڑا۔ اب وہ کاظمی صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتا۔ صرف اتنا سا فرق پڑتا کہ پہلے کاظمی صاحب دن میں کوئی درجن بار رانی کو اپنے کمرے میں بلواتا تھا، اب درجن بار خود ہی رانی سے ملنے دوسرے کمرے میں جاتا لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر نہ چلا۔ ایک دن اُس نے بھولا بابو سے کہا۔ میرے کمرے میں بیٹھنے سے تم نے کافی بقایا کام ختم کردیا، وہ بیچارہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

کاظمی صاحب نے پھر کہا

''دفتر میں لائٹ کام کس کے پاس ہے؟''

بھولا بابو نے فوراً جواب دیا

''لائٹ کام تو رانی ہی کو دے رکھا ہے۔ نئی نئی ہے۔ سیکھ رہی ہے۔ پھر وقت بے وقت اس کا ہاتھ بٹانے کی ضرورت ہے۔''

کاظمی صاحب نے ایک لمبی بدبودار سانس چھوڑ دی۔

''ٹھیک ہے تم واپس اپنے کمرے میں چلے جاؤ''

بھولا بابو چونکا

''آپ کا مطلب ہے رانی کا ہاتھ بٹادیا جائے!؟''

کاظمی صاحب نے تھوڑی دیر خاموشی کے بعد اپنے دل کی بات نکالی۔

"ہاں ایسا ہی خیال ہے۔ تمہارے پاس اپنا ہی کام بہتیرا ہے۔ وہ میرے کمرے میں بیٹھا کرے گی، میں اُسے سمجھا دیا کروں گا۔"

بھولا بابو کی میز پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ گھمبیر سی مسکراہٹ سنبھالے وہ پرانے سے نئے کمرے میں گیا تھا۔ وہی مسکراہٹ لئے پھر نئے سے پرانے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے لئے تو کوئی فرق نہ پڑا لیکن اس آنے جانے کے دوران میری ادائیاں کافور ہو گئیں، شاید میرے اندر کے مٹھورام کی خوشی مر گئی تھی اور رانی بھی شاید خوش نہ تھی۔ کاظمی صاحب کے کمرے میں اُس سے گھٹن سی محسوس ہوتی۔ سروس کا معاملہ ہے۔ گھٹن ملے چاہیئے تازگی، کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ آج یہاں بیٹھ کر، کل وہاں بیٹھ کر، مجھے خود کئی کمرے، کئی افسر اور کئی دفتر آج تک بدلنے پڑے ہیں۔ دوسروں کے دل کا حال تو نہیں جانتا، لیکن مجھے رانی کی گھٹن کو دیکھ کر بہت کوفت ہو گئی، اور میں اُسے برداشت نہ کر سکا۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے ایک کھوئی ہوئی لڑکی ہو۔ تنکے کا سہارا ملا تھا وہ تنکا ہی ٹوٹ گیا، حالانکہ اب اُسے ایک مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ کاظمی صاحب کا سہارا! وہ بڑے پیار سے اُسے کام سمجھاتا ایک بات نہ جانے کیوں میں محسوس کر رہا تھا کہ کام سمجھاتے، سکھاتے کاظمی صاحب بُری طرح سے رانی پر جھک جاتا جیسے اُسے نوچ کھانے کی سوچ رہا ہو۔ وہ رانی سے بھونڈے مذاق کرتا اور رانی سب کچھ جانتے ہوئے بھی مسکراتی رہتی، بالکل گاؤں کی الھڑ جاہل لڑکیوں کی طرح، جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو، جیسے جانتی ہو اور اچھی طرح لیکن......؟!"

رانی کے کاظمی صاحب کے کمرے میں چلے جانے سے دوسرے بابو خاموش ہو گئے تھے۔ بھولا بابو سے چڑنے لگے تھے کہ خشک زندگی میں اچانک شبنمی پھوار کا لمس حاصل ہوا تھا، اس کی بدولت چھن گیا۔ بھولا بابو کے لئے تو کوئی خاص فرق نہ پڑا تھا لیکن ان سب کی زندگی بے کیف اور بے رونق ہو گئی تھی۔ امیدیں بندھ کر ٹوٹ گئی تھیں۔ دوسری دفتر کی کہانیوں کی طرح وہ بھی ایک کہانی تھی جن کی ابتداء روز ہوتی، لیکن انتہا تک کبھی نہ پہنچتیں۔ میرے خیال میں رانی کی کہانی بھی ویسی ہی کہانیوں میں سے تھی، لیکن اُس کی ابتدا جتنی خاموشی سے، آہستہ سے ہوئی،

اُتنی جلدی اُس کا انجام بھی ہو گا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ بات معمولی سی تھی۔ کاظمی صاحب ابھی اپنے خیالوں کے آدھے ہی راستے میں تھا کہ اُس کے چہیتے کلرک سعید بابو نے سب کی طرف سے شکایت کی کہ رانی اور بھولا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور محبت کی پینگیں بڑھائی بھی جاتی ہیں۔ دفتری اوقات میں۔ یہ دونوں کا پرائیویٹ معاملہ ضرور ہے، لیکن دفتر میں دوسروں کے لئے بے چینی اور شکایت کی موجب ہے۔ کاظمی صاحب نے سُنا تو ادھیڑ عمر دل اور دماغ ہل گئے۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ اُس نے اپنے طور پر جو بات بیچ میں ہی ختم کردی تھی وہ ختم ہونے کی بجائے اب مکمل ہو رہی تھی۔ پایۂ تکمیل تک پہنچنے والے تھی۔ رانی اُس وقت میرے ساتھ دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ ساری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے سوچا قصہ ختم ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے میری اُداسیوں کو چھٹکارا ملا۔ لیکن تعجب ہوا۔ شام کو پانچ بجے کے بعد دونوں دفتر میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ رانی ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو گئی اور دبی زبان میں پوچھا۔

''آپ نے کبھی اپنے مستقبل کے بارے میں بھی سوچا ہے!؟''

بھولا بابو نے اپنی زندگی کا پہلا بھرپور قہقہہ لگایا۔

''میں تو حال کا آدمی ہوں۔ مستقبل دور ہے۔ ایک لمبی چھلانگ کی ضرورت ہے اور میں تو ایک کمزور انسان ہوں۔ لیکن......''

رانی نے بات کاٹ دی۔

''حال کے آدمی ضرور ہیں، لیکن اپنے حال سے بے خبر ہیں۔''

بھولا رام نے اپنے بھولے پن کا ثبوت دیا۔

''میں اپنے حال سے باخبر ہوں۔ مجھے اپنے ایک ایک لمحے کا علم ہے!''

''کبھی اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھنے پرکھنے کا وقت بھی ملتا ہے یا نہیں؟''

''میرے آس پاس رکھا ہی کیا ہے، دفتر میں فائلیں، گھر میں گھر ایک دفتر اور ایک گھر

اور ایک......''

''اور میں''

''تم ضرور ہو۔ ہمیں ایک دوسرے کا سہارا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔''

رانی نے بھاری آواز میں کہا۔

''آپ کے پاس دل ہے لیکن دل کی دھڑکنیں نہیں ہیں......دماغ ہے لیکن......''

''میرے پاس دل کی دھڑکنیں بھی ہیں، دماغ کی سوچیں بھی ہیں۔ یہ غلط فہمی تمہیں کیسے ہوئی؟ اس طرح کی باتیں کرنے کی آج ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی۔ میرا دل کسی کے لئے دھڑکتا بھی ہے، اور کسی کے لئے سوچتا بھی ہے، اگر نہ سوچتا تو میں تمہیں......''

''اگر آپ کا دل کسی کے لئے دھڑکتا، دماغ کسی کے لئے سوچتا تو مجھے آج یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی۔''

''تمہیں کاظمی صاحب نے کچھ کہا ہے؟''

''سب ہی کچھ نہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں بھی کہہ رہی ہوں۔ لیکن آپ بُت بنے بیٹھے ہیں۔ دوسرے سب کچھ جان گئے۔ آپ بھولے ہی بنے رہے!''

''اصل بات کیا ہے؟''

رانی جیسے رو رہی تھی۔

''مجھے آپ کا سہارا نہ ملتا تو میں نے کب کی نوکری چھوڑ دی ہوتی۔ میں چاہتی ہوں یہ سہارا قائم رہے۔ چاہتی ہوں ہم دونوں۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

میں دروازے پر دم بخود بیٹھا تھا

بھولا بابو نے رُک رُک کر بات شروع کی

''دیکھو رانی! تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں بے سمجھ ہوں۔ کیونکہ میرے لئے یہ سب کچھ نیا ہے۔ میرے ساتھ ایسی کبھی نہیں بیتی۔ تم نے میرے سہارے کو کچھ اور ہی سمجھا۔ میری سمجھ کو کچھ اور ہی رنگ میں لیا جو دوسرے تمہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے ویسا تمہیں کبھی نہ سمجھا، جیسے دوسرے تمہیں دیکھتے ہیں، میں نے ویسے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ میں دوسرے ساتھی کلرکوں کی طرح تمہیں بھی ایک کلرک ساتھی ہی سمجھتا ہوں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا، ہنسنا، مسکرانا، سہارا بننا ہم سب کا فرض ہے۔ احسان نہیں جس کا بدلہ ایسی ویسی محبت سے چکایا جائے۔ اگر تم میرے دل کی محبت اور پیار کی بات پوچھتی ہو تو مجھے محبت ہے جنوں کی حد تک۔ اور رانی......''

رانی چیخی۔

''میں بھی تو محبت......''

بھولا بابو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہاں میں بھی محبت ہی کی بات کر رہا ہوں، مجھے محبت ہے اور آخری حدوں تک......''

رانی نے بھرائی آواز میں کہا

''بھولا بابو''

''ہاں......لیکن وہ محبت صرف اپنی......صرف اپنی بیوی سے ہے!''

''بیوی......؟!''

''ہاں بیوی! جو تمہاری ہی جیسی ایک لڑکی ہے خوبصورت اور معصوم جو کبھی تمہاری ہی طرح بے سہارا تھی اور رانی......! کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے، ایسا ہوتا ہے، حالانکہ ہونا نہیں چاہیئے کہ دو دل......''

دروازہ کھٹاک سے کھلا

میں دیوار سے لگ گیا

رانی بجلی کی طرح سیڑھیوں کی جانب لپکی، گلاب کا پھول ردی کی ٹوکری کے پاس پڑا تھا۔

میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اُٹھالیا

دفتر بند کرتے ہوئے میں نے بھولا بابو سے پوچھا

''سب ٹھیک ہے لیکن ایک بات جاننا چاہتا ہوں کیونکہ آج تک، اب تک میں سب کچھ دیکھتا آیا ہوں، سُنتا آیا ہوں۔''

بھولا بابو کے چہرے پر وہی پرانی گھمبیر مسکراہٹ تھی اُس نے مدھم سُر میں پوچھا

''کیا؟''

''سب ٹھیک ہے لیکن یہ بچارا گلاب کا پھول......؟!''

اس نے پھول میرے ہاتھوں سے لے کر اپنے کوٹ میں لگایا اور سیڑھیاں اُترتے کہنے لگا۔

''اُس میں میرا کیا قصور ہے۔ ہمارے گھر میں جب سے گلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ میری بیوی ہر روز صبح میرے کوٹ میں ایک پھول لگا دیتی ہے اگر رانی خود ہی پھول کوٹ سے اُتارے اور اس کی کہانی بنا ڈالے تو اس میں میرا کیا دوش؟''

میں خاموش ہو گیا

اور دوسرے دن بڑے صاحب کو سلام کر کے نئے دفتر میں تبادلہ کروالیا آج بہت مدت کے بعد شام بابو کے کوٹ میں گلاب کا پھول دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں بھولا بابو اور رانی یاد آ گئے، حالانکہ نئے دفتر میں شام بابو تو ضرور ہے بالکل بھولا بابو کا گھمبیر روپ۔ لیکن رانی کوئی نہیں......!!!

..........●●●..........

کیسا ہے یہ جنون!

درد کا کوئی وقت نہیں!

میرا نام عامر ہے اور میری عمر لگ بھگ بارہ برس کی ہے، بھلا بارہ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے، یہ تو کھیلنے کودنے، ہنسنے ہنسانے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کی عمر ہوتی ہے، زندگی کے طویل سفر میں بارہ برسوں کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہوتی لیکن جب بچپن اور لڑکپن کے مٹھاس بھرے دن تلخیوں اور کڑواہٹوں کی نذر ہو جاتے ہیں، کھیل کود کے ایامِ جدو جہد اور کشمکش کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو ذہن میں اپنی کم علمی اور کم فہمی کے باوجود کئی سوال اُبھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سارے سوالوں کا میری زندگی ہی سے تعلق ہے سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ آخر میں ہوں کون؟ کس کا بیٹا ہوں، کہاں ہیں میرے ابو؟ جب سے ہوش سنبھالا ہے تو میں نے اپنے آپ کو اپنی ماں یا اپنی دادی کی گود میں دیکھا ہے، آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہاتے بہاتے بھی وہ میرے لئے ہنستی ہیں، مسکراتی ہیں، ان کے رخساروں پر کے آنسو جب میرے چہرے کو چھوتے ہیں تو میرا سارا جسم لرز لرز سا جاتا ہے وہ میری ہر بات، ہر چیز، ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں تا کہ مجھے اپنی اس مختصر زندگی میں کسی کمی کا احساس نہ ہو، میری امی مجھ سے بے انتہا پیار کرتی ہے، مجھے بے انتہا چاہتی ہے، ایک لمحے کے لئے بھی مجھے اپنے آپ سے دور نہیں رکھنا چاہتی۔ شاید اس لئے بھی کہ مجھ میں ابو کی دوری کا احساس نہ جاگے...... ویسے بھی میں نے اپنے ابو کو اپنے گھر میں دیکھا ہی کہاں ہے، کہتے ہیں جب میں صرف چھ ماہ کا تھا تو میرے ابو نے ایک دوسرا گھر بسا لیا

اور تب ہی سے وہ اسی گھر میں رہ رہے ہیں۔ اب تو بارہ برسوں سے وہاں رہ رہے ہیں، ایک ایسے گھر میں جہاں وہ تنہا ہیں، اکیلے ہیں، جہاں تنہائیوں کے اندھیرے لحہ لحہ مسلط رہتے ہیں جہاں نہ تو آسمان نظر آتا ہے اور نہ ہی زمین، جہاں نہ تو موسم اور نہ ہی دھوپ چھاؤں کا احساس ہوتا ہے جہاں ہر سمے ایک جیسا رنگ نظر آتا ہے، کالا سیاہ رنگ...... زندگی کے اندھیروں کی طرح، کیسی زندگی جی رہے ہیں وہ اور کس کے لئے جی رہے ہیں میرے لئے میری امی کے لئے یا میری دادی کے لئے ہمارے دکھ سکھ کے لئے، زندگی کا یہ روپ انہیں پسند کیوں ہے، اپنے گھر میں سب کچھ میسر ہونے کے باوجود انہیں، یہ تنہائی قبول کیوں ہے، کوئی دس ماہ قبل جب میں اپنی امی کے ساتھ ان سے ملنے گیا تھا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ان کی دو آنکھیں مجسم سوال بن کر میری طرف دیکھ رہی ہیں، میں نے دیکھا ان آنکھوں میں معصومیت ہے اور حیرانی بھی، محبت ہے اور روکھا پن بھی، شرافت ہے اور شکایت بھی، علمی بصیرت ہے اور کچھ...... بہت کچھ لکھنے کی چاہ بھی، مجھے لگا جیسے ان آنکھوں کو تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کی تلاش ہے، جانے کب یہ گم شدہ کڑیاں تاریخ کے اوراق پر نمودار ہوں گی۔

دفعتاً سلاخوں کے ادھر سے میرے ابو کی آواز گونجی۔

''ساجدہ، میری زندگی کے اس سفر میں تمہیں کتنے دکھ جھیلنے پڑ رہے ہیں مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے اپنی تنہائی کے عالم میں بھی میرے بیٹے کا کس قدر خیال رکھتی ہو اس حقیقت سے بھی میں نا آشنا نہیں ہوں، میری ماں بیمار رہتی ہے اس کے بوڑھاپے کا سہارا بن کر تم مجھ پر جو احسان کر رہی ہو وہ میں فراموش نہیں کر سکتا...... لیکن......؟

''لیکن کیا...... میں نے کبھی آپ سے کوئی شکایت کی، کوئی شکوہ کیا؟''

''نہیں، کبھی نہیں، لیکن مجھے تمہاری تنہائی کا احساس ہے اور اس بات کا دکھ بھی ہے کہ میں تمہارے جوان اور سندر خوابوں میں رنگ نہ بھر سکا۔''

''فضل ایک بات پوچھوں۔''

''ہاں ضرور''

''تم نے اپنے ذہن وجگر میں جو خواب سجائے ہیں کیا وہ کبھی سچائی کے دامن کو چھو لیں گے رنگ بھرنے سے پہلے ٹوٹ تو نہ جائیں گے؟''

''خواب ہمیشہ جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں لیکن جب میرے خواب ٹوٹ جائیں گے تو نئی صبح طلوع ہو چکی ہوگی۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے!''

''ڈر......کس سے، کس بات سے۔''

''تمہاری تنہائی، تمہارے اکیلے پن سے۔''

''تنہا تو تم بھی ہو۔''

''لیکن میرے پاس میرا بیٹا ہے، ماں ہے......اور تم۔''

''میں اکیلا ہوں، تنہا ہوں، یہی کہنا چاہتی ہو نا تم......لیکن مجھے یہاں نہ تو تنہائی محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی اکیلا پن، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرا راستہ سچائی کی جانب جاتا ہے اور سچائی کے اس راستے پر میں اکیلا نہیں ہوں، تم میرے ساتھ ہو، میری ماں میرے ساتھ ہے، میرا عامر میرے ساتھ ہے......اور......اور......۔''

''اور کیا''

''اور میرا اللہ میرے ساتھ ہے، میری دھرتی کے ان گنت لوگ اس راستے کی تلاش میں میرے ساتھ ہیں، تو پھر ڈر کس بات کا۔''

میں نے ایک بار پھر اپنے ابو کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ آنکھیں ان کے لب ولہجہ میں پوشیدہ سچائی کی عکاسی کر رہی تھیں۔ مجھے لگا جیسے سخت ترین چٹانوں سے مٹھاس اور شرینی سے بھرپور چشمے اُبلنے والے ہوں، بانجھ زمین کی گود سے سپید سپید سی کونپلیں پھوٹنے والی ہوں، ان گنت سوکھی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں پر لاتعداد رنگ کے پھول کھلنے والے ہوں۔''

درد کا کوئی مقام نہیں!

پچھلے چند دنوں سے میں اپنی امی کو بے حد پریشانی کے عالم میں دیکھ رہا ہوں جیسے اس کی روح سلب ہوگئی ہو، سانسیں رک گئی ہوں اور آنکھوں میں پگھلتی شمع کی طرح آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہوں!

اور دادی ماں جیسے تڑپ تڑپ کر بکھر چکی ہے صرف اس کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

''بیٹی اب جو میں مروں گی تو میرا رونے والا کوئی نہ ہوگا، مجھے کندھا دینے والا کوئی نہ ہوگا۔''

''نہیں ماں'' ایسا مت سوچو، ایسا نہیں ہوگا، نئے موسم کی ابتدا ہونے والی ہے اس نئے موسم میں تمہارے بیٹے کی آواز بے صدا نہیں جائے گی۔ مجھے پورا یقین ہے ماں فضل کی بے گناہی تسلیم کی جائیگی، اس کے ساتھ انصاف ہوگا اور وہ لوٹ آئے گا۔ نئے موسموں کی آواز سن کر......''

درد کی کوئی انتہا نہیں!

سرد سرد سی صبح کی روشنی نے اپنا دامن پھیلانا شروع کر دیا ہے اللہ اکبر کی صدائیں گونجنے لگی ہیں، میں اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھا ان گنت لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، مرد، زن اور بچے جو اس برف باری کے باوجود ہمارے گھر کے آنگن میں جمع ہو چکے ہیں۔ سارا ماحول جذباتیت اور حساسیت میں ڈوب چکا ہے اشکوں کے منڈلاتے سیلاب کو روکنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔

''آخر انہوں نے سچائی کو تختہ دار پر چڑھا ہی دیا۔''

یہ آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے، میں ڈر سا جاتا ہوں، اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کرنے لگتا ہوں، میری نظریں امی کو تلاش کر رہی ہیں، دادی ماں کو ڈھونڈ رہی ہیں، وہ اس ہجوم میں نظر نہیں آرہی ہیں، ان کو تلاش کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ وہ دونوں بھی شاید اب اس ہجوم کا حصہ بن چکی ہیں۔ تو کیا میں اب بالکل اکیلا رہ گیا ہوں لیکن یہ میں کیا سوچ رہا ہوں مجھے ایسا نہیں

سوچنا چاہیئے ، میں سچ بولنے والوں کے اس ہجوم میں اکیلا نہیں ہوں، یہ سب میرے ساتھ ہیں، میرے اپنے ہیں۔ ابوجی کی طرح ان سب کو بھی سچائی کی تلاش ہے لیکن کیا...... سچائی کے لئے ان سب کو بھی میرے ابو کی طرح تختہ دار پر چڑھایا جائے گا۔"

یہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں، آپ سے جاننا چاہتا ہوں لیکن آپ خاموش کیوں ہیں، کچھ تو بولیئے ، کچھ تو بتایئے ، آپ شاید اس کشمکش میں پڑ گئے ہیں کہ بھلا بارہ برس کی عمر ایسے سوال پوچھنے کی عمر ہوتی ہے، یہ عمر تو کھیلنے کودنے ، ہنسنے ہنسانے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کی عمر ہوتی ہے۔

.... ●●● ....

ایک لمحے کی جنت

دیکھئے!

لڑکی بے حد حسین ہو، کنول کے پھولوں جیسا گلاب رنگ چہرہ ہو، آنکھوں میں بے حد مستی ہو، آواز میں مٹھاس اور باتیں کرتے سمے پلکیں خود بخود جھک جاتی ہوں۔ تو کیا بے کیف اور بے رنگ زندگی میں محبت کی ایک، ہلکی سی حرارت کا جذبہ پیدا نہ ہوگا......! میں اپنی ہی بات کر رہا ہوں۔

یوں تو میرا نام دینا ناتھ ہے لیکن سب ہی مجھے دینو کہتے ہیں، میری عمر شاید ۳۵ برس کی ہے، شاید اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے خود یاد نہیں کہ میں کب، کہاں اور کس کے یہاں پیدا ہوا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور میرے ناپختہ شعور میں کچھ سمجھنے اور کچھ پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ماسٹر جی کے گھر میں پایا۔ یہ تو بعد میں مجھے ماسٹر جی سے معلوم ہوا کہ مجھے ایک ایسے گھر میں ایک ایسی عورت نے جنم دیا جس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری ماں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میرا باپ کون ہے۔ چار سال کی عمر تک وہ مجھے گھر گھر لے کر گھومتی رہی اور پھر ایک شام فاقوں سے تنگ آ کر اور طعنوں کی تاب نہ سہہ کر مجھے ماسٹر جی کے دروازے پر چھوڑ گئی اور خود نہ جانے کہاں چلی گئی۔ مجھے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہیں۔ پھر ماسٹر جی کی تبدیلی ایک دوسرے دیہات میں ہوگئی، ان کے ساتھ میں بھی چلا آیا، دن کو میں اسکول کے دوسرے بچوں کے ساتھ پڑھتا، لکھتا اور کھیلتا، شام کو گھر میں ماسٹر جی کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا!

اب بھی میں ماسٹر جی کے ساتھ ہی ہوں، وہ اب شہر کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بن چکے ہیں اور میں اسی ہائی اسکول کا چپراسی، اب میں فرصت کے لمحات میں صرف ناول پڑھتا ہوں۔ایسے ایسے ناول جن میں پیار و محبت کا ذکر ہو، عشق کی باتیں ہوں، لڑکیوں کی کہانیاں، ایسی کہانیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔میرے من کو بھاتی ہیں، نہ جانے کیوں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے حقیقی زندگی میں اب تک کسی عورت کو اپنے قریب نہ دیکھا، شاید میری اس حسرت کی کبھی تکمیل نہ ہوتی اگر مالا ہمارے اسکول نہ آتی اور میں اس روز ماسٹر جی کا کھانا بنانے کی بجائے اسکول میں نہ ہوتا، وہ تو دوسرا چپراسی چھٹی پر تھا۔ماسٹر جی کی بھی اپنی عادتیں ہیں۔ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں، جب شادی نہ ہوئی ہو تو عورت کہاں سے آئے گی اور پھر۔یہ بات ابھی نہیں آگے چل کر بتاؤں گا۔بڑی نازک سی بات ہے، بڑی راز کی بات ہے، شاید کسی بڑے گھرانے کی خوبصورت سی لڑکی کا ہاتھ بڑی آسانی کے ساتھ تھام سکتے تھے کتنی ہی بار میں نے انہیں اشاروں ہی اشاروں میں کہا بھی لیکن وہ سب کچھ جان کر بھی انجان بنے رہے۔اس کی بھی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔دیکھئے اب وہ راز کی بات آہی گئی۔بات دراصل یہ ہے کہ اسکول بند ہونے کے بعد ماسٹر جی کا اکثر وقت گھر میں چند لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے گزر جاتا ہے۔اب وہ شادی کریں تو کیسے ان کے پاس وقت ہی کہاں کہ بیوی سے پیار کی دو چار باتیں کریں۔کچھ اس کی سنے اور کچھ اپنی سنائیں اور ہاں ان لڑکوں کو اس لئے نہیں پڑھاتے کہ بالائی آمدنی ہو اور یہ بھی سچ نہیں کہ وہ گھر میں ہر ایرے غیرے لڑکے کو پڑھاتے ہیں۔بڑے سوچ وچار اور کچھ دیکھ ریکھ کے لڑکوں کا خود انتخاب کرتے ہیں۔بہت دنوں تک تو میں نے اس بات پر بہت سوچا کچھ ناول بھی پڑھ ڈالے، شاید ان میں ہی کچھ لکھا ہوا مل جائے لیکن مایوسی ہوئی۔میں نے اسکول کے دو ایک استادوں سے اپنے طور پر پوچھا بھی وہ بس دبے دبے سے لہجے میں مسکرا کر خاموش ہو گئے۔آخر ایک شام میں اس راز کی تہہ تک پہنچ ہی گیا۔ماسٹر جی نے ایک لڑکے کو ٹھہرنے کے لئے کہا اور دوسرے لڑکوں کی چھٹی کر دی۔میں نے سوچا لڑکا کسی مضمون میں کمزور ہو گا اور ماسٹر جی کچھ دیر

کے لئے اور پڑھانا چاہتے ہوں گے لیکن پھر...... کچھ ہی دیر بعد ماسٹر جی کی شادی نہ کرنے کی ساری باتیں میری سمجھ میں آگئیں!

اپنا تعارف تو میں پہلے ہی کرا چکا ہوں ماسٹر جی کے بارے میں بھی کچھ کچھ بتا چکا ہوں، اب ذرا بے حد حسین لڑکی کی کہانی سن لیجئے۔ مالا کی بات کر رہا ہوں وہ تو دوسرا چپراسی چھٹی پر گیا ہوا تھا اور میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے باہر اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے اور نئے داخلے بھی قریب قریب ہو چکے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس سلسلے میں کلاسوں میں خود جا کر کام کا جائزہ لے رہے تھے۔ (شاید نئے سال کے لئے لڑکوں کا انتخاب کر رہے تھے) حسب عادت میں ناول پڑھ رہا تھا ایک لڑکی کی محبت کی کہانی تھی وہ۔

''ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں'' مٹھاس سے بھرپور ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا بس ایک لمحے کے لئے مجھے لگا جیسے سارے جہاں کی خوبصورتی ایک لڑکی کی روپ میں میرے سامنے آگئی ہو جیسے دور کسی ویرانے میں گھنگرو بج اٹھے ہوں۔ وہ لڑکی تو ان ناولوں کی لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔

'کیا نام ہے تمہارا؟'''میں یہاں دینو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔''

''یہاں اپنے بھائی کے لئے آئی ہوں......اس کی ایڈمیشن کا مسئلہ ہے۔'' میں نے مڑ کر دیکھا، بارہ تیرا سال کا لڑکا کھڑا تھا، صاف شفاف قمیض اور نیکر پہنے۔ اپنی بہن کی شکل و صورت کا وہی چہرہ آنکھیں وہی دانت......سب کچھ ویسا ہی۔

''آپ کمرے میں بیٹھیں، ماسٹر جی آہی رہے ہوں گے۔''

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کو اس سکول میں پڑھنے کی اجازت مل سکتی ہے۔''

''داخلہ..........!!''

یہ کہہ کر پھر میری آنکھیں اس کے بھائی کی طرف اٹھیں، بڑا پیارا لڑکا تھا، ماسٹر جی کے معیار پر پورا اترتا تھا۔

''داخلہ تو یہاں بھی بند ہو چکا ہے لیکن میرا خیال ہے۔ نہیں میرا تجربہ بتاتا ہے کہ آپ کے بھائی کے لئے کوئی دقت نہ ہوگی۔ لڑکا اسمارٹ ہے خوبصورت ہے، ایسے لڑکوں کو ماسٹر جی پسند کرتے ہیں۔''

''پسند......کیا مطلب ہے۔''

''ایسے لڑکے اسکول کی شان بڑھاتے ہیں۔''

''ہاں میرا بھائی واقعی ذہین ہے، محنتی ہے۔''

اور ایسے میں ماسٹر جی آگئے، لڑکے کو دیکھتے ہیں ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔ ایک وحشیانہ پن! لڑکی نے فارم بھرا، ماسٹر جی نے اس پر کچھ لکھ دیا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے ''یہ دفتر میں دے آؤ۔''

مجھے اچانک ان کتابوں سے نفرت سے ہونے لگی، یہ سب کتابی باتیں ہیں، کتابی کہانیاں ہیں حقیقی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے سوچا وقت گزارنے کے لئے کتابیں تو اچھی ہیں لیکن یہی وقت کسی لڑکی، کسی عورت کے قریب بیٹھ کر بھی تو گزار جاسکتا ہے اور پھر میری عمر کا بھی تو یہی تقاضا تھا میں عجیب عجیب سی باتیں سوچنے لگا۔ مالا کتنی سندر ہے، اس کا بھائی بھی سندر ہے، ان کی ماں بھی ایسی ہی رہی ہوگی اور پھر دیکھتے دیکھتے سوچتے سوچتے اسکول میں پڑھنے والے جانے کتنے لڑکوں کی صورتیں میری نظروں کے سامنے پھر گئیں...... یہ اکمل ہے، اس کے گال پر ایک کالا تل ہے، کتنا اچھا لگتا ہے۔ یہ اجیت سنگھ ہے اس کے بال کتنے لمبے ہیں، یہ سلطان ہے، اس کے چلنے کا انداز لڑکیوں جیسا ہے......شاید میں یہ سب نہ سوچتا اگر میں نے مالا کو نہ دیکھا ہوتا، مالا کو دیکھ کر مجھے زندگی کو اس کے حقیقی روپ میں دیکھنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے کئی بار مالا کو دیکھا، کچھ دن تک وہ اپنے بھائی کو اسکول چھوڑنے کے لئے آتی رہی۔ جب بھی ملتی کہتی ''کیسے ہو۔''

اور اس لمحے مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا ہوں! میں اپنی خوشی کا

اندازہ اپنی اداسی سے لگاتا ہوں کہ بہت خوش ہوں، بہت کچھ پالیا ہے، میں اس دن بھی اپنی اُداسیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ہیڈ ماسٹر نے بُلا کر کہا۔

''دینو، تم ذرا شکتی کے ساتھ اس کے گھر تک جاؤ اور یہ خط اس کی بہن مالا کو دے آؤ۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی، مالا گھر میں ہی تھی، میں نے خط دیا۔ اس نے پڑھ کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنے بھائی کی طرف۔

''دینو مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔

اعتراض۔۔۔۔۔۔؟

''تم کچھ نہیں جانتے۔''

''کس بارے میں''۔

''ارے بھائی اس خط کے بارے میں''

اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا چائے لے کر آگیا۔ ''تم کھڑے کیوں ہو دینو، بیٹھ جاؤ...... یہاں اس کرسی پر۔''

پھر مالا نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھادی۔ اچانک میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو گئیں۔ اُف کیا لمس تھا وہ، کیسی حرارت تھی وہ، مجھے لگا جیسے میرے سارے شریر میں ابھی ابھی ایک بھیانک آگ لگ گئی ہو۔

''اب ہر شام شکتی ہیڈ ماسٹر جی کے گھر پڑھنے کے لئے جایا کرے گا۔ شکتی جنرل نالج میں ذرا کمزور ہے یہی تو لکھا ہے تمہارے ہیڈ ماسٹر جی نے اس خط میں...... اور ہاں چند دنوں کے لئے تمہیں واپسی پر شکتی کے ساتھ آنا پڑے گا۔ میری خاطر...... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

وہ ساری رات میں نے جاگ جاگ کر کاٹی! اور میں بے حد اُداس ہو گیا۔ ماسٹر جی کی آنکھوں کی چمک تو میں نے اسی دن دیکھ لی تھی جب شکتی پہلی بار اسکول آیا تھا اس چمک میں اب شدت آگئی تھی۔ اس دوران مجھے کئی بار مالا کے گھر جانا پڑا۔ کبھی شکتی کو چھوڑنے کے لئے اور کبھی

لانے کے لئے ، مالا سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ۔ ایک بات بتا دوں مالا کو دیکھتے ہی مجھے ایسا لگتا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں چونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں ۔ مجھے ایک دم احساس ہوتا ہے کہ میں چپراسی ہونے کے ساتھ مرد بھی ہوں اور عمر کے اس دہلیز پر کھڑا ہوں جہاں ایک عورت کی ضرورت پڑتی ہے ۔ اپنے شریر کی آگ بجھانے کے لئے ، اپنے جلتے ہوئے دل پر ٹھنڈا پھاہا رکھنے کے لئے لیکن پھر میری وردی میری نظروں کے سامنے گھوم جاتی ، چپراسی کی خاکی وردی؟

یہ آگ بجھانے کے لئے میں نے اب ہر اس عورت میں دلچسپی لینا شروع کر دیا جو میری نظروں کے سامنے سے گزر جاتی ۔ ہاں یہی ہے جو میرے شریر کی پیاس بجھا سکتی ہے لیکن میں ہمیشہ پیاسا ہی رہا!

میں نے کئی بار محسوس کیا ، محسوس کیا کیا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شکتی آتے ہی ماسٹر جی کسی کام کے بہانے مجھے گھر سے باہر بھیج دیتے ہیں ایسا تو پہلے بھی ہوتا تھا اور میں ایک دبی دبی سی مسکان بکھیرتا چلا جاتا تھا لیکن شکتی کی بات ہی دوسری تھی وہ مالا کا بھائی تھا اور مالا......؟

اس شام ماسٹر جی کسی میٹنگ میں مشغول تھے ، شکتی ان کے کمرے میں انتظار کر رہا تھا اور میں رسوئی گھر میں تپتی آگ کے سامنے کھانا بنا رہا تھا ایک یہ آگ تھی جو میری ظاہری بناوٹ کو جلا رہی تھی لیکن وہ آگ اس سے بھی زیادہ سخت تھی جو میرے من کے اندر تپ رہی تھی!

میں دھیمے دھیمے قدموں سے کمرے میں آ گیا ۔

"شکتی ۔"

"کیا ہے" ۔

"میں ....میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔"

"کہو ، کہو ، گھبرا کیوں رہے ہو ۔"

اور میں خاموش ہو گیا ، بے زبان ہو گیا اور اس خاموشی میں میری زندگی میں پہلی بار ایک ایسا لمحہ آیا ، جنت ملی ، ایک لمحے کی جنت ، جب ایک سِسکی اُبھر کر ڈوب جاتی ہے؟ یہ سسکی

شکتی کی تھی......!!

اب میرے جسم پر خاکی وردی نہیں، اس لئے کہ میں اب چپراسی نہیں رہا۔ یہ نوکری میں نے خود نہیں چھوڑی، ماسٹر جی نے مجھے نوکری سے برطرف کیا ہے اور گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ شاید مجھے پولیس کے حوالے بھی کرتے لیکن انہوں نے ایسا قدم نہیں اُٹھایا، مجھ پر رحم کھا کر نہیں بلکہ مجھ سے ڈر کر......وہ جانتے ہیں اگر میری بے زبانی کو زبان مل گئی تو ان کی عزت......ان کی زندگی کے کتنے ہی گھناؤنے راز میرے ذہن کی کتاب میں پوشیدہ ہیں...... پر وہ پولیس میں رپورٹ بھی دیتے تو میری بات پر کون یقین کرتا۔

شاید کوئی بھی نہیں..........؟؟

..........●●● ....

کنواں

اور پھر یوں ہوا کہ ہوا کی ایک لہر...... تر بتر لہر اور دل کے خوابیدہ گوشوں کو چھوگئی، ایسا لگا جیسے میں ابھی ابھی ریت کے ساحل پر کسی ڈوبتی شب کے آخری لمحے میں روشنی کا بازار کھولے اُبھر آیا ہوں۔ میں نے دیکھا میں بہت پھیلا ہوا ہوں، جا بجا بکھرا ہوا ہوں۔ اب سے پہلے میں نے جب بھی شیتل کو دیکھا تھا تو من میں ایک ہی خیال گہرے ساگر کی اُبھرتی ڈوبتی موجوں کی مانند اُمڈ آتا۔ شیتل کو غذائیت کے لئے بکری کے دودھ پر رکھا جانا چاہیے، اسے مقوی اور متوازن غذا کی اشد ضرورت، ایک لذت کا مسحور کن جادو جاگے گا!

اور پھر یوں ہوا کہ میں زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر بہت دور تک جا نکلا۔ غم دوراں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت نہ دی اور جب زندگی کے ایک انوکھے لیکن دلچسپ لمحے میں ماضی کی کتاب کے اوراق میں ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوئی تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں!

درختوں پر کونپلیں پھوٹ آئی تھیں اور ہر سو ہر سمت شگوفوں کی بہار تھی ۔ وہ اپنے سجیلے اور سڈول ہاتھوں سے شاخ تراشی کر رہی تھی۔ اپنے وجود سے نا آشنا، ہر شے سے بے خبر، ہر طرف قوس قزح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے اور ان بکھرے رنگوں میں اس کی ابھرتی جوانی کے قوس ریشمی نائٹ گاؤن میں تھرک رہے تھے، اس کی پر خمار پلکیں اس کی نیم شبی کی داستان کو دہرا رہی تھیں، اس کے ہونٹوں پر مسکان تھی، سوئی ہوئی مسکان...... جوانی میں رنگین سپنے کون نہیں دیکھتا، وہ بھی شاید ان گنت رنگوں سے بھری، سپنوں کی وادی میں گم تھی، کھوگئی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ شگوفے شاخوں پر نہیں بلکہ اس کے پورے جسم پر کھل اٹھے ہوں اور ان کی شگفتگی اور سندرتا میرے اندر ایک عجیب لمحاتی لذت کے احساس کو جگا رہی تھی۔

کہاوت ہے کہ کنواری کے ہاتھوں میں برکت ہوتی ہے۔ یہ ہاتھ جس چیز کو چھولیں وہ پھلتی پھولتی ہے، نکھرتی سنورتی ہے، وہ ہاتھ شاید مجھے چھونے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ پھر کیوں نہ میں ہی، لیکن یہ کیسا ڈر ہے، کیسا خوف ہے، کیسی دوری ہے اور اس پر دل کی ناہموار دھڑکنیں۔

''آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے۔'' وہ دفعتاً قریب آکر پوچھتی ہے اور میں اس جملے کی باریکیوں میں تھوڑی دیر کے لئے الجھتا ہوں، اپنے طور پر اسے معنی کا لباس پہناتا ہوں۔

''میں آپ سے کہہ رہی ہوں'' وہ پھر بولتی ہے۔

''فرصت نہیں ملتی''، میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہوں۔ وہ بے ساختہ ہنستی ہے، اس ہنسی میں بھی حسن کاریاں ہیں۔ بارش کے دیوانہ بادل کا پرتو ہے۔ سورج کی لال گیند کی تمازت ہے۔

''وقت گزرتا ہے اور ہم سب دیکھتے رہ جاتے ہیں'' وہ ایک اور جملہ پھینکتی ہے اور تیز تیز قدموں سے چلی جاتی ہے اور میں اپنی سوچوں کی ندی میں غرق ہو جاتا ہوں، ایک جانب صبح کے پہلے پہر کا طلوع ہوتا ہوا سورج اور دوسری جانب رات کا ڈوبتا ہوا آخری تارا......ندی کے دو کنارے جو شاید ایک دوسرے سے مل نہیں پاتے، انہیں وہ سیلاب بھی نہیں ملاتا جو کبھی ندی کے سینے سے ابھر کر اپنے آس پاس اتھل پتھل مچا دیتا ہے۔

لمحے تیزی سے بھاگ رہے ہیں اور ان پر میری کوئی گرفت نہیں......!

میں اپنی کھڑکی میں کھڑا دور برف پوش پہاڑوں کی جانب مسلسل دیکھے جا رہا ہوں۔ برف پگھلتی ہے اور شہر جلتے ہیں لیکن میرے من کا چور کہتا ہے کہ میں سچ نہیں بول رہا ہوں۔۔ برف ہمیشہ کی طرح پگھلتی ہے اور شہر بھی ضرور جلتے ہیں لیکن میں اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے تو کسی کے قدموں کی آہٹ کا انتظار ہے لیکن اگر اس انتظار میں برف پگھلنے سے پہلے ہی شہر جل گئے ہوں گے تو؟''

من کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔

شیتل اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑی ہے، میری طرف دیکھتی ہے اور ایک ان دیکھی

سی مسکراہٹ لئے اپنی خواب گاہ میں چلی جاتی ہے۔ مکان کے آس پاس خاموشی ہے۔ اس خاموشی میں بھی ایک شور ہے جو میرے انگ انگ میں حرارت پیدا کر رہا ہے، میں پہلے اپنے کمرے کی اور پھر اپنے ذہن کی کھڑکی بند کر لیتا ہوں اور بے آواز قدموں سے شیتل کے مکان کے برآمدے کو پار کر کے اس کی خواب گاہ میں چلا جاتا ہوں۔ کمرہ خالی ہے لیکن کسی جوان جسم کی خوشبو بکھری بکھری محسوس ہوتی ہے کوئی صدا کوئی آواز نہیں ہاں صرف خواب گاہ کے ساتھ والے غسل خانے میں مدھم مدھم سی روشنی پھوٹتی نظر آرہی ہے۔ دفعتاً گزرتے ہوئے وقتوں کا ایک رس بھرا لمحہ میرے وجود کی اندھیر نگری میں ایک پل بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور میں اپنی آنکھیں بند کر کے غسل خانے کی جانب سرکنے لگتا ہوں۔ یہاں ایک سراپا ہے، ایک روپ، ایک جسم...... جوان اور بے قرار۔ لیکن اپنی آنکھیں بند کرنے سے پہلے ہی میں ٹھٹک کر رہ جاتا ہوں۔

شیتل نہانے سے فارغ ہو چکی ہے، پانی کے بے شمار قطرے اس کے بدن پر، بدن کے انگ انگ پر موتیوں کی طرح پھیل رہے ہیں اور اس کے سرد سرد جسم سے گرم گرم دھواں اٹھ رہا ہے، وہ اب قد آدم آئینے کے سامنے اپنا جسم دیکھ رہی ہے۔ سارے بدن پر جوانی کا خمار اور ابھار ہے جو اس نے ایک رنگین تولیے میں چھپا رکھا ہے۔

میرے ذہن کے ساگر میں ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔

شیتل قریب آتی ہے۔

وہ کچھ کہنا چاہتی ہے، میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

لیکن کیا؟

وہ اور قریب آتی ہے، مسکراتی ہے۔

''آپ بڑے بزدل ہیں''، شیتل کی دور جاتی ہوئی آواز میرے قریب آتی ہے اور مجھے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرا وجود دراصل ایک کنواں جس کی تہہ میں میری اپنی ذات سوئی ہوئی ہے۔ پھر کبھی نہ جاگنے کے لئے......!!

..............☆☆☆..............

ایک لمبی عمر کی تنہائی

وہ خوبصورت تھی اور صحت مند بھی لیکن اپنی خوبصورتی کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے اس کے پاس کوئی وقت نہ تھا۔ اب تو اس کی زندگی گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی ۔کبھی کبھار کسی خوبصورت اور صحت مند مرد کو دیکھ کر اس کے دل میں ضرور گدگدی ہوتی ، لیکن اس وقت وہ دل کی دھڑکنوں کو سلا کر ذہن کو انجانی راہوں پر بھٹکنے سے روک لیتی ۔......اب وہ چالیس سال کی ہو چکی تھی ۔ آٹھ برس قبل جب وہ صرف بتیس برس کی تھی ، اس نئے شہر میں نئے دفتر میں باس بن کر آئی تھی ، لیکن تب بھی اس کیلئے ایسے خوبصورت جذبے مٹ چکے تھے ۔ کائنات جیسے تھم گئی تھی اور فضاؤں میں ابھرتا جادو رک گیا تھا۔ اس نے ایسے راستے کو اپنا لیا تھا جس پر نہ کوئی موڑ تھا اور نہ ہی ٹیڑھے میڑھے پڑاؤ، الگ تھلگ راستے پر چلتے چلتے اس کے لئے مڑ کر دیکھنا ناممکن تو نہ تھا لیکن مشکل ضرور تھا۔ وہ جب بھی مڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتی تو اسے زیب کی صورت نظر آتی ۔

زیب جو اس کی بڑی بہن تھی ، جسے وہ بے تحاشا پیار کرتی تھی ، زیب بھی اپنی چھوٹی بہن آمنہ سے اسی انداز سے محبت کرتی تھی ، وہ بہنیں بھی تھیں ، دوست اور ہم راز بھی ، دراصل ان دونوں کی عمروں میں صرف دو سال کا فرق تھا۔ زیب آمنہ سے دو سال بڑی تھی ۔ ان کے ابو کالج میں پڑھاتے تھے ۔ ان کی امی بھی پڑھی لکھی تھیں اور کسی زمانے میں اسکول میں پڑھاتی تھیں ۔ جب گھر میں دو بیٹیوں کی ذمہ داری بڑھ گئی تو اُنہوں نے اسکول کی نوکری چھوڑ کر گھریلو زندگی کو اپنا لیا۔ اس لحاظ سے گھر میں تعلیم و تربیت ، تہذیب و شائستگی کا ماحول تھا۔ زیب ایم ۔ اے کرنے کے بعد کالج میں لیکچرر ہو گئی اور آمنہ کو بنک میں ایک سینئر پوزیشن میں کام کرنے کا موقع ملا دونوں بہنیں اپنے گھر ، اپنے ماحول اور اپنے رہن سہن سے بے حد مطمئن تھیں ۔ پھر ایک دن ان

کی امی اور چند ماہ بعد ان کے ابو یہ دنیا چھوڑ کر چلے گئے ۔امی اور ابو کے جانے کے بعد ان کی زندگی جیسے دھندلکوں میں گم ہوگئی ۔کئی دنوں تک وہ دونوں بہنیں گھر کے ایک ایک گوشے مین کچھ تلاش کرتی رہیں لیکن جب انہیں یقین ہوگیا کہ جانے والے نہ کبھی لوٹ کر آئے تھے اور نہ کبھی لوٹ کر آئیں گے تو انہوں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور آہستہ آہستہ ایک بار پھر وقت پر لگائے اڑنے لگا......لیکن پھر ایک انہونی بات ہوئی زیب نے ایک عجیب سے انداز میں اپنی بہن آمنہ کے سامنے انکشاف کیا کہ وہ اپنے ہی کالج کے ایک ساتھی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرچکی ہے۔......!

آمنہ کے لئے یہ بے حد مسرت کی بات تھی ۔آخر اس کی بہن اس کی دوست اور ہم راز اپنی زندگی کی بہار کا پہلا اور مسرت بخش گیت گنگنانے جارہی تھی ،لیکن خوشی عارضی تھی ۔یہ گیت بے زباں تھے ،زیب اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی اور اس کا چاہنے والا سب کچھ حاصل کرنے کے بعد شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا کسی دوسرے شہر میں کسی اور کو اپنانے......؟

’’وہ شادی شدہ تھا اور ایک بچے کا باپ بھی مجھے دھوکہ دیتا رہا جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو وہ جاچکا تھا لیکن آمنہ میں نے اسے بے تحاشا چاہا ہے بے تحاشا چاہتی ہوں میں تو......میں تو اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔‘‘

زیب سے یہ سب سن کر آمنہ ٹھٹھک گئی ۔اس کے لئے یہ بات بے حد تلخ تھی ،بے حد شدید اور تکلیف دہ ۔اس نے اپنی بہن کی طرف دیکھا وہ اب خاموش تھی ۔اس کی زباں چپ تھی ، اس کا چہرہ بے رنگ تھا ،اس کی آنکھیں حسرت آلودہ تھیں......وہ شاید اپنے آپ سے ہار چکی تھی اور اپنے آپ بھی جلتے رہنا اس کی فطرت بن چکی تھی اور پھر آہستہ آہستہ اس نے عزت اور لاج کی دیواروں میں اپنے آپ کو محسوس کیا......اور ایک صبح جب دیر تک اس کے کمرے سے کوئی آہٹ سنائی نہیں دی تو آمنہ نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔کوئی آواز نہ آئی ،اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی ،دروازہ اندر سے بند نہ تھا ۔دروازہ کھلا تو سامنے فرش پر زیب کی لاش

پڑی تھی۔اس نے زہر کھا کر اپنی محبت کو ابدی نیند سلا دیا تھا۔...... کتنے ارمان، کتنے سپنے، کتنے ان چھوئے کنوارے جذبے سجائے تھے اس نے اپنی بہن کے لئے وہ دلہن بنے گی دولہا آئے گا سر پر پھولوں کا سہرا باندھے۔ ہنگامے ہوں گے، روشنی ہوگی، تمتاتے چہرے ہوں گے، خوشیوں اور مسرتوں کے ہجوم ہوں گے۔......لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا......!!

آمنہ اپنے آپ اپنے وجود سے بے خبر ہوگئی۔ اپنی جوانی اور اپنی خوبصورتی سے بے نیاز ہوگئی۔اس کے لئے اب نہ کوئی پرایا تھا اور نہ ہی اپنا۔اسے نفرت سی ہوگئی اپنے آپ سے، اپنے ماحول سے اور مردذات سے ......اور وہ اس شہر سے چلی آئی جہاں اس نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا تھا، جہاں اس نے اپنی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ جو اس کی امی اور ابو کا شہر تھا! جہاں ان کا اپنا گھر، گھر ہستی تھی اور جہاں اپنی بہن سے مل جل کر اس نے زندگی کو حسین بنانے کے خواب دیکھے تھے......!!

اب اس نئے شہر میں صبح جلدی اٹھنا، نہا دھو کر بریک فاسٹ لینا اور پھر دفتر کیلئے چل پڑنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ اتوار کے روز وہ معمول سے پہلے ہی جاگتی تھی۔ جاگتے ہی اپنے کمرے کی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیتی۔ ہوا کا جھونکا آتا تو کھڑکی کے نیلے پردے لہرانے لگتے۔اسے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس ہوتا، ناشپاتی کے سپید شگوفوں کی خوشبو۔کسی زمانے میں یہ اس کی من پسند خوشبو ہوا کرتی تھی۔ حالانکہ اس کے آس پاس نہ تو ناشپاتی کے درخت تھے اور نہ ہی ان کی شاخوں پر پھوٹتے ہوئے سپید سپید شگوفے......اور کبھی کبھار وہ سارا سارا دن بستر پر لیٹی رہتی۔ ان دیکھے سپنوں میں کھوئی رہتی اور ان سپنوں میں ایک آرزو جاگتی کہ کوئی لپٹ لپٹ کر اس کے جسم کو نچوڑ کر رکھ دے تا کہ اس کے اندر سے ابھرنے والی آگ بجھ جائے ،لیکن اسے فوراً ہی احساس ہوتا کہ اب اس کے لئے کونپلیں سوکھ چکی ہیں، پھول مرجھا چکے ہیں، پتے جھڑ چکے ہیں اور بہار گزر چکی ہے۔اب بہار کا ایک گیت بھی باقی نہیں رہا ہے اس کے لئے......!!

وہ ایک معمول کی شام تھی دفتر سے آتے ہی اس نے دن بھر کی تھکاوٹ دور کرنے کے

لئے کافی بار میں گرم گرم کافی پی اور ساتھ والے پرویژن اسٹور سے گھریلو ضروریات کی کچھ چیزیں خریدلیں۔ من ہی من میں گھر تک کا راستہ پیدل طے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چلتے چلتے اسے لگا جیسے موسم اچانک بگڑ گیا ہو اور پھر دیکھتے دیکھتے تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ اتنی تیز کہ ہر طرف ایک طوفان سا بپا ہو گیا، گاڑیاں رک گئیں۔ ٹریفک جام ہو گیا۔ راہ چلتے لوگ اپنے بچاؤ کے لئے بھاگنے لگے، اس نے بھی بھاگنے کی کوشش کی۔ دوڑتے دوڑتے اس کا پاؤں پھسل گیا وہ بھی بھاگنے والوں میں تھا، آمنہ کو گرتے دیکھ کر رک گیا۔ قریب آیا، آمنہ کا ہاتھ تھاما اور دوبارہ بھاگنے لگا۔ آمنہ بھی ہاتھ تھامے اس کے قدم سے قدم ملائے بھاگے جارہی تھی۔

ان کی سانسوں کے ریشمی تار الجھنے لگے، لیکن وہ بھاگتے رہے ایک اجنبی منزل کی جانب۔ پھر جب ایک درخت کی ٹوٹتی ہوئی شاخ سے بچنے کے لئے وہ ایک دوسرے سے اچانک لپٹ گئے تو آمنہ کو زندگی میں پہلی بار ایک ایسی لذت ملی جس سے وہ آج تک نا آشنا تھی۔ اس نے پہلی بار اپنے بہت قریب ان سانسوں کو محسوس کیا، جن میں ناشپاتی کے کھلتے ہوئے شگوفوں کی مہک تھی، پہلی بار کسی دوسرے کے گرم گرم ہونٹوں کی تپش کا احساس ہوا۔ اس تپش کے جادو سے وہ اب تک بے خبر تھی اور پھر آہستہ آہستہ ان کے جسموں کا ذرا سا لمس انہیں خوابوں کے ان جزیروں کی جانب لے گیا جہاں خواہشیں ابھرتی ہیں اور جسم ایک دوسرے میں گم ہو کر ٹوٹتے ہیں۔......!

ایک لمبی عمر کی تنہائی میں پہلی بار اس کا من کررہا تھا کہ یہ طوفان کبھی ختم نہ ہو......شاید پہلی بار اس کے اندر کی عورت اپنے عورت پن کے حسن سے آشنا ہو رہی تھی......اور جیسے......وہ ایک مکمل عورت کا روپ اپنا رہی تھی۔......!!!



کرب ریزے

بہت دنوں سے کہانی لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن لکھ نہیں پا رہی ہوں ذہن میں بہت سے موضوع ہیں لیکن کس موضوع کو اپنے قلم کی سیاہی میں تبدیل کروں، سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ماضی میں جھانکتی ہوں تو ان گنت کردار نظروں کے سامنے گھومنے پھرنے لگتے ہیں لیکن ماضی تو اب حال کا روپ اپنا چکا ہے اور حال آنے والے دنوں میں مدغم ہو کر مستقبل بن جائے گا مستقبل میں کیا ہو گا میں نہیں جانتی۔ کوئی بھی نہیں جانتا قدرت کے کھیل کس قدر انوکھے ہیں، یہ سارے کھیل ہمارے لئے اَن جانے ہیں، ان دیکھے ہیں۔ ماضی میں میرا کشمیر تابناک رہا ہے لیکن اب ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جیسے زندگی کی بے شمار خوشیوں اور مسرتوں سے گزرنے کے بعد درد و کرب سے ہم آغوش ہو چکا ہے۔ جب میں کہانی کی تہہ میں جانے کی کوشش کرتی ہوں تو لگتا ہے کہ اب خوشیوں اور مسرتوں کی ساری رنگینیاں زندگی کے کینواس سے غائب ہو چکی ہیں اور زندگی صلیب پر لٹکی ہوئی ہے!!

میں اپنی انگلیوں کی مدد سے اپنے قلم کو جنبش دے رہی ہوں!

......☆......

نومبر کے مہینے کو میری زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے، میں نومبر میں پیدا ہوئی، نومبر میں لندن چلی گئی جہاں میں بارہ سال رہنے کے بعد نومبر میں کشمیر لوٹ آئی۔ میں جب لندن چلی گئی تب نومبر ۱۹۸۷ء کی آٹھ تاریخ تھی اور جب میں لوٹ کر آئی وہ نومبر ۱۹۹۹ء کی تیس تاریخ تھی۔ جب میں یہاں سے گئی تھی تب میرا کشمیر رنگ رنگ کے پھولوں کا سندر خوبصورت باغ تھا۔ تب یہ پھول میرے تھے، تب یہ نہ میرے لئے اجنبی تھے اور نہ میں ان کے لئے پرائی تھی، تب میں

سوچتی تھی...... میں سپیدے کا درخت ہوں، چنار کا سایہ ہوں، برفبانی چوٹیوں پر چمکنے والی بجلی ہوں، پہاڑوں پر گرنے والی برف ہوں، جھیل کی لہر ہوں، سنہری چڑیوں کا راگ ہوں، میں کشمیر کی مٹی ہوں، کشمیر کا دل ہوں اور اب جب میں بارہ برس بعد اپنے کشمیر کو دیکھ رہی ہوں تو مجھے سب کچھ پرایا سا لگتا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے یہاں، اب شاید اس دھرتی پر سورج کی روشنی نہیں پڑتی۔ اس دھرتی پر قدم رکھتے ہی اُس مٹی کو چھوتے ہی میں سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکی ہوں۔ میری واپسی کیوں اور کس لئے ...... لیکن مجھے آنا پڑا، آنا ہی پڑا بارہ سال بعد جبکہ میں نے اپنے دل کے سارے دروازے بند کر لئے تھے، منہ موڑ لیا تھا۔ اپنے بچپن اور لڑکپن سے، اُن کی یادوں سے، اُن کی پاکیزگی سے مگر دل کے اندر سے کوئی صدا آ رہی تھی، وہ آواز کافی جانی پہچانی تھی...... اُسی آواز کی تلاش میں لوٹ آئی۔

......☆......

میں ٹیکسی میں بیٹھ چکی ہوں اور ٹیکسی چل پڑی ہے۔

''کہاں چلنا ہے میم صاب''۔

''ڈل گیٹ''۔

''آپ تو یہیں کی ہیں، میں سمجھ رہا تھا کہ آپ پردیسی ہیں''۔

''پردیس سے اپنے دیس آ رہی ہوں ...... اس قدر تیز نہ چلئے ...... سپیڈ دھیمی کر لیجئے، یہاں آس پاس میرا اسکول ہوا کرتا تھا...... وہاں' اس طرف' ہاں اُس جگہ!''۔

''ایک بات بتا دوں''۔

''ہاں بتا دیجئے''۔

''اب ہر چیز کے ساتھ آپ کو تھایا تھی جوڑنا پڑے گا''۔

''کیا مطلب''۔

''جیسے یہاں امن تھا' بھائی چارہ تھا' محبت اور چاہ تھی' ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد

تھا......سب کچھ نظرِ بد کا شکار ہو گیا''۔

''ذرا اور آہستہ۔ یہاں سڑک کے اُس طرف براڈوے سینما ہوا کرتا تھا۔''

''میڈیم یہ تھا ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا...... یہ پوچھئے کہ اب یہاں کیا ہے''۔

''کیا ہے یہاں''۔

''آپ کتنے دنوں بعد کشمیر آ رہی ہیں''۔

''بارہ برس بعد''۔

''بارہ سال......اب کچھ بھی نہیں بچا ہے یہاں جو آپ پہچان سکیں گی......دیکھئے آپ کی منزل آ چکی ہے، میں گاڑی روک لیتا ہوں......اگر آگے چلنا ہو تو بتا دیجئے۔''

''نہیں روک لیجئے......کتنا ہوا''۔

''اب میں کیا بتاؤں، اپنی سمجھ سے کچھ بھی دیجئے''۔

''کچھ تو بتا دیجئے میرے بھائی''۔

''تین سو روپے۔''

''تین سو روپے زیادہ نہیں ہیں کیا؟''

''جی ہاں، یا تو میرا حق سمجھ کر دیجئے یا میری ضرورت سمجھ کر۔ کل کا حال اوپر والا ہی جانتا ہے!''۔

......☆......

میں گھر کے دروازے پر کھڑی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں، دروازہ کُھلتے ہی ایک معصوم سی، چھوٹی سی لڑکی سامنے نظر آتی ہے۔

''آپ کون ہیں، بولئے کیا چاہئے آپ کو''۔

''تم کون ہو''۔

اندر سے آواز سنائی دیتی ہے۔ ''سیرت فوراً اندر چلی آؤ۔''

''آ رہی ہوں دادی ماں، ایک منٹ میں''۔

''ذرا دیر بعد ایک اڈھیڑ عمر کی بیمار بیمار سی عورت دروازے پر نمودار ہوتی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی ہے اور میں اُس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہوں۔''

''تم نے خبر دی ہوتی تو کوئی لینے آتا''۔

''لانے والا بچا ہی کون ہے یہاں''۔

''آؤ''۔

''کیسی ہو ماں''۔

''اندر چلو، اِن کپڑوں میں باہر رہنا مناسب نہیں''۔

......☆......

''گلوری بھابی آپ نے اپنا یہ کیا حال بنایا ہے۔''

''شکر ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا''۔

''لندن میں جو چہرہ میری یادوں میں محفوظ تھا وہ کسی اور گلوی بھابی کا تھا۔''

''ہاں میرا چہرہ لندن چلا گیا اور جوان رہا' میں یہیں رہ گئی اور وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہوگئی''۔

''مجھے تمہارے دُکھ کا احساس ہے''۔

''جب تمہارا بھائی اذیتیں دے دے کر مارا گیا تب مجھے بہت دُکھ ہوا تھا نورا......اب میں اکیلی نہیں ہوں' مجھ جیسی جانے کتنی خواتین ہیں جو میری ہی طرح حالات اور واقعات کا سامنا کر رہی ہیں۔ مجھے رہنے کے لئے گھر ہے اور پہننے کے لئے کپڑے بھی۔ سیرت بھی ہے میرے ساتھ اور میں سیرت کو اپنے سینے سے لگا کر اپنا درد بانٹتی ہوں......اُن کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ بے سہارا ہیں وہ، بے گھر ہیں وہ...... پہننے کے لئے کپڑے نہیں کھانے کے لئے روٹی نہیں...... کیا بتاؤں......کیسے بتاؤں نورا......!''

''بھابی یہاں آ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے ہر کوئی رو رہا ہے، ہر کوئی چیخ رہا ہے لیکن آواز سنائی نہیں دیتی ۔ ہر کوئی اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اَن دیکھی آگ کی تپش میں جھلس رہا ہے، یہاں سب کچھ تہس نہس ہو چکا ہے دن کی روشنی میں بھی مہیب سناٹوں کا احساس ہوتا ہے۔''

''ہاں نورا...... اِس کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں، تم جو کہہ رہی ہو وہ سچائی ہے، تم جو دیکھ رہی ہو وہ حقیقت ہے۔ یہاں اب ہر کوئی سچائی اور حقیقت کی صلیب پر لٹکا ہوا ہے......تم یہاں آئی بھی جب یہاں کچھ بھی نہ رہا...... یہ جو تم دیکھ رہی ہو نا وہ راکھ ہے' دھواں ہے' آگ ہے' وحشت ہے' دہشت ہے......!''

......☆......

''ابو آپ کیسے ہیں''۔

''تم اتنے سال کہاں رہی نورا۔''

''لندن میں ...... آپ ہی نے تو میرا فارم بھرا تھا' میرے لندن جانے کے لئے سارے انتظام کئے تھے۔''

''ہاں ہاں' میں نے ہی تمہیں فلم اور ٹیلی ویژن میں ڈگری حاصل کرنے کے لئے لندن جانے کو کہا تھا، لیکن تم نے آنے میں بہت دیر کر دی......تم اپنوں سے دور ہوگئی، بہت دور......!''

''مجھے یہ سب کچھ یاد نہ دلاؤ نورا...... مین یہ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں''۔

''ابو''۔

''کہو بیٹا''

''میں اپنے بھائی کی قبر دیکھنا چاہتی ہوں' اُس مٹی کو چھونا چاہتی ہوں''۔

''بیٹا ان لاتعداد قبروں میں کیسے تلاش کرو گی اپنے بھائی کی قبر......''

''کیا''۔

''ہاں بیٹا وہاں بہت ساری بے نام قبریں ہیں''۔

"میں وہاں جا کر اُن سب بے نام قبروں پر اپنی عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کرنا چاہتی ہوں، اس مٹی کو چھونا چاہتی ہوں جس نے میرے بھائی جیسے ان گنت معصوموں کو اپنی آغوش میں چھپا رکھا ہے......!"

......☆......

زندگی کا یہ سفر بھی کس قدر عجیب سفر ہے، کبھی دو قدم چلنے کے بعد ہی منزلوں کے نشان عیاں ہوتے ہیں اور کبھی طویل تر مسافت طے کرنے کے بعد منزل کا کوئی سراغ نہیں ملتا...... میری یہ کہانی صرف میرے گھر تک محدود ہے، یہ تو صرف میرے گھر کی کہانی ہے لیکن میرے گھر سے باہر بھی ایسی سینکڑوں کہانیاں میری تلاش میں ہیں، دراصل میرے گھر کی کہانی ہر گھر کی کہانی ہے...... کشمیر کی کہانی ہے اور کشمیر کی کہانی صلیب پر لٹکی ہوئی ہے۔ منزل دور سہی لیکن سفر جاری ہے......!!!

............●●● ....

ہیلنگ ٹچ

جانے اس مختصر سی داستان کا اختتام کب ہوگا، کیسے اور کہاں ہوگا۔ جی گھبرا گیا ہے میرا، کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ سپنوں کے سہارے کب تک جیا جا سکتا ہے۔ سپنے ہمیشہ سُندر رہوتے ہیں جنگلی پھول کی طرح، خوشبو بکھیر کر مُرجھا جاتے ہیں۔ اَن جانی سوچیں میرے ذہن میں گھر بنا رہی ہیں لیکن پھر بھی سوچوں سے معمور ذہن کی بستی خالی نظر آرہی ہے۔ لگتا ہے ابھی منزل بہت دور ہے، اس منزل کی تلاش میں جن راہوں سے میرا گزر ہوا اب وہاں میرے اپنے قدموں کے نشان بھی نظر نہیں آتے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو ہر قدم پر زندگی ملتی تھی، خوبصورتی ملتی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وقت کا پہیہ رُک گیا اور مجھے زندگی کے ہر ہر قدم پر بدصورتی سے دوچار ہونا پڑا، پہلے باپ مر گیا، پھر ماں گئی۔ پیچھے تین بہنوں کا بوجھ چھوڑ گئے۔ اپنی تعلیم پوری نہ کر سکا خوبصورت مستقبل کے جو خوبصورت خواب دیکھے تھے وہ ادھورے رہ گئے۔ اپنے مستقبل سے زیادہ اپنی بہنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُن کی پرورش، تعلیم، شادی بیاہ، ان کے زندگیاں سنوارتے سنوارتے میرے اپنے ارمان، میری اپنی خواہشیں اور چاہتیں وقت کی صلیب پر لٹک کر رہ گئیں اور جب میں اپنی تین معصوم بہنوں کے ساتھ رہتا تھا اور خود ایک دفتر میں ایک آڈرلی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ تھوڑی سی تنخواہ سے گھر کے چھوٹے موٹے اخراجات پورے تو ہو سکتے تھے لیکن میرے سامنے میری بہنوں کے مستقبل کا سوال بار بار اُبھر رہا تھا۔ ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دینے کے لئے، میں نے دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کر دیئے کبھی ہاکر بن کر اخبار فروخت کرتا رہا اور کبھی کرائے پر تھری وہیلر لے کر رات گئے تک لوگوں کو اپنی اپنی منزل تک پہنچاتا رہا۔ اس طرح سے آمدنی میں قدرے اضافہ ہوا اور میں اپنی بہنوں کی تعلیم و تربیت پر زیادہ وقت دینے لگا۔

مرتے وقت باپ نے کہا تھا۔ ”بیٹا میں تمہیں اعلیٰ تعلیم نہ دلوا سکا لیکن کوشش کرنا کہ تمہاری

بہنوں کو بہتر اور اعلیٰ تعلیم حاصل ہو۔"

مجھ سے چھوٹی بہن آمنہ انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد بی ایڈ بھی کر چکی ہے اور اب نوکری کی تلاش میں ہے وہ میرا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔آمنہ اپنی ایک بہن کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے اور اس سے چھوٹی بہن کو کمپیوٹر انجینئر مگر نوکری؟!

ایک دفتر سے دوسرے دفتر، ایک اسکول سے دوسرے اسکول، آمنہ ہر صبح گھر سے نکل جاتی ہے اور شام کو ناکام ہو کر لوٹتی ہے۔نوکری مل جاتی، ہاں ضرور مل جاتی لیکن یہ نوکری خریدنے کے لئے اس کے پاس اور نہ میرے پاس کوئی سرمایہ ہے، نہ روپیہ پیسہ ہے، جیسے نوکری بازار میں بکنے والی کوئی شے ہو، پیسہ دو اور خرید کر گھر لے آؤ......لیکن ایک شام جب وہ گھر آئی تو خوش خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے جب اس بے وقت کی خوشی کے بارے میں جاننا چاہا تو اس نے کہا۔

"آج ایک دفتر میں ایک شریف اور معزز شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا۔اُس نے میری بات توجہ سے سُنی اور مدد کرنے کا وعدہ کیا!"

یہ سن کر اس کی بہنوں کے چہروں پر گلاب کھل اٹھے۔اُن کی آنکھوں میں اُمید کی لہریں دوڑنے لگیں اور میں ......میں بھی خوش ہوا لیکن ایک خوف، ایک انجانا سا ڈر اندر ہی اندر کروٹیں لینے لگا اور دوسرے ہی دن جب وہ اس شریف اور معزز شخص سے ملنے گئی تو جلد ہی گھر لوٹ آئی۔ وہ اُداس ضرور تھی لیکن اس کی آنکھوں سے جیسے آگ برس رہی تھی۔لمحہ لمحہ جُھلسانے والی آگ۔

"تم اتنی جلدی واپس آ گئی ہم تو......"

"ہاں بھیا، آنا ہی پڑا، دراصل اس سماج، اس سوسائٹی میں ایک بے بس اور مجبور عورت کے لئے کوئی عزت نہیں۔کوئی وقار نہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو، تم ٹھیک ہو نا۔"

"بھیا اس سے پہلے کہ وہ شریف اور مہذب انسان اپنے نقلی چہرے سے نقاب سرکاتا اور زلالت پر اُتر آتا، میں نے اپنی سینڈل سے اس کا اصلی چہرہ لہولہان کر دیا اور وہاں سے چلی آئی ......میں ٹھیک ہوں......" یہ کہتے ہوئے حیا کی سُرخی اب بھی اس کے چہرے پر تیر رہی تھی۔

کشتی منجدھار میں ہوتو دونوں کناروں پر نظر رکھنا پڑتی ہے، ایک طرف میری بہن کی عزت کا سوال اور دوسری طرف اس کی نوکری؟

''ارے میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی چیز کی کمی ہے، میں جو ہوں نا، سب دیکھ لوں گا۔ تمہیں نوکری مل جائے گی عزت کی نوکری، یہ میرا وعدہ رہا۔''

''بھیا......''

'ہاں اب تمہیں کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں، کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں بے مقصد گھر سے نکل پڑا۔

دفتر میں بالکل جی نہ لگا۔ سارا دن سوچتا رہا۔ میرے ساتھی میری خاموشی اور اُداسی کو دیکھ کر حیران تو نہ ہوئے کیوں کہ خاموشی اور اُداسی میری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں لیکن میرے کام کرنے کے انداز میں انہیں ایک عجیب سی تبدیلی نظر آئی۔ وہ اس تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے رہے لیکن میں نے یہ کہہ ٹال دیا کہ ان دنوں صحت ٹھیک نہیں رہتی!''

کئی شب وروز ایک ساتھ گزر گئے!

رات اندھیری ہے، نہ چاند کی نرم وسبک روشنی ہے اور نہ ہی ستاروں کی چمک ودمک، ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک سیاہ بادلوں کا دھند لکا چھایا ہوا ہے، خلقت سے بھری یہ بستی خالی خالی سی نظر آتی ہے اور میں اپنے بند کمرے میں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ اس مختصر سی داستان کا اختتام کب کہاں اور کیسے ہوگا۔ دور بہت دور گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ شاید کراس فائرنگ ہو رہی ہے۔ ان آوازروں سے ان سناٹون میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اب تو یہ سناٹے نہ صرف میری بلکہ ہم سب کی زندگیوں کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے جارہی ہے۔ لوگ مرتے ہیں اس جانب بھی اور اس جانب بھی کوئی وردی میں ہے اور کوئی بغیر وردی کے دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں ہیں۔ بندوقیں چلتی ہیں اور خون بہتا ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ خون کا رنگ ایک ہی ہے یہ خون بہتا کیوں ہے کس لئے بہتا ہے اور کس کے لئے بہتا ہے اپنے کھوکھلے وجود کی سربلندی کے لئے اندھی تقلید کو سچ ثابت کرنے کے لئے، ایک دوسرے کے

گھروں کو پھونکنے کے لئے ، تہذیب وتمدن اور انسانیت کے محل پر آگ برسانے کے لئے ، دھرتی حاصل کرنے کے لئے ، دھرتی تو اپنی جگہ پر کھڑی ہے۔ ندی نالے حسب معمول رواں دواں ہیں، درخت بھی ہیں جو ہمیشہ کی طرح ہر موسم میں اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ جھیل جھرنے اور پہاڑ بھی ہیں، تو یہ تباہی کس لئے...... گولیوں کی آواز میں شدت آ گئی ہے، شاید یہ گولیاں ، یہ بندوقیں عزت وآبرو، عصمت وعظمت اور نیکی کی دیواروں کو مسمار کرتی ہوئی آگے اور آگے بڑھ رہی ہیں۔ آواز اور بازگشت کا شور کس قدر مہیب اور بھیانک ہوتا ہے یہ کوئی ہم سے پوچھے۔ زعفران زار وادی کے لوگوں سے پوچھے۔

کل شب کی طرح آج بھی آمنہ زار زار رو رہی ہے، اس کی آنکھوں سے بارش کی طرح برستے آنسو اس کے رخساروں پر بکھر رہے ہیں کاش آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو شاید وہ اس کے آنسو پونچھ لیتی، اس کے اندر کے درد کو جاننے کی کوشش کرتی۔ اس کو اپنے سینے سے لگا کر اس کی بے آواز ہچکیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی۔ آنکھوں میں پھیلی ہوئی یاسیت کو اپنی آنکھوں میں چھپا لیتی اور آمنہ رو رہی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ آمنہ کے پاس جا کر اسے کہہ دو...... ''میں تمہارے آنسوؤں کو بہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک پل بھی رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا۔'' پر میں اسے یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ اس کے درد کی دوا میرے پاس نہیں ہے۔''

دوسرے دن صبح سویرے جب میں حسب معمول اخباروں کا ایک بنڈل لے کر گھر گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ بہت سے لوگ اخبار کے لئے بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے اور جب میں تھک ہار کر گھر لوٹا تو چند اخبار بکنے سے رہ گئے تھے۔ چائے پیتے سمے میں نے اخبار پر نظر ڈالی اور یہ خبر پڑھ کر اُچھل پڑا کہ ملی ٹنسی سے متاثر لوگوں کے لئے سرکار نے کئی اقدام اُٹھائے ہیں اور خاص طور سے جس گھرانے کا کوئی فرد ملی ٹنسی کا شکار ہوا ہے۔ اس گھرانے کے ایک فرد کو ہیلنگ ٹچ کے تحت نوکری دی جائے گی۔

ہیلنگ ٹچ ، بے سہاروں کا آخری سہارا؟!

بہت دن ایک ساتھ گزر گئے !!!

اور پھر ایک دن صبح سویرے لوگوں کو اخبار کے فرنٹ پیج پر ایک ساتھ دو تصویریں دیکھ کر کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ حیرانی شاید اس لئے نہیں کیوں کہ اب ایسی تصویریں روز ہی اخباروں کی زینت بنتی ہیں۔ کبھی ایک روپ میں، کبھی دوسرے روپ، یہ دو تصویریں بھی کچھ ایسی نوعیت کی تھیں۔ ایک طرف آمنہ کے بڑے بھائی کی خون سے لت پت لاش تھی اور دوسری طرف سرکار کا ایک اعلیٰ آفیسر آمنہ کو ہیلنگ ٹچ کے نام پر نوکری کا حکم نامہ دے رہا تھا لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہ کی گئی تھی کہ آمنہ کے بھائی کو کس جانب سے گولی لگی تھی۔ کیا وہ گولی وردی میں تھی یا وردی کے بغیر اور ملی ٹنسی سے اس کا کیا تعلق تھا، وہ تو صرف اپنے بہنوں کا بھائی تھا۔ پھر وہ ملی ٹنٹ کب اور کیسے بنا اور کیسے ملی ٹنسی کا شکار ہوا۔ لیکن آمنہ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ صرف اپنی بہن کو روزگار دلانے کے لئے اُس کے بھائی نے ایک نیا روپ اپنا لیا تھا......!!!

..........●●● ....

مجروح قافلے کی داستان

موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی ابابیلیں نئے حوصلے اور نئے بانکپن کے ساتھ گھونسلے بنانے میں مصروف ہوگئیں، کبھی آس پاس اور کبھی دور دراز سے چن چن کر تنکے جمع کرنے کے بعد وہ تنکا تنکا جوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو نیا رنگ وروپ دینے لگیں۔ بہت دنوں کی ان تھک محنت کے بعد ان کے گھر بن گئے۔ ان کے گھونسلوں میں حرارت اور حرکت آگئی۔ زندگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ ان گھونسلوں میں اپنائیت تھی اور ملائمت بھی اور پھر رفتہ رفتہ ان کے بے رونق زندگی میں رونق سی آگئی۔ خوشنما، خوش رنگ اور پیارے پیارے بچوں کی چہچہانے سے فضا میں موسیقی ابھرنے لگی، بالکل ایسی ہی جیسے تیز رفتاری سے بہتا ہوا پانی بڑے بڑے پتھروں سے ٹکرا کر ایک پُرسوز اور پُرکیف آواز کو جنم دیتا ہے اور یہ آواز کانوں میں قطرہ قطرہ شہد گھول دیتی ہے۔

وقت کی لہریں بہتی رہیں!

اور ایک روز جب شام کے وقت ابابیلیں گھوم گھام کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئیں تو ایک موٹے باز کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔ وہ ان کے گھروں میں جھانک رہا تھا۔!

''آپ شاید غلطی سے یہاں آگئے ہیں، یہ ہمارے گھر ہیں، ہمارے بسیرے، ہمارے آشیانے......جی ہاں یہاں ہم سب رہتے ہیں۔'' ایک ابابیل نے اُڑتے اُڑتے کہا۔

''تمہارے گھر تمہارے رہنے کی جگہ......''

''جی ہاں جی ہاں'' اب کی بار ابابلیں ایک ساتھ بول اٹھیں۔

''یہ سجے سجائے گھر اور تمہارے......نہیں یہ صرف میرے رہنے کے قابل ہیں اور ان میں رہنے کا حق بھی میرا ہی بنتا ہے۔''

''وہ کیسے جناب''

''شاید تم اس بات سے بے خبر ہو کہ اب یہ سارا علاقہ میرا ہے، یہ بستی میری ہے یہ زمین میری ہے یہ ندی نالے دریا، جھیلیں، درخت سبزہ سب کچھ میرا ہے......صرف میرا۔''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے...... جب ہم یہاں آئے تھے تو یہ جگہ ویران اور اجاڑ تھی۔ ہم سب نے مل جل کر اسے محبت محنت اور سلیقے سے سجایا، سنوارا، ہماری ان تھک محنت سے ہی یہ جگہ اب گل و گلزار اور شاداب نظر آ رہی ہے''

''خاموش ہو جاؤ'' باز چلا اٹھا۔

''مگر یہ ظلم ہے، زیادتی ہے''

''ظلم اور زیادتی'' باز نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا...... ''نہیں یہ نہ ظلم ہے اور نہ زیادتی بلکہ یہ ہمارا حق ہے''۔ اس نے کہا ''ہم یہاں مختار کل بن کے آئے ہیں یہاں رہنے کے لئے یہاں ٹھہرنے کے لئے۔ یہاں سے جانے کے لئے نہیں ......جو ہمیں یہاں سے جانے کے لئے کہے گا وہ ہمارے عتاب کا شکار ہو گا......سمجھ گئے نا......''

''صرف تمہارے کہنے سے وقت کا پہیہ رک تو نہیں سکتا''۔

''بے وقوف ہو تم سب'' باز نے کہا۔ ''وقت کہ پہیہ رک بھی سکتا ہے۔''

''وہ کیسے'' ایک عمر رسیدہ ابابیل نے پوچھا۔

''تمہاری اس جنت کو کھنڈر میں تبدیل کر کے تمہارے گھروں کو مسمار کر کے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ تم ایسا نہیں کرو گے'' ......کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

باز اب کی بار خاموش رہا۔ اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر دیکھتے دیکھتے بہت سارے باز اُڑتے اُڑتے سامنے آ گئے۔ ایک عجیب سا شور و غل سنائی دینے لگا۔ ان کی آنکھوں

میں دہشت تھی، بھوک تھی، ہوس تھی اوران کی تعداد شاید ابابیلوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ابابیلیں ڈر گئیں سہم گئیں لرز گئیں اور تھرتھرا گئیں......اور پھر بھیگی بھیگی آنکھوں سے ایک ایک کر کے وہاں سے چل پڑیں، ابدی بہاروں کی کھلکھلاتی مسرتوں کو چھوڑ کر......اپنا سب کچھ چھوڑ کر......نئی زمین کی تلاش میں، نئے گھر اور نئے گھونسلوں کی تلاش میں۔ وہ جانتی تھیں کہ نیا گھر بھی بنے گا، نیا گھونسلہ بھی ملے گا، پیارے پیارے بچوں کی چہچہاہٹ سے فضا میں موسیقی بھی بکھر جائے گی لیکن اگر یہ باز غاصب کا روپ اپنا کر وہاں بھی آگئے اوران کے آشیانوں پر شب خون مارا تو......؟

کسی بھی ابابیل کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا......!!

..........●●● ....

خواب بھی بکتے ہیں

رات اب گہری ہو چکی تھی!

اور وہ پرانے بوسیدہ لباس سے اپنے بدن کو لپیٹتا ہوا کھلی سڑک کے بیچ سے گزر رہا تھا۔ کانپتا ہوا ڈگمگاتا ہوا۔ سڑک کے ایک طرف درختوں کی لمبی قطار تھی اور دوسری طرف دور دور تک پھیلے ہوئے مکان اور ان مکانوں کے درمیان ایک چھوٹی سی مسجد، مسجد کے سامنے ایک کھلا کھلا آنگن تھا جو جنازہ گاہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جنازہ گاہ کے ایک گوشے میں جانے کس نے سیمنٹ کا ایک چبوترہ بنایا تھا جہاں لوگ پرندوں کے لئے مکئی چاول ڈالا کرتے تھے۔ اس لئے اپنی خوراک کی تلاش میں یہاں ہر وقت کافی تعداد میں اڑتے ہوئے پرندے نظر آتے تھے، ان میں کبوتروں کے تعداد اچھی خاصی ہوتی تھی۔!!

وہ جب جنازہ گاہ کے قریب پہنچا تو اس کے قدم بے ساختہ رُک گئے۔ مسجد خاموش تھی، نمازی جا چکے تھے، جنازہ گاہ میں خاموشی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے خالی خالی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ زور سے کاٹتی ہوئی ہوا گزر رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ بے حد تھک چکا ہے اور اب سونے سے ہی یہ تھکاوٹ دور ہوسکتی ہے۔ وہ سو گیا اور جب جاگا تو صبح ہو چکی تھی اور مسجد کے گنبد سے ایک آواز ابھر رہی تھی ''اللہ اکبر''۔

اور پھر اسے اچانک چاروں سمیت پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں سنائی دیں۔ آسمان کی وسعتوں سے اڑتے ہوئے پرندوں کی ایک بڑی تعداد چبوترے کی جانب بڑھ رہی

تھی، وہ گھبرا سا گیا اور گھبرا کر جنازہ گاہ سے باہر آیا اور سڑک کی جانب چل پڑا۔ وہ چلتا رہا اور چلتے چلتے سڑک کے آخری سرے تک جا پہنچا، جہاں بالکل نئے انداز میں لکڑیوں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا خوبصورت سا مکان تھا، مکان کی کھڑکی بند تھی اور دروازہ بھی لیکن دھیمی دھیمی سی روشنی کا احساس باہر سے بھی ہو رہا تھا۔ وہ رک گیا۔ یہ اس کی زندگی کا ایک سنسنی خیز لمحہ تھا۔ مکان کے دروازے پر لٹکے پرانے تختے پر نئے حروف سے 'پوسٹ آفس' لکھا تھا۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا، اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن لگ رہا تھا جیسے دو چار آدمی کام میں مصروف ہوں۔

"یہ خط نائب تحصیلدار کے نام ہے" اندر سے آواز آئی۔ وہ چونک پڑا، اسے اپنے سینے میں دھک دھکی سی محسوس ہو رہی تھی، پھر اسے کئی نام سنائی دیئے اور پھر ایک اور نام سنائی دیا۔ "علی خان"۔

علی خان۔ یہ اس کا اپنا نام تھا۔ اس نے عقیدت کے ساتھ آسمان کی جانب دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ دروازے پر دستک دی۔

"پوسٹ مین صاحب"۔

"کون"

"میں علی خان ہوں آپ نے میرا نام پکارا، میں آیا ہوں۔"

جواب میں بے حد مذاق بھری ہنسی سنائی دی!

"صاحب، یہ ایک پاگل ہے، پانچ برس سے قریب قریب روز ہی اپنی چھٹی لینے پوسٹ آفس کے چکر کاٹتا ہے" پوسٹ مین نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"چھٹی، کس کی چھٹی، کہاں سے آنی ہے؟" پوسٹ ماسٹر نے پوچھا جو حال ہی میں یہاں تعینات ہوا تھا۔

"کہاں سے آنی ہے یہ تو خود بھی نہیں جانتا، کہتے ہیں کوئی پانچ برس قبل اس کا بیٹا نہ جانے کہاں چلا گیا، اس نے بہت تلاش کی، نہیں ملا، پھر کسی نے کہا وہ اپنے شہر سے دور کسی اور جگہ

نوکری کر رہا ہے، پیسے کما رہا ہے، جب اس کے پاس کافی روپیہ پیسہ آئے گا وہ تمہیں ضرور چھٹی لکھے گا، تمہیں اپنے پاس اپنے نئے شہر بلائے گا۔''

''اور تب سے وہ اپنے بیٹے کی چھٹی کا انتظار کر رہا ہے اور ابھی تک وہ چھٹی نہیں آئی، یہی کہنا چاہتے ہو نا تم۔'' پوسٹ ماسٹر نے سوال کیا۔

''ہاں پوسٹ ماسٹر صاحب، ابھی تک نہ تو اس کا بیٹا آیا اور نہ ہی اس کی چھٹی، اب تو تین سال سے میں بھی یہاں کام کر رہا ہوں۔ صاحب یہ پاگل ہے پاگل جانے دیجئے''۔ نیا پوسٹ ماسٹر ایک لمحے کے لئے اپنی سوچوں میں ڈوب گیا۔

''نہیں پوسٹ مین صاحب مجھے نہیں لگتا یہ پاگل ہے اس چھٹی سے اُس کی بیٹے کی زندگی کا تعلق ہے اس چھٹی سے اُس کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ وہ خواب پوشیدہ ہیں جو اُس کے بیٹے کے مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سہانے اور پرکشش خواب زندگی کو سجانے سنوارنے کے خواب۔ وہ پانچ برسوں سے اپنے ہونٹوں پر لگے زہر ہلاہل کو قند سمجھ کر اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے، تم نہیں جانتے۔ پوسٹ مین صاحب جب زندگی کی تاریکی میں مٹھاس بھرے نغمے ڈوب جاتے ہیں تو صرف ایک خلا نظر آتا ہے۔''

''صاحب آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں ہاں میں یہ سب کیا کہہ رہا ہوں، کیوں کہہ رہا ہوں، کس کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اچھا تم ساری ڈاک چھانٹ چکے نا...... تم اب جاؤ۔ ڈاک بانٹ آؤ، یہاں کے باقی کام میں خود دیکھ لوں گا۔''

اور پھر ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی!

گزشتہ پانچ برس سے علی خان کو اپنے بیٹے کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ملی تھی۔ شروع شروع میں اسے بتایا گیا کہ اس کے بیٹے کو فوج میں نوکری مل گئی ہے اور وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شہر سے دور چلا گیا ہے لیکن اس کی غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی، کسی اور نے بتایا کہ

اس نے اس کے بیٹے کو ایک سپید رنگ کی جپسی میں دیکھا، اس کے کلائیوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

''سپید جپسی......میرا بیٹا......ہتھکڑیاں......؟'' وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ تو اپنے بیٹے کی ہر حرکت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کے جسم کے ایک ایک انگ میں شرافت کا خون گردش کر رہا ہے، وہ بُرا ہو ہی نہیں سکتا۔ برائی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ سپید گلاب کی طرح بے داغ ہے۔ اس روز وہ دل کھول کر رویا، ان آنسوؤں میں پیار تھا، جدائی کا غم تھا!!

اور ایک شام مسجد کے امام نے علی خان کو بتایا......صبر کرو میرے بھائی، صبر کا انجام ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ تمہارا بیٹا ایک دن ضرور آئے گا، وہ شاید اس شہر میں نہیں ہے، لیکن وہ ضرور لوٹ آئے گا تمہارے لئے تم سے ملنے کے لئے......صبر کرو میرے بھائی......''!

''کب آئے گا میرا بیٹا مولوی صاحب۔''

''انتظار کرو علی خان......آنے سے پہلے وہ تمہیں ضرور چھٹی لکھے گا'' اور اس دن کے بعد وہ اپنے بیٹے کی چھٹی کا انتظار کرنے لگا......''!!

پانچ سال کا طویل عرصہ......اس دوران یہ جنت دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ رک رک کر ایک نیا روپ اختیار کرتی گئی۔ جہنم کا روپ......آگ، شعلے، قتل وغارت وآبروریزی، ناانصافی......اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی، اچانک بہت سے نوجوان لاپتہ ہو گئے، تلاشِ بسیار کے بعد بھی ان کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ملی، پھر ایک ہنگامہ ہوا، لوگ متحرک ہو گئے اور حراستی ہلاکتوں کے خلاف سڑکوں پر آ گئے، تلاش شروع ہوئی، کئی بے نام قبروں کی نشاندہی کی گئی اور کئی مسخ شدہ بے نام لاشیں ان قبروں سے برآمد کی گئیں......!

ایک بار علی خان آٹھ دن تک پوسٹ آفس نہیں آیا، پوسٹ آفس میں علی خان کے جذبات کو سمجھنے اور اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کے وسیع القلبی کسی نے بھی نہ دکھائی، لیکن وہ کیوں نہیں آیا یہ جاننے کے سبھی خواہاں تھے۔ پھر آٹھ دن بعد علی خان پوسٹ آفس آیا لیکن اس روز وہ ٹوٹ چکا تھا، ہانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے زندگی کی شام کے آثار صاف دکھائی دے

رہے تھے۔

''پوسٹ ماسٹر صاحب میرے بیٹے کی چھٹی آئی کیا۔ میر نام علی خان ہے۔''

''نہیں ابھی تک تو نہیں آئی، آئے گی تو میں رکھ لوں گا'' پوسٹ ماسٹر نے نرم لہجے میں کہا۔

''لیکن آپ سے ایک التجا ہے۔''

''ہاں ہاں کہو بھائی''۔

میری چھٹی جب بھی آئے گی تو آپ کو خود آنا ہوگا''۔

''کہاں؟''

''میری قبر پر''

''کیا؟''

''سچ کہتا ہوں، اب میری زندگی کی آخری سانسیں چل رہی ہیں، اب میری آنکھیں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتیں...... بھلا یہ قتل وغارت، یہ لوٹ مار، آگ برساتی بندوقیں، جھلسی ہوئی بے کفن لاشیں۔ نہیں دیکھ سکتا میں یہ سب کچھ۔ میری چھٹی جب بھی آئے گی، مجھ تک پہنچا دیتا ورنہ قیامت کے روز آپ کے سامنے کھڑا ہو کر آپ سے سوال کروں گا۔''

اس کے بعد علی خان دکھائی نہ دیا، اس کو تلاش کرنے کی فرصت پوسٹ آفس والوں کو کہاں تھی اور ضرورت بھی کیا تھی، ان کیلئے تو وہ ایک عام سا شہری تھا۔

اس روز پوسٹ ماسٹر صاحب اداس تھے۔ ان کا بیٹا بیمار تھا، کئی روز سے گھر سے کوئی خط نہ آیا تھا، گھر جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ڈاک آئی خطوط کا انبار لگ گیا۔ ایک خط پر اس کی نظریں اٹک کر رہ گئیں۔ یہ خط علی خان کے نام تھا!!

''پوسٹ مین صاحب'' انہوں نے آواز دی۔

''جی صاحب''

''یہ علی خان آج کل کہاں ہیں۔''

''جانے کہاں پتہ کرتا ہوں۔''

''ہاں ہاں جا کر پتہ کرو اس کے نام خط آیا ہے، شاید اس کے بیٹے کا خط ہے۔ بہت انتظار کیا تھا اس نے اس خط کے لئے...... جاؤ بھائی اور علی خان کو پوسٹ آفس لے آؤ''۔

اس روز پوسٹ مین لوٹ کر نہیں آیا۔

دوسرے دن جب پوسٹ مین پوسٹ آفس آیا، وہ اکیلا نہ تھا چند اور بھی لوگ اس کے ہمراہ تھے۔

''صاحب، علی خان اب اس دنیا میں نہیں، اب یہ لوگ آئے ہیں اس کے نام کا خط لینا چاہتے ہیں، علی خان کی وصیت پوری کرنا چاہتے ہیں...... یہ لوگ اس خط کو اس کی قبر تک پہنچانا چاہتے ہیں۔''

اب کی بار پوسٹ مین کے لہجے سے بھی اداسی جھلک رہی تھی۔

''پوسٹ ماسٹر صاحب، کیا لکھا ہے اس خط میں، آپ بتا سکتے ہیں''۔ کسی نے پوچھا

''ہاں بتا سکتا ہوں لیکن لفافہ چاک کرنا پڑے گا۔''

''لفافہ کھول دیجئے'' کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔ پوسٹ ماسٹر نے لفافہ کھولا اور خط پڑھنے لگا، آہستہ آہستہ...... کسی کو کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ پھر اچانک اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ اور پھر پوسٹ ماسٹر اونچی آواز میں روتے روتے خط پڑھنے لگا۔

''جناب علی خان صاحب!

ہمیں یہ خبر دیتے ہوئے دُکھ ہو رہا ہے کہ آپ کا بیٹا سلطان خان اب سے پانچ برس قبل لاپتہ ہو گیا تھا۔ وہ دراصل اغوا کیا گیا تھا اور پھر اسے ملی ٹنٹ کا روپ اور نام دے کر ایک فرضی جھڑپ میں قتل کر دیا گیا۔ ایک بے نام قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ عوامی دباؤ کے پیش نظر ان بے نام قبروں اور قبرستانوں کی نشاندہی کا کام شروع کر دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں سلطان کے بارے میں تحقیقات مکمل ہو چکی ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایک معصوم اور بے گناہ شہری

تھا۔ان لوگوں کی نشاندہی کی جارہی ہے جنہوں نے پہلے سلطان کو حراست میں لے لیا پھر ملی ٹنٹ کا نام اور روپ دے کر ابدی نیند سلا دیا اور اپنے لئے انعامات اور ترقیاں حاصل کیں۔نشاندہی مکمل ہوتے ہی ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے گی ،لیکن ہم آپ کے بیٹے کو واپس نہیں لا سکتے اس لئے سرکار نے آپ کے حق میں ایک لاکھ روپے کا معاوضہ منظور کیا ہے اور ایک لاکھ روپے کا چیک منسلک ہے......''

یہ سب سنانے کے بعد پوسٹ ماسٹر بے تحاشا رونے لگ گیا اور روتے روتے کہنے لگے۔''اپنے اس شہر میں تو خواب بھی بِکتے ہیں۔اُف یہ خوابوں کے سوداگر؟''

............●●● ....

درد آتا ہے دبے پاؤں

دھوپ ڈرتے ڈرتے ہوادار کھڑکی پھلانگتی ہوئی کمرے کے اندر آ گئی اور دیوار پر ٹھہر گئی۔ یہ دیوار اب ہموار نہیں ہے۔ اس کا پلاسٹر جگہ جگہ اکھڑ چکا ہے اور اس میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ یہ نرم نرم دھوپ جب اس بوسیدہ دیوار کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے تو یہ دراڑیں جیسے زخموں کا سا روپ اپنا لیتی ہیں اور یہ دھوپ بھی زخمی ہو کر رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر کھڑکی سے باہر چلی جاتی ہے ۔میرے شریر اور میرے وجود کو لہولہان کر کے۔!!!

اس نے آہستہ آہستہ اپنے جسم کو بے لباس کر دیا اور میرے قریب آ گئی۔

''یہ طویل عرصہ کیسے گزارا تم نے'' اس نے پوچھا۔

''بس گزر گیا'' میں نے جواب میں کہا۔

''ناراض ہو''

''کس بات پر''

''اس لئے کہ میں نے آنے میں دیر کر دی بہت دیر''۔

''اب تم آ گئی ہو یہی کیا کم ہے''

''میرے لوٹ آنے سے خوشی نہیں ہوئی'' اس نے کریدا۔

''ہوئی ہے اور نہیں بھی''

''کیا مطلب ہے تمہارا''۔

''تم شاید نہیں جانتیں کہ اس طویل مدت میں یہاں آسمان کی وسعتیں سمٹ گئیں اور دھرتی کی گود پھیلتی گئی۔''

''لیکن اب میں لوٹ آئی ہوں۔''

''ہاں جانتا ہوں کہ تم لوٹ آئی ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے خاموشی اختیار کی حالانکہ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد میں اس قدر اکیلا ہو گیا تھا جیسے پرندوں میں سے ایک پرندہ۔!!

دھوپ ابھی تھکی نہیں تھی وہ دیوار کو اب بھی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔ ایک بے نشان نقطے کی تلاش میں ہم دونوں خوابوں کی طرح بکھر گئے۔ ایک دوسرے کے خیالوں میں الجھ گئے۔ نا امیدی کی مسکراہٹوں اور پُر امید دل کی دھڑکنوں میں کھو گئے۔ جہاں کچھ نہ ہو، کوئی بات نہ ہو وہاں کوئی کہانی جنم نہیں لیتی اور پھر اتنے برسوں بعد وہ تلخ سا موضوع چھیڑنے سے کیا حاصل۔ ہاں اس کے جانے کے وقت میں نے یہ ضرور کہا تھا۔

''تمہارے آنگن کی مٹی کو تمہارے قدموں کی آہٹ نہ سن کر کس قدر مایوسی ہوگی کچھ تمہیں اس کا احساس ہے۔ صبح صبح کمرے کی کھڑکی کھولتے ہی ہوا کا ایک زوردار جھونکا تمہارے چہرے کو شاداب کرنے کے لئے جب اندر آئے گا تو تمہیں نہ پا کر اس پر کیا بیتے گی۔ اس کے بارے میں تم نے کچھ سوچا بھی ہے۔ شہد کی مکھیوں کا والہانہ گیتوں کے اثر سے تمام غنچے جب پھولوں کا روپ اختیار کریں گے تو ان کی بھینی بھینی خوشبو تمہیں کہاں کہاں تلاش کرتی رہے گی۔''

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے'' اس نے میری بات کو اَن سنی کرتے ہوئے پھر وہی پرانا سوال دہرایا تھا۔

''ہاں آخری اور اٹل بھی، میں مروں گا یا جیوں گا اپنے گھر میں اپنے گاؤں میں اور اپنے گاؤں والوں کے ساتھ۔''

اور اس طرح میری گل بدن میری آشارانی چلی گئی، اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ۔ اس وقت میں شاید اس کے لئے کوئی نہ تھا نہ اپنا نہ پرایا۔ شاید وہ اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ اس لئے چلی گئی اور میں اپنی سوچوں کے دائرے سے باہر نہ نکل سکا اور اسی لئے رکا رہا اور اپنے پرانے بوسیدہ مکان کے درودیواروں میں مقید رہا اور اپنی کھلی کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وحشت،

دیوانگی خاک اور خون کی ملاوٹ بربادی کے نظارے۔ اس نے شاید اب حقیقت کو پالیا تھا اور لوٹ آئی۔ میں شاید ابھی تک اسی دوراہے پر کھڑا تھا جہاں مجھے وہ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہم دونوں کو شاید اب بھی ایک دوسرے کا عکس دیکھنے کا انتظار تھا۔

''تم جانتے ہو''

''کیا''

''اب میں وہ نہیں ہوں جو پہلے تھی''۔

''لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ خاموش رہی

''اب کیا سوچ رہی ہو'' میں نے پوچھا

''یہی کہ تم اب بھی پہلے جیسے ہو...... بالکل ویسے ہی......''

''ہاں جانتا ہوں۔''

''کیسے'' اس نے سوال کیا۔''

''اس لئے کہ اس دوران میں نے صرف گھٹن دیکھی، بھوک دیکھی، ویرانیاں اور مجبوریاں دیکھیں۔ خون سے لت پت لاشیں دیکھیں اور......اور......ہم!

''اور کیا''

''اس کمرے کی بوسیدہ دیواروں پر اسی دھوپ کو بے لذت ہوتے ہوئے دیکھا۔ بے لذت دھوپ بے لذت زندگی۔ میں اب اس بے لذت دھوپ اور بے لذت زندگی کا عادی بن چکا ہوں۔''

''شاستروں میں لکھا ہے کہ اپنے آپ کو تکلیف دینا گناہ ہے۔''

''یہ کہنے کی باتیں ہیں، سچ نہیں ہے۔''

''پھر سچ کیا ہے؟''

''سچ یہ دھوپ ہے اور میرے وجود کا ٹھنڈا پن، میرے چاروں طرف بکھری ہوئی

تنہائیاں اور تاریکیاں ، سچ تو یہ ہے آشارانی کہ ان خوفناک تاریکیوں میں بھی میرے گاؤں والوں میرے بھائیوں نے میری ہر طرح سے حفاظت کی ، باہر کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے، اس کا انہوں نے مجھے احساس تک نہ ہونے دیا۔"

"اس کا مجھے احساس ہوا"، آشارانی نے کہا...... "یہ احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نیا ماحول اپنا چکی تھی اور اس نئے ماحول میں رہ کر مجھے احساس ہوا کہ ایک اور بھی سچائی ہے۔"

"کون سی سچائی ؟" میں نے پوچھا۔

"اپنی مٹی اپنی مٹی ہوتی ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوا جس وجہ سے بھی ہوا۔ کیا وہ سب صرف یہیں ہوتا ہے......نہیں ہرگز نہیں...... یہاں سے باہر کی دنیا میں بھی دیوانگی ہے۔ بندوقیں اور گولیاں ہیں، بھوک ہے اور مجبوریاں بھی......لیکن......"

"لیکن کیا"

"وشال دیش کی اَن گنت بھیڑ میں یہاں سے جانے والے جس اہم اور عظیم نعمت سے محروم ہو گئے وہ ان کی شناخت ہے، پہچان ہے اور وہ سب اسی شناخت اور پہچان کی تلاش میں بکھر چکے ہیں۔"

"میری گل بدن یہ تم کہہ رہی ہو۔"

"ہاں میں جو کہہ رہی ہوں وہ ایک حقیقت ہے ایک سچائی ہے۔ تپتی دھوپ میں جب انہیں اپنے چناروں کی ٹھنڈی آغوش یاد آتی ہے تو ان کی آنکھوں سے خود بخود آنسو امڈ آتے ہیں۔ جب پانی حاصل کرنے کے لئے انہیں نل کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے تو یہاں کی جھیلیں ان کی نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ یہ برف پوش پہاڑ ، یہ ندی نالے یہ پودوں سے بھرپور باغات اب شاید ان کی تقدیر میں نہیں، ہاؤس بوٹ ، ڈونگے ، شکارے ان کی ساخت اور بناوٹ ان کی آنے والی نسلیں صرف کتابوں سے جان سکیں گے"۔

آشارانی بے حد جذباتی ہو گئی، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کہاں ملتے ہیں اُن ریگ زاروں میں وہ کشمیری نغمے جن میں شیرینی ہے نکہت ہے، نیلگوں پانی کا نور ہے، خواب آلودہ راتوں کی مہک ہے، بزرگوں کی عظمت کا اعتراف ہے!"

اس کے بعد وہ بے تحاشا رونے لگی۔ مجھے لگا جیسے محبت کی غماز آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ اس کے دل کی الجھنوں کا ترجمان ہے اور میں من ہی من میں سوچنے لگا، کاش جانے والے لوٹ آتے۔ اپنی دھرتی کی گود میں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سایہ بن کر ڈھل جائیں۔ مجھے احساس ہے کہ صبح صادق اگرچہ ابھی دور ہے لیکن تنگ راستوں پر گم نام روشنی پھیل رہی ہے۔!

کچھ کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دوسروں سے کہی نہیں جاتیں!!

دھوپ کا بدن اب میرے سامنے بے لباس پڑا ہے، حرارت اور گرمی سے بھرپور اور میں نے بے لباس بدن کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا، اپنے بازوؤں میں اس سراپا کو سمیٹ لیا ایسا کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ اس کی حرارت اور گرمی میرے ٹھنڈے پن سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔ اس نے ٹھیک تو کہا تھا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں پہلے جیسا ہی ہوں۔ بالکل ویسا ہی!!

اور میں آہستہ آہستہ اپنے وجود کے ٹھنڈے پن میں پگھلتا رہا اور وہ میرے وجود کی دھوپ کی راہ ہموار کرتی گئی پھر آہستہ آہستہ دیوار کی ناہمواری ہموار ہوگئی۔ دراڑیں ختم ہوگئیں۔!

اور پھر دھوپ نے ایک لمبی انگڑائی لی اور کمرے کے ایک گوشے میں سمٹ کر کھڑکی سے باہر چلی گئی۔!!



● ...... نور شاہ

ڈرامہ

سفر زندگی کا

(صبح کا وقت، بانسری کی تان سے خوشگوار ماحول کی عکاسی)

پاپا: آمنہ...... کہاں ہو...... کہاں ہو تم آمنہ، میں جا رہا ہوں۔

آمنہ: (دور سے) آ رہی ہوں (قریب آکر) پاپا کچھ چاہیئے آپ کو

پاپا: نہیں تو؟ تم وہاں کیا کر رہی ہو کچھ خاص

آمنہ: نہیں تو پاپا...... شکیل بھیا کے کپڑے وارڈ روب میں رکھ رہی تھی (خوش ہو کر) چار سال بعد آیا ہے میر بھائی انگلینڈ سے

پاپا: میرا بھی تو بیٹا ہے وہ...... پورے چار سال بعد گھر لوٹ آیا ہے، میں خوش ہوں کہ تم گھر میں ہر فرد کا خیال رکھتی ہو، آمنہ سوچتا ہوں جب تم سسرال چلی جاؤ گی تو میری دیکھ بھال کون کرے گا۔

آمنہ: پاپا میں نہیں جانے والی، میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گی، ہر پلِ ہر گھڑی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

پاپا: Oh-No یہ کیسے ممکن ہے، اچھا چھوڑ دو Let you relax۔ اَب تمہارا بھائی شکیل بھی آیا ہے مل بیٹھ کر سارے معاملات نپٹا دیں گے اور ہاں...... تمہارے بھائی کے لئے میں بھٹ صاحب کو زبان دے چکا ہوں...... آمنہ..... میری سویٹ بیٹی کاش آج تمہاری ماں زندہ ہوتی۔

آمنہ: پاپا...... ہاں آج ممی زندہ ہوتی تو...... (اُداس ہو کر) تو آپ اپنا دُکھ سُکھ اس کے ساتھ بانٹ لیا کرتے، کتنے بد قسمت ہیں، ہم، آپ کو اکیلے اکیلے سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے (جذباتی ہوتی ہے، گلہ رُندھ جاتا ہے)

پاپا: نا...... نا بیٹی، یہ موتی نہ بہاؤ اِن آنکھوں سے

آمنہ: پاپا: اِن آنسوؤں پر میرا کوئی اختیار نہیں

پاپا: چُپ ہو جاؤ بیٹا...... دیکھو تمہارا بھائی آیا ہوا ہے، لمبا سفر طے کر کے آیا ہے، تمہیں روتا ہوا دیکھ کر پریشان ہوگا...... کیا وہ ابھی سو رہا ہے...... سونے دو...... اچھا میں چلتا ہوں...... I am getting late

(MUSIC BAR)

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

آمنہ: (اپنے آپ سے) کاش آج ہماری ماں ہمارے درمیان ہوتی...... ارے یہ کیا شکیل بھیا بستر چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے ایک بار پھر دیکھتی ہوں اُسے

(کھڑکی کے پٹ کھولنے کی آواز)

آمنہ: بہت سو چکے...... اب اُٹھو بھی

شکیل: (خواب ناک آواز میں) کھڑکی بند ہی رکھو...... Please don't disturb me

آمنہ: (ہنستے ہوئے) شکر ہے کہ نیند سے جاگ تو پڑے...... دیکھو تو دھوپ کمرے کے اندر تک آ گئی ہے۔

شکیل: لیکن یہ چبھ رہی ہے میری آنکھوں کو

آمنہ: بھیا روشنی زندگی کا نام ہے اور زندگی کا دوسرا نام

شکیل: (بات کاٹ کر) روشنی؟ ہے نا

(دونوں ہنستے ہیں)

شکیل: (انگڑائی لیتے ہوئے) یہاں کتنا کچھ بدل گیا ہے آمنہ، وہ آس پاس کے مکان اور اِن میں رہنے والے...... اچھا وہ صابر چاچا ہے نا

آمنہ: نہیں اُن کا تو پچھلے سال انتقال ہو گیا

شکیل: اور وہ اپنی دلاری آنٹی ہے نا

آمنہ: تم اُسے بھولے نہیں

شکیل: کیسے بھول سکتا ہوں ...... اپنوں کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے

آمنہ: وہ یہیں ہے، اُس نے جانے سے انکار کیا اور کسی ایک کی بھی نہ سُنی

شکیل: انکار کیا...... That is great

آمنہ: ہاں بھیا! وہ کہتی ہے اپنوں سے اور اپنی مٹی سے جو رشتہ ہے وہی سچا ہے باقی سب جھوٹ ہے۔ ہمارے لان کے اُس پار جو چھوٹا سا مکان ہے نا دلاری آنٹی ہی کا تو ہے۔

شکیل: میں خوش ہوں کہ وہ سلامت ہے، کتنی پُرخلوص تھی اور کس قدر لاڈو پیار سے مجھے پالا ہے اُس نے

آمنہ: یہ سب باتیں بعد میں ہوں گی، چل کر نہا لو، پاپا نے تمہارے لئے نئے کپڑے بھی لائے ہیں

شکیل: میں سمجھا نہیں

آمنہ: I Mean تمہاری پسند کے Jeans، میں نے وارڈروب میں رکھے ہیں منگوائے ہیں،

شکیل: Imported ہوں گے مگر ایسی کیا مجبوری تھی میں خود بھی اپنے ساتھ Jeans لایا ہوں۔

آمنہ: معلوم ہے جب تم نے اپنے آنے کی خبر دی پاپا نے سب کو الرٹ کر دیا، یہ ٹھیک کرو، وہ ٹھیک کرو۔

شکیل: کیا سچ مچ

آمنہ: اور نہیں تو کیا، کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے، تمہارے کمرے کی دیواروں کا پینٹ تک بدل دیا کمرے کا قالین بدل دیا، پردے بدل دیئے۔

شکیل: (آہ بھر کر) مگر اس سے کیا ہوتا ہے...... یہاں آ کر سیدھے منہ بات تک نہ کی، ائیر پورٹ پر میں جیسے ہی گلے ملنے کے لئے آگے بڑھا اُنہوں نے اپنی بانہیں کھولنا بھی گوارہ نہ کیا بس مجھے

دیکھتے ہی رہ گئے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

آمنہ: نہیں یہ بات نہیں، آج کل سوچتے زیادہ ہیں، کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، رات میں نے انہیں ممی کی تصویر سے باتیں کرتے دیکھا، آنکھوں میں آنسو تھے۔

شکیل: (آہ بھر کر) یہ سچ ہے کہ پاپا مام (Mom) کے بغیر تنہا اکیلا محسوس کرتے ہوں گے مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ To be honest صرف پاپا کے لئے یہاں چلا آیا ورنہ ایک بہت بڑی کمپنی کی آفر تھی جاب کے لئے

آمنہ: اچھا اور سناؤ لندن کی

شکیل: (ہنستے ہوئے) تین چیزیں وہاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، چھتری، برساتی اور آدمی

آمنہ: ہاں ہاں سنا ہے کہ لندن کے موسم کا کوئی بھروسہ نہیں

شکیل: Exactly...... ایک وسیع اور پھیلی ہوئی دنیا ہے، لیکن، سچی بات یہ ہے کہ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود مجھے آپ لوگوں کی یاد ستاتی رہی، اپنی مٹی کی خوشبو بلاتی رہی

آمنہ: اچھا بیڈ ٹی لے آؤں

شکیل: بیڈ ٹی نہیں پیتا، بریک فاسٹ لوں گا نیچے پاپا کے ساتھ، وہ ابھی تک سوئے ہوئے ہیں کیا

آمنہ: نہیں تو، وہ تو کب کے نکل گئے کام اس قدر پھیلا رکھے ہیں کہ اب سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے، میں نے کتنی بار اُن سے کہا کہ آخر یہ دوڑ دھوپ کیوں، اُن کے پاس ہر بات کا ایک ہی جواب ہے۔

شکیل: وہ کیا

آمنہ: کہتے ہیں میرا شکیل شہزادوں کی طرح جئے میں یہی چاہتا ہوں

شکیل: (ہنستے ہوئے) شہزادے بگڑتے بھی ہیں نا

آمنہ: سچ بھیا، اتنا بڑا بزنس سنبھالنا اُن ہی کا دل گردہ ہے، حالانکہ اب صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی Hypertension کی شکایت ہے، وہ پہلی سی Patience نہیں رہی، ذرا ذرا سی بات پر مزاج

میں تلخی آجاتی ہے۔

شکیل: پاپا دولت اور جائیداد اکٹھا کرنے میں تو لگے ہیں، میرے ساتھ بات کرنے کے لئے وقت نہیں ہے اُن کے پاس......؟

آمنہ: یہ زندگی کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے بھیا، پاپا ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں

شکیل: یعنی اُن کے عدمِ تحفظ کا احساس ابھی تک نہیں گیا، Sense of insecurity ان کو اندر ہی اندر کھائی جارہی ہے......اچھا چھوڑ دو......مجھے یہ اٹیچی کھولنے دو

(چابی لگانے اور پھر اٹیچی کھولنے کی تاثرات)

شکیل: دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں......میری بہن کو دولہنیا جو بننا ہے

آمنہ: آپ بھی مجھے گھر سے بھگانا چاہتے ہیں

شکیل: نہیں فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں، لیکن میری تھوڑی ہی چلے گی

آمنہ: پاپا نے سب کچھ طے کیا ہوا ہے

شکیل: آمنہ ہر باپ چاہتا ہے کہ بچے آباد ہوں......مگر ہوگا سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق

آمنہ: کاش ایسا ہو سکتا......لیکن میرا کس قدر خیال رکھتے ہیں، مجھے صبح کالج چھوڑ جاتے ہیں، شام کو Pick up کرنے آتے ہیں اور اپنے ساتھ گھر لاتے ہیں

شکیل: حالانکہ گھر میں دو عدد ڈرائیور اور دو عدد کاریں بھی ہیں، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہاری آزادی سلب کرنا چاہتے ہیں

آمنہ: No No میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ He is actually carning too much اور یہ کوئی غلط بات تو نہیں۔

............وقفہ............

Music Bar

(کار کے آنے اور پھر رُکنے کی آواز)

پاپا: ارے تم لوگ ابھی تک تیار نہیں ہوئے ...... آمنہ تم نے کالج نہیں جانا ہے کیا...... چلو آج تمہارا بھائی تمہیں کالج چھوڑ آئے گا۔

شکیل: پاپا ذرا دیکھو میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں۔Full Length Suit

پاپا: ذرا دیکھوں تو...... ارے جب لانا ہی تھا تو میرے رُتبے کا بھی کچھ خیال کرتے، لاکھوں میں کھیلتے ہوئے باپ کے اکلوتے بیٹے ہو۔

شکیل (قدرے اونچے لہجے میں) پاپا

پاپا: اچھا نہیں بولتا، میں نے بزنس کو کہاں کہاں تک پھیلا دیا ہے یہ جان کر تو بہت خوش ہوگا

شکیل: (سنجیدگی سے) کچھ کچھ جان گیا ہوں

پاپا: جاننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔

شکیل: مگر آپ کی صحت، پاپا آپ کو اپنی صحت کی ذرا بھر بھی فکر نہیں

پاپا: تم لوگ خوش رہو، آباد رہو، پھر میری صحت بھی ٹھیک رہے گی...... دیکھو میں نے بہت کچھ کھویا، بہت کچھ پایا...... سکون کی موت مروں گا جب تمہیں زندگی میں Settle ہوتے دیکھ لوں گا...... اپنی بہن کو کالج چھوڑ آنا۔

شکیل: ڈرائیور سے کہہ دیں گے وہ چھوڑ آئے گا۔

پاپا: مگر میں جو کہتا ہوں تم وہی کرو۔ مجھے کسی پر بھروسہ نہیں

شکیل: پاپا معاف کرنا، جنہیں اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہوتا وہ دوسروں پر بھی بھروسہ نہیں کرتے

پاپا:No Discussions Please...... آمنہ کو کالج چھوڑ کر بھٹ صاحب کے ہاں چلے جانا

شکیل: بھٹ صاحب کے ہاں...... مگر کیوں؟

پاپا: بھٹ صاحب کے ورک شاپ کے ساتھ کول صاحب کا جو ورکشاپ ہوا کرتا تھا وہ میں نے اور بھٹ صاحب نے خرید لیا ہے۔

شکیل: اور کول صاحب

پاپا: وادی چھوڑ کر چلے گئے

شکیل: اتنا بڑا بزنس چھوڑ کر......آپ نے اُنہیں روکا نہیں، آپ نے انہیں کیسے جانے دیا؟

پاپا: میرے پاس ایسی باتوں کے لئے وقت نہیں، میں جو کہتا ہوں تم وہی کرو اور مجھے کیا کرنا ہے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور ہاں میں نے تمہارے واپس آنے کی خوشی میں ایک پارٹی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بھٹ صاحب کو ذرا یاد دلانا...... میں چلتا ہوں، آمنہ جلدی سے تیار ہو کر کالج چلی جاؤ......اپنے بھائی کے ساتھ۔

(..........قدموں کی چاپ..........)

......A Long Music Bar ....Change Over...........

شکیل: (جذباتی انداز) دلاری آنٹی، یہاں میرے سب ہیں پھر بھی میں اپنے آپ کو غیر سا اور اجنبی سا محسوس کرتا ہوں اور تم......تم یہاں تنہا اکیلی رہتی ہو، دور دور تک تمہارا کوئی اپنا نہیں تمہیں ڈر نہیں لگتا۔

آنٹی: شکیل بیٹا......ڈر......خوف......کیوں اور کس سے، کوئی اپنی دھرتی ماں کو بھی چھوڑ کر چلا جاتا ہے ماں کی گود کو خالی چھوڑ کے جانا اچھا ہے کیا...... جو چلے گئے، انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اپنی پہچان کھودی...... پرائی مٹی میں، آب و ہوا میں پودا بھی ٹھیک سے نہیں پنپتا، سوکھ کر مر جاتا ہے۔

شکیل: آنٹی سوچتا ہوں اِس کا ذمہ دار کون ہے......وہ جو اپنی جائیدادیں چھوڑ کر چلے گئے یا وہ جو اُن کا سودا کرنے میں جٹ گئے۔

آنٹی: شکیل بیٹا اِس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا۔

شکیل: آنٹی تم ملنے نہیں آئیں مجھ سے

آنٹی: آنا چاہتی تھی سوچا تم لوگ ایک دوسرے سے مل کر جی بھر کر باتیں کر لو تو پھر......

شکیل: (بات کاٹ کر) پاپا نے ابھی تک ٹھیک سے دیکھا تک نہیں، باتیں کرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، وہ صرف حکم چلانا جانتے ہیں۔

آنٹی: یہ تو اُن کی پرانی عادت ہے بیٹا (آہ بھر کر) تمہاری ماں کو بھی کتنے دُکھ سہنا پڑے

شکیل: (حیراں ہو کر) دُکھ سہنا پڑے

آنٹی: اور نہیں تو کیا، اب پرانی باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل بیٹا، من ہی من میں سلگتی رہی، ترستی رہی

شکیل: آنٹی یہ تم کیا کہہ رہی ہو

آنٹی: ہائے وہ بے چاری کچھ بھی نہ دیکھ سکی، اُس کی ساری آشائیں ادھوری رہیں

شکیل: مگر کیوں؟

آنٹی: تو کیا تم سچ مچ کچھ نہیں جانتے؟

شکیل: بالکل نہیں (جذباتی ہو کر) کیسے مر گئی وہ...... آنٹی مجھے فوراً بتاؤ ابھی بتاؤ

آنٹی: تمہیں کسی نے کچھ نہیں بتایا

شکیل: آنٹی آپ کی قسم، میں کچھ بھی نہیں جانتا

آنٹی: اب اُس بات کو پردے میں رہنے دو بیٹا...... تمہاری زباں سے بات نکلی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔

شکیل: آپ کی قسم آنٹی، اپنی قسم، میں زباں تک نہیں کھولوں گا

آنٹی: کہنا آسان ہے بیٹے، تمہاری زباں سے اگر ایک لفظ بھی نکلا تو میرے لئے مصیبت کھڑی ہو جائے گی، وہ بے حد شریف اور پردہ کرنے والی تھی...... نماز کی پابند...... لوگوں کو شک ہے کہ اُس نے زہر کھا کر اپنی جان لے لی۔

......Sad Music Bar......

شکیل: (جذباتی ہو کر) زہر...... I can't believe this

آنٹی: بیٹے اپنی آنکھوں سے تو میں نے نہیں دیکھا لیکن وہ مرنے سے پہلے اچانک بے ہوش ہو گئی اور پھر اُنہیں کبھی ہوش نہ آیا۔ مرتے وقت اُس کے ناخن تک نیلے ہو گئے تھے۔

شکیل: آج تک...... ابھی تک مجھے اِن باتوں سے بے خبر کیوں رکھا گیا۔ کیوں آنٹی کیوں۔

آنٹی: (جذباتی انداز) اب اِن باتوں کی تہہ میں جانے سے کچھ نہیں حاصل ہونے والا...... دیکھ بیٹے میری لاج رکھنا، میں خود گھٹ گھٹ کر جیتی رہی ہوں اتنے سارے دن۔

شکیل: چلتا ہوں آنٹی

......(Music-Scene Change)......

پاپا: (دور سے) شکیل...... (قریب آکر) شکیل آمنہ کہاں ہے۔

شکیل: کالج گئی ہے پاپا

پاپا: اور تم نے اُسے Drop نہیں کیا کالج

شکیل: وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی اور میں آپ کے سامنے ہوں

پاپا: بھٹ صاحب کے ہاں گئے تھے۔

شکیل: نہیں، میں نے ضروری نہیں سمجھا اُن کے ہاں جانا

پاپا: ضروری کیا ہے اور کیا نہیں ہے، یہ دیکھنا میرا کام ہے، زندگی ڈھنگ سے گزارنے کے لئے ڈگری کی نہیں بلکہ تجربے کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہارے پاس ڈگری تو ہے تجربہ صفر کے برابر ہے۔

شکیل: میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس کیا ہے اور میرے پاس کیا

پاپا: نہیں تم کچھ نہیں جانتے، کچھ جانتے تو میری ساتھ اس طرح باتیں نہیں کرتے، میں تمہیں ایک رئیس کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اس کے لئے تمہیں بھی کچھ کرنا ہوگا، کل کی پارٹی اسی لئے arrage کی ہے تمہارے جان پہچان بڑھے، تمہارے اثر ورسوخ میں اضافہ ہو اور سنو بھٹ صاحب کو موڑ میں رکھنا...... میں جارہا ہوں۔

(قدموں کی چاپ)

شکیل: (اپنے آپ سے) چلے گئے...... اب شام کو لوٹ آئیں گے کچھ اور سنانے کے لئے...... میرا یہاں دل کیوں نہیں لگتا، کہیں کچھ ٹوٹ گیا ہے میرے اندر، ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ میری

بے قراری بڑھتی جا رہی ہے۔

(موسیقی اُبھرتی ہے اور فیڈ اوٹ ہو جاتی ہے)

آمنہ: کیا سوچ رہے ہو

شکیل: کچھ بھی تو نہیں

آمنہ: کچھ تو ہے

شکیل: سوچنے کے لئے بہت کچھ ہے، انسان سوچے گا نہیں تو پھر اُس کی زندگی میں ترتیب کیسے آئے گی، توازن کیسے پیدا ہوگا لیکن تمہارے لئے یہ سب باتیں بے معنی ہیں تم نے اپنی زندگی کو کالج اور کچن تک محدود کر رکھا ہے، ہاں یاد آیا، تیاریاں مکمل ہیں نا۔

آمنہ: وہ میں دیکھ لوں گی تم فکر نہ کرو، پارٹیاں دینا پاپا کے لئے کوئی نئی بات نہیں، سب چکنے چکنے نوٹوں کا کمال ہے...... وہ دیکھو دلاری آنٹی بھی ہماری طرف آ رہی ہے...... آؤ...... آؤ...... آنٹی

آنٹی: (آتے ہوئے) آج صبح سے ہی تم کو مصروف دیکھ رہی ہوں، کہیں شادی کی تیاریاں تو نہیں ہو رہی ہیں۔

شکیل: نہیں یہ بات نہیں، میرے لوٹ آنے کی خوشی میں پاپا کے یار دوست، اُن کے بزنس پارٹنر اور کچھ بڑے لوگ آ رہے ہیں، پارٹی ہونے والی ہے۔

آنٹی: بھگوان کرے تمہارے آنے سے تمہارے پاپا کو سکھ شانتی نصیب ہو، دُکھ اِس بات کا ہے کہ تمہاری ماں یہ آن بان نہ دیکھ سکی، تم چھوٹے تھے، اتنے سے تو تھے جب وہ اِس دنیا سے چل دی تھیں۔

(رونے لگتی ہے)

آمنہ: آنٹی آپ کی آنکھوں میں آنسو

آنٹی: کچھ نہیں بیٹا، یونہی بیتے دنوں کی یاد آ گئی، تمہاری ماں یاد آئی، اچھا میں چلتی ہوں۔

آمنہ: جی آنٹی

آنٹی: سنو تو آمنہ بیٹی، اپنے بھائی کا خیال رکھنا، دیکھو تو کتنا کمزور نظر آرہا ہے۔

شکیل: نہیں ایسی کوئی بات نہیں، پہلے سے ذرا slim ہو گیا ہوں آنٹی

آمنہ: (چلتے چلتے) میں ذرا کچن سے ہو آتی ہوں

شکیل: O.K

....

(پس منظر میں باتیں، ہنسی، قہقہے، موسیقی) CHANGE OVER

آواز ۱: That is really fasinating

آواز ۲: Lovely food

آواز ۱: اِن کی پارٹی میں ہر چیز قرینے سے ہوتی ہے، اِن کی بزنس Sense کا جواب نہیں۔

آواز ۲: کون مقابلہ کرسکتا ہے اِن کا، مٹی سے سونا نکالتے ہیں

آواز ۱: آج تو خود بھی جوبن پر ہیں، بیٹے کا رشتہ بھٹ صاحب کی لڑکی سے طے کرنے جا رہے ہیں۔

آواز ۲: دیکھ نہیں رہے ہو کہ بھٹ صاحب کا کتنا خیال رکھا جا رہا ہے۔

(موسیقی کا ایک خوشگوار ریلا)

شکیل: (آہستہ سے) پاپا میں اب چلوں

پاپا: (آہستہ سے) نہیں نہیں یہ کیا سوچیں گے، کیا کہیں گے۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے

شکیل: (اپنے آپ سے) Suffocating بے سر پیر کی پارٹی ہے

بھٹ انکل: شکیل بیٹے، یہ کیا tune ہے، کوئی ڈھنگ کی موسیقی سنا دو

پاپا: انگلینڈ میں رہ کے آیا ہے نا، وہ لوگ شور کو ہی سنگیت کہتے ہیں

بھٹ: (ہنستے ہوئے) ٹھیک کہا آپ نے، ہم لوگ......

شکیل: (بات کاٹتے ہوئے) اور ہم ہیں کہ شور اور سنگیت میں بھی فرق نہیں کر سکتے۔

بھٹ: Is it really so

شکیل: دیکھئے انکل، سنگیت کی کوئی زبان نہیں ہوتی، کوئی مذہب نہیں ہوتا، اس کا تعلق ہمارے جذبات و احساسات سے ہے، ہماری موسیقی ہو یا ویسٹرن میوزک، دونوں کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔

بھٹ: مجھے نا بیٹے ولایتی چیزوں سے وحشت ہوتی ہے، چاہے وہ میوزک ہو یا کلچر

شکیل: (ہنستے ہوئے) مگر وسکی تو آپ foreign ہی پسند کرتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا

پاپا: شکیل (ڈانٹتے ہوئے) شکیل

شکیل: میں چلتا ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے

بھٹ: کیوں ہماری کمپنی آپ کو پسند نہیں بیٹے

شکیل: میری پسند یا ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے

بھٹ: فرق پڑتا ہے، میں ایک خاص مقصد سے یہاں آیا ہوں

شکیل: پاپا ایک منٹ

پاپا: کیا ہے

شکیل: (آہستہ سے) میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں

پاپا: بات بعد میں بھی ہو سکتی ہے، دیکھتے نہیں کتنے ذی عزت لوگ ہیں یہاں

بھٹ: شکیل جانا چاہتا ہے تو جانے دیجئے

شکیل: ہاں میں چلتا ہوں

...... A Short Music Bar......

پاپا: شکیل کا اس طرح جانا آپ کو بُرا تو نہیں لگا

بھٹ: بالکل نہیں، اُس کی رگوں میں خون ہے، ابھی ابھی ولایت سے لوٹا ہے وہاں کے بیک گراونڈ کا کچھ تو اثر ہوگا، ہمارے یہاں کا ماحول، رہن سہن، ہمارا بزنس، یہ سب سمجھنے کے لئے کچھ وقت لگے گا ہی...... ارے ہاں آپ نے اِن دنوں کتنے اور مکان خریدے۔

پاپا: بھٹ صاحب، اب تو قریب قریب سارے مکان بِک چکے ہیں اور جو باقی بچے ہیں ان کی

خرید وفروخت میں کافی جھنجٹ ہیں۔

بھٹ: لیکن وہ لان کے اُس پار والا مکان......وہ عورت اب بھی وہاں رہتی ہے۔

پاپا: آپ دلاری کی بات کررہے ہیں، وہ اپنے گھر میں ہی رہتی ہے۔ اکیلی تنہا ضرور ہے لیکن ہے دل گردے والی، کہتی ہے جو چلے گئے انہوں نے اپنی جنم بھومی سے وفا نہیں کی۔

بھٹ: (ہنستے ہوئے) سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ یہاں سے چلے نہ جاتے تو آپ کے وارے نیارے کیسے ہوتے (قہقہہ لگاتا ہے) اچھا اب چلتا ہوں، بے حد لذیز کھانا تھا۔

پاپا: جانے سے پہلے One for the road

بھٹ: انکار کرنا میری عادت نہیں

(دونوں ہنستے ہیں)

............موسیقی اور فیڈ اوٹ

پاپا: تم پارٹی سے اس طرح کیوں چلے آئے۔ These are bad manners

شکیل: میری طبیعت ٹھیک نہ تھی

پاپا: مجھ بہانہ بازی سے چڑ ہے

شکیل: آپ کچھ بھی سمجھیں، میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بٹ صاحب بڑے آدمی ہوں گے روپے پیسے کے لحاظ سے، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔

پاپا: فرق پڑتا ہے، اِن کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں ہمارا فائدہ ہے۔

شکیل: فائدہ......کیسا فائدہ، آپ ہر بات اپنے فائدے کے لئے ہی کیوں سوچتے ہیں۔ صرف اپنے فائدے کے لئے۔ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں آپ

پاپا: ہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے بھٹ صاحب کی بیٹی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

شکیل: واہ پاپا واہ۔ میری زندگی کا فیصلہ آپ کررہے ہیں اور وہ بھی مجھے Confidence میں لئے بغیر۔

پاپا: (تحکمانہ لہجے میں) اِس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا (آہستہ سے) بیٹا میں تمہارا باپ ہوں، دشمن نہیں، ہر باپ کو اپنے بچوں کے دُکھ سُکھ میں شامل ہونے کا حق ہے۔

شکیل: کیسے باپ ہیں آپ، اپنے ہی بچوں کا حق چھین رہے ہیں۔

پاپا: (چلاتے ہوئے) شکیل...... مجھے اونچی آواز میں بات سننے کی عادت نہیں

(زور سے دار وازہ کھولنے کی آواز)

آمنہ: (آتے ہوئے) کیا ہوا پاپا، کیا بات ہے شکیل...... آپ لوگ کیوں چلا رہے ہیں پار سے دلاری آنٹی آئی ہے۔

پاپا: تمہاری دلاری آنٹی آئی ہے تو میں کیا کروں، اپنے ہونٹ سی لوں، وہ بار بار یہاں آنے لگی ہے۔ آخر کیوں۔

شکیل: Hold it papa۔ آنٹی کے بارے میں کچھ نہ کہیے، آپ شاید بھول رہے ہیں کہ انہوں نے آمنہ اور میری کافی دیکھ بھال کی ہے، پالا پوسا ہے، ایک ماں کی طرح

آمنہ: ہاں پاپا دلاری آنٹی نے ایک ماں کی طرح ہماری پرورش کی ہے، انسانی رشتوں کی عظمت کا احساس دلایا ہے اور کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہماری ماں ہم سے بچھڑ چکی ہے۔

پاپا: میں جا رہا ہوں اور جاتے جاتے تم سے کہہ دینا چاہتا ہوں شکیل کہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔

آمنہ: آپ زیادتی کر رہے ہیں پاپا۔ یہ شکیل بھیا کی زندگی کا سوال ہے، اُسے سوچنے کے لئے وقت دیجئے، شریک حیات چُننے کا آخری فیصلہ اُس کا ہی ہونا چاہئے۔

پاپا: I don't know

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)

......دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز ابھرتی ہے......

دلاری: کون...... دروازہ کھلا ہی ہے اندر آجاؤ

(دروازہ کھولنے کی صدا)

دلاری: شکیل تم۔ کیسے آنا ہوا بہت دنوں بعد نظر آئے۔

شکیل: تم بھی تو بہت دنوں سے ہمارے یہاں نہیں آئیں

دلاری: تمہارے پاپا نے منع جو کیا ہے

شکیل: منع کیا ہے۔ Strange، مجھے کچھ نہیں معلوم

دلاری: جا رہی ہوں یہاں سے، یہ گھر چھوڑ کر...... یہ مکان......

شکیل: تم ٹھیک ہو نا آنٹی...... کیا بات ہے۔

دلاری: میں وہی کہہ رہی ہوں جو گھما پھرا کر مجھ سے کہلوایا گیا ہے۔

شکیل: (مضطرب لہجہ) کیا کہا گیا ہے۔

دلاری: مکان خالی کرنے کو کہا گیا ہے...... تمہارے پاپا یہاں ایک حویلی نما مکان بنانا چاہتے ہیں، شاید فیکٹری لگانا چاہتے ہیں۔

شکیل: یہ کیسے ہو سکتا ہے...... رہائشی علاقے میں فیکٹری کھل نہیں سکتی، یہ قانون کے خلاف ہے۔

دلاری: قاعدے قانون ہم جیسے لوگوں کے لئے بنتے ہیں۔

شکیل: نہیں ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے، تم یہیں رہو گی، اسی گھر میں، اِسی مکان میں۔

دلاری: نہیں بیٹے نہیں، تمہارے پتا کے احسان کا بوجھ اب میں نہیں اٹھا سکتی۔

(رونے لگتی ہے)

شکیل: رومت آنٹی...... تم رولو گی تو میں کمزور محسوس کروں گا۔ کمزور اور بے بس (اعتماد کے ساتھ، تم یہیں رہو گی۔ اِس گھر میں...... اِسی مکان میں...... اسے کوئی نہیں خرید سکتا، کوئی نہیں گرا سکتا، یہاں تک کہ میرا باپ بھی نہیں، یہ میرا وعدہ ہے تم سے

(قدموں کی چاپ)

شکیل: تم آ گئیں آمنہ...... اچھا ہوا دیکھو آنٹی نے رو رو کر اپنی آنکھیں لال کر دی ہیں، انہیں چپ کراؤ۔ چپ کراؤ انہیں آمنہ

............موسیقی............

...... Scene Change ......

آمنہ: شکیل بھیا

شکیل: تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو

آمنہ: تم نے دیر کردی پاپا بہت غصے میں ہیں، تم نے اُن کا غصہ نہیں دیکھا ہے۔

شکیل: جو نہیں دیکھا ہے وہ اب دیکھ لوں گا۔

آمنہ: تمہاری باتیں سُن کر ڈر محسوس ہو رہا ہے......وہ آرہے ہیں۔

پاپا: (زور سے) شکیل......تم کہاں گئے تھے

شکیل: آنٹی کے ہاں گیا تھا

پاپا: دلاری کے ہاں......اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ یہاں سے جا رہی ہے

شکیل: جا رہی تھیں مگر میں نے روک لیا

پاپا: روک لیا......ان معاملات میں دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو......آمنہ تم باہر جاؤ

آمنہ: جی پاپا

شکیل: نہیں آمنہ تم یہیں رہو گی......پاپا آمنہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں، پوسٹ گریجویشن کر رہی ہے۔

آمنہ: بھیا میرے لئے پاپا سے کیوں بحث کر رہے ہو، میں ہی چلی جاتی ہوں۔

شکیل: نہیں تم نہیں جاؤ گی، بلکہ میں ہی کمرے سے باہر چلا جاتا ہوں۔

(موسیقی کا ایک تیز ریلا)

آمنہ: بھیا رُک جاؤ، کہاں جا رہے ہو......(وقفہ) چلا گیا......آپ بھی پاپا ہر بات کو ego کا مسئلہ بنا دیتے ہیں، ہر بات پر ناراض ہوتے ہیں، جو بات آپ غصہ میں آکر کرتے ہیں وہی بات پیار سے بھی سمجھائی جا سکتی ہے۔

پاپا: ارے اب تم ناراض ہونے لگیں (نرمی سے) میں جو بات کرتا ہوں، تم لوگوں کی بھلائی کے

لئے کرتا ہوں، میرا جو بھی ہے سب تمہارا ہے...... اچھا بند کردو اب یہ رونا دھونا اور بھائی کو دیکھ لو ...... جانے کہاں چلا گیا...... جاؤ اُسے منا کر لے آؤ۔

(...... موسیقی اور فیڈ اوٹ..........)

(فون کی گھنٹی بجتی ہے، ریسور اٹھانے کی آواز)

پاپا: ہیلو...... ہاں بول رہا ہوں، بھٹ صاحب آپ...... اچھا تو ٹنڈر کھول دیئے گئے، کیا کیا ہمارا ٹنڈر O.K ہو گیا ہے (وقفہ) ظاہر ہے کام شروع کرنا پڑے گا، میں چاہتا ہوں کہ آپ کا ہونے والا داماد میرا مطلب میرے بیٹے شکیل سے ہے یہ کام خود سنبھالے (وقفہ) آپ آرہے ہیں نا، ضرور آیئے...... کُھل کر بات ہوگی...... اچھا...... خدا حافظ

..........(ریسور رکھنے کی آواز..........)

شکیل: یہاں آکر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں اپاہج ہو گیا ہوں۔

پاپا: نہیں بیٹا، ایسا نہیں کہتے۔ آج بھٹ صاحب آرہے ہیں، یہ اُن کا ہی فون تھا، شادی کی تاریخ بھی تو طے کرنی ہے۔

شکیل: مجھے رشتوں کی یہی سودا بازی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی...... میں جا رہا ہوں۔

پاپا: کہاں

شکیل: کہیں بھی

پاپا: کیا مطلب...... یہاں کس چیز کی کمی ہے آخر...... دو کاریں ایک بڑی کوٹھی، نوکر چاکر اس قدر پھیلا ہوا بزنس، اب تو ورک شاپ کے لئے مشینیں آنا شروع ہو گئی ہیں بھٹ صاحب کی خواہش ہے کہ بزنس کی وہ سائڈ تم ہینڈل کر لو۔

شکیل: پاپا میں بھٹ انکل کے ساتھ کوئی بات کرنے کے لئے تیار نہیں، نہ تو شادی کی اور نہ ہی بزنس کی۔

پاپا: دراصل تم کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے...... آخر تم نے سوچا کیا ہے۔

شکیل: کس بارے میں

پاپا: اپنے بارے میں

شکیل: مجھے اپنے بارے میں سوچنے کی فکر کیوں ہونے لگی، پڑھا لکھا ہوں، اپنی روٹی روزی کما سکتا ہوں۔

پاپا: زندگی صرف روزی روٹی نہیں ہوتی......تمہاری ماں بھی تو......

شکیل: (بات کاٹ کر) ماں کا ذکر آپ نے صحیح وقت پر کیا، میں آپ سے جاننا چاہتا ہوں کہ اُن کی موت کن پُر اسرار حالات میں ہوئی ہے، سنا ہے کہ انہوں نے مجبور ہو کر اپنی جان لے لی۔

پاپا: شکیل یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ

شکیل: تو پھر سچ کیا ہے

پاپا: تم اس طرح باتیں کرو گے تو پھر لوگ کیا کہیں گے

شکیل: وہ بھی ایسا ہی کہتے ہیں اُن کے منہ آپ نے بند کر رکھے ہیں

پاپا: کیا مطلب

شکیل: آپ کی ہر بات کے پیچھے آپ کا بزنس Interest ہوتا ہے۔

پاپا: میں وہی کروں گا جسے میں اپنے لئے ٹھیک سمجھوں گا

(آمنہ آتی ہے)

آمنہ: (دور سے) شکیل (قریب آکر) بھیا تم سے بھی خاموش نہیں رہا جاتا، تم جانتے ہو کہ پاپا کو Hypertension ہے۔

پاپا: (بات کاٹتے ہوئے) یہاں کس کو میری فکر ہے اور رہی تمہاری دلچسپی کی بات تو تمہاری دلچسپی صرف ایک چیز میں ہے جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے تم اُسے تباہ کرنا چاہتے ہو، میری خریدی ہوئی عمارتوں کو Bulldoze کرنا چاہتے ہو، یہی نا۔ گھر کیسے بنتا ہے تم کیا جانو۔

شکیل: ہم جہاں رہ رہے ہیں، اِسے آپ گھر کہتے ہیں۔

پاپا: تو پھر یہاں آئے ہی کیوں۔

شکیل: آپ کی زنجیروں سے آزاد ہونے کے لئے ،افسوس اس بات کا ہے کہ آپ اپنے بچوں کے جذبات واحساسات بھی نہیں سمجھتے ،انسانی قدروں کی پرواتو دور کی بات ہے۔

آمنہ: پاپا کا دل دُکھانا کیا اچھی بات ہے۔

پاپا: بیس سال سے تم لوگوں کی دیکھ بھال کرر ہا ہوں ، ماں اور باپ دونوں کا فرض ادا کررہا ہوں، تم کو پال رہا ہوں، اُس کا صِلہ یہ مل رہا ہے، آخرتم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے، میں محنت کرتا ہوں، اپنا خون پسینہ بہاتا ہوں، آخر کس لئے ،کس کے لئے ؟ اور تم ہو کہ تمہیں ذرا بھر فکر نہیں۔

آمنہ: خدا کے لئے اب خاموش ہو جائے......ہمیں احساس ہے کہ آپ یہ سب کچھ ہمارے لئے کرر ہے ہیں۔

شکیل: آمنہ مجھے تمہارے حال پر رحم آتا ہے، تم پنجرے میں بند ایک پنچھی کی طرح ہو جس کی چابی تمہارے پاپا کے پاس ہے، یہاں تک کہ تم اپنے گھر میں رہ کر اپنی ماں کو بھی یاد نہیں کرسکتیں ......ماں کی یاد میں آنسو بہانے کے لئے تمہیں آنٹی کے گھر جانا پڑتا ہے۔

پاپا: دیکھا آمنہ کیا بول رہا ہے تمہارا بھائی

شکیل: جب سے میں یہاں آیا ہوں دیکھ رہا ہوں اور محسوس کرر ہا ہوں کہ آپ مجھے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اپنی انگلیوں پر نچانا چاہتے ہیں، You don't allow me to live, My own individual life ?

پاپا: تم ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ تم ابھی جوان ہو، میری طرح بوڑھاپے کی دہلیز تک نہیں آئے ہو باتیں کرنا آسان ہے اور زندگی کے راستے تلاش کرنا ایک کٹھن کام۔

شکیل: آپ مجھے بھی اپنی مٹھی میں بند کرنا چاہتے ہیں تا کہ میں چل پھر نہ سکوں، میں اس ماحول سے ناخوش ہوں، اِس طرح کے ماحول میں میں اپنے آپ کو تلاش کرسکتا ، اپنی شخصیت ، اپنے وجود سے واقف نہیں ہوسکتا ، آخر مال و جائیداد اور دولت ہی سب کچھ تو نہیں ہیں۔ زندگی کے کچھ

اور بھی تقاضے ہیں۔

پاپا: تم جھوٹ بول رہے ہو، میری دولت کے وارث تو تم ہی ہو۔

شکیل: دولت......دولت......دولت......آپ اپنے آپ سے ہی پوچھ لیجئے، اتنی دولت حاصل کر کے آپ خوش ہیں۔ پاپا آپ اپنے کو دھوکہ دے رہے ہیں، سچائی کچھ اور ہے۔

پاپا: میں نہیں جانتا کہ تمہارے لئے سچائی کیا ہے، میرے لئے سچائی بس یہی ہے کہ آدمی گھٹ گھٹ کر نہ جیئے، دوسروں کے سامنے اُسے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

آمنہ: (چلا کر) Will you stop it now......آپ لوگوں سے خاموش نہیں رہا جا سکتا۔

شکیل: میری پیاری سی معصوم سی بہنا، آج مجھے بولنے دو...... پاپا میں جانتا ہوں کہ آپ خوش ہوں گے۔ بہت خوش ہوں گے اگر میں آپ ہی کی طرح سوچنے لگوں آپ جو چاہتے ہیں وہی میں بھی چاہنے لگوں

آمنہ: شکیل

پاپا: شکیل تم اپنی حد سے بڑھ رہے ہو

شکیل: It is very suffocating here...... میں جیسے انسانی وجود میں ایک پرچھائیں ہوں، ہر سمت تاریکی ہے، اندھیرا ہے اور اندھیرے میں پرچھائیں کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ جا رہا ہوں، And let me tell you papa، آمنہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔

آمنہ: بھیا ہم پاپا کو اِس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

پاپا: تو کیا تم دونوں مجھے چھوڑ کر جاؤ گے۔

آمنہ: نہیں پاپا ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے، کہیں نہیں جائیں گے، کبھی نہیں جائیں گے (رونے لگتی ہے)

...... Scene Change......

آمنہ: اب آپ آرام سے لیٹے رہے اور کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچئے، ڈاکٹر

صاحب چار بجے دوبارہ دیکھنے آرہے ہیں۔

پاپا: (نقاہت بھرے لہجے میں) شکیل

آمنہ: وہ اپنے کمرے میں ہے، رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا ہوا شاید خط کے ذریعہ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

پاپا: وہ مجھ سے بات بھی تو کر سکتا ہے۔

آمنہ: Papa relax، آپ کے ٹھیک ہونے پر سب کچھ ٹھیک ہوگا۔

......Scene Change......

(صبح کا وقت، پرندوں کی چہچہاہٹ)

پاپا: (اپنے آپ سے) آج میری طبیعت بہتر ہے، مجھے کچھ دیر کے لئے لان میں ٹہلنا چاہیئے۔

(بستر سے اٹھنے اور کھڑکی کھولنے کے تاثرات)

پاپا: (اپنے آپ سے) آج موسم بھی تو بہت نکھرا ہوا ہے (حیران کُن لہجہ) لیکن یہ لفافہ...... یہ لفافہ کیسا ہے، میرے سرہانے کس نے رکھا ہے...... دیکھوں تو (لفافہ کھولنے کی آواز) شکیل کی ہینڈ رائٹنگ ہے، دیکھ تو لوں...... پڑھ تو لوں......

(پاپا کی آواز میں)

پاپا، آپ جانتے ہیں کہ یہاں کے حالات نے پچھلے چند برسوں میں کیسا رُخ اختیار کیا۔ (پاپا کی آواز کی شکیل کی آواز میں بدل جاتی ہے) خوف کی تلوار سروں پر لٹکی رہی، کچھ لوگ گھروں سے بے گھر ہوئے تو کچھ اپنے ہی گھروں میں قیدیوں کی سی زندگی بسر کرتے رہے، کتنے ہی بچے یتیم ہوگئے اور کتنی ہماری مائیں اور بہنیں بیوہ ہوگئیں، روزگار کے راستے مسدود ہوگئے، تعلیمی شعبوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوا، کچھ غرض کے دیوانوں نے اس صورتحال کا ناجائزہ فائدہ اٹھایا، اپنی چالاکی اور شاطرانہ چالوں سے لوٹ مچائی اور اپنی تجوریاں میں بے حساب دولت بھر دی۔ پاپا میری بات کا بُرا نہ مانیے، آپ کے پاس بھی بے حساب دولت ہے، زمیں جائیدادیں ہیں اور میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مجھے اور آمنہ کو آپ کی زمینوں سے اور مکانوں سے کچھ لینا نہیں۔

چھوٹا منہ اور بڑی بات نہ ہو تو ایک نیک مشورہ دینا چاہتا ہوں، آپ یوں کیجئے، ایک ٹرسٹ قائم کیجئے (پس منظر میں ایک مکان کے بیرون گیٹ پر ایک بڑا بورڈ نظر آتا، کشمیر ٹرسٹ) ایک آدھ فیکٹری لگائیے جس میں بے کار اور بے روزگار عزت و آبرو سے اپنی روٹی کمانے کے قابل ہوں (پس منظر میں ایک بورڈ لٹکا ہوا نظر آرہا ہے جس پر لکھا ہے (Khan's cement factory) ایک یتیم خانہ کھلوائیے (پس منظر میں ایک بورڈ بے سہارا اور لاوارث بچوں کے لئے ٹرسٹ)، ایک اچھا خاصا معیاری اسکول شروع کیجئے جس میں بے سہارا اور بے بس بچوں کو تعلیم مل سکے (پس منظر میں ایک بورڈ (Valley Educational Institute) میری باتوں سے یہ نہ اخذ کیجئے کہ میں آپ کو کچھ سکھانے یا کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، جانتا ہوں کہ آپ کا تجربہ بے حد وسیع ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ زندگی کا قافلہ کہیں نہ کہیں آ کے ٹھہر جاتا ہے، وقت کا دریا ہمیشہ ایک ہی رفتار سے نہیں بہتا...... یہ قانونِ قدرت بھی ہے، پاپا میں آپ کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ میری بات مان لیں...... آمنہ میری ذمہ داری ہے ہمیں اُسے اپنے طور سے grow ہونے کا موقعہ دینا چاہئے۔ ایک آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ دلاری آنٹی کہیں نہیں جائے گی وہ اپنی جگہ اپنے گھر میں ہمیشہ کی طرح رہے گی، آنٹی نے ہمیں ماں کا پیار بھی تو دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس پورے ماحول میں اُس کی حیثیت ایک پُل کی سی ہے، ایک ایسے پُل کی جو دو کناروں کو آپس میں ملاتا ہے، ایک کر دیتا ہے...... ہاں پاپا......

(پاپا کی آواز)

آپ کا بیٹا...... شکیل

(موسیقی اور فیڈ اوٹ)

............●●●............

افسانچے

ڈیوٹی

شہر خاص میں نئے افسر اعلیٰ کے آنے سے بالائی آمدنی کے قریب قریب سارے دروازے بند ہونے لگے، بالائی آمدنی حاصل کرنے والوں کی نیندیں اُڑ کر رہ گئیں اور وہ نئے دروازے تلاش کرنے لگے۔ جہاں چاہ ہے وہاں سوچ بھی ہے، اپنے پولیس سٹیشن کے انچارج غفور صاحب کے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا، دراصل اس سوچ میں چاہ پوشیدہ تھی۔ اُس نے ایک جیب کترے کو حوالات کی سلاخوں سے باہر نکال کر اپنی سوچوں کا حصہ بنایا۔ تجرباتی طور پر اُس نے جب کترے کو ایک دن کے لئے اس لئے رہا کیا کہ وہ دن بھر لوگوں کی جیبیں کاٹنے کے بعد ایک بار اپنے گھر والوں سے بھی مل سکتا ہے لیکن شام اُترنے سے پہلے ہی اُسے ہر حالت میں لوٹ کر آنا ہوگا...... دن بھر کی کمائی کے ساتھ۔ جیب کترہ طے شدہ پروگرام کے مطابق پولیس سٹیشن سے باہر آیا اور سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ گھومتے پھرتے اپنے شکار کی تلاش کرتا رہا۔ اب یہ شکار اُس کی نظروں میں آچکا تھا۔ وہ شخص بنک سے نکل کر میٹاڈار سے میں سوار ہوگیا۔ وہ بھی اُس کا ہم سفر بن گیا ور نہایت احتیاط لیکن اعتماد کے ساتھ اُس کی جیب سے پرس نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ دوسرے بس سٹاپ پر وہ میٹاڈار سے نیچے اُتر آیا، پرس کھول کر دیکھا اُس میں پورے دس ہزار روپے تھے۔ یہ رقم دیکھتے ہی اُسے اپنے گھر کا خیال آیا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر والے اُس کی بے وقت آمد سے حیران رہ گئے اُس نے خاموشی سے پانچ ہزار کی رقم اُن کے سپرد کردی اور شام اُترنے سے پہلے ہی پولیس سٹیشن میں حاضر ہوگیا۔ غفور صاحب نے مسکراتے ہوئے پانچ ہزار کی رقم جیب میں ڈال دی اور پرس کو ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ وہ بالائی آمدنی حاصل کرنے کی اپنی اسکیم پر بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک شخص پولیس

سٹیشن میں یہ شکایت درج کرنے کے لئے حاضر ہوا کہ اس کا پرس کسی جیب کترے نے اُڑا لیا اور اُس میں پورے دس ہزار روپے کی رقم تھی۔ غفور صاحب نے پہلے ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کیا۔ جب اُس شخص نے افسر اعلیٰ کے سامنے شکایت کرنے کا اپنا ارادہ ظاہر کیا تو غفور صاحب نے بے دلی سے ایف آئی آر درج کیا اور پورے معاملے کی سنجیدگی کے ساتھ جانچ پڑتال کرنے کا وعدہ بھی کیا، وہ شخص جب چلا گیا تو غفور صاحب اپنے جلال میں آ گئے اور جیب کترے کو بُلا کر اُس پر برس پڑے۔

''اتنی بڑی جعلسازی، اتنا بڑا دھوکہ...... میرے ساتھ...... دس ہزار میں سے پانچ ہزار کی رقم اڑا لی...... دیکھ اب میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔''

لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے لہجے میں نرمی آ گئی۔

''اب کی بار معاف کرتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا...... اب جا کر کھانا کھا لو اور سو جاؤ...... کل پھر تمہیں ڈیوٹی پر جانا ہوگا......!''

............●●● ....

انتظار

دیکھو نائلہ میں گھر سے باہر جارہا ہوں۔ دیر ہوسکتی ہے لوٹ کرآنے میں رات بھی لگ سکتی ہے، تم بالکل نہ گھبرانا...... دراصل ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے، دوستی نبھانے کا معاملہ ہے، میں اپنے ایک دوست کے ہاں جارہا ہوں، میرا وہ دوست محکمہ ایکسائز میں کام کرتا ہے، دوسرے درجے کا ملازم ہے لیکن ہے بڑا شاعر اور چالاک، ہر کام میں ماہر ہے۔ وہ مجھے افیم سے بھرا ایک پیکٹ دے رہا ہے، وہ پیکٹ میں اس کے افسر کے گھر چھوڑنے جارہا ہوں، کوئی بہانہ بنا کر میں اس کے گھر کے اندر چلا جاؤں گا تم تو جانتی ہو کہ بہانے بنانے مجھے بخوبی آتے ہیں...... سنو تو سہی، اس آفیسر نے میرے دوست کی ترقی روک رکھی ہے، کیونکہ اُنہیں میرے دوست کے خلاف کافی شکایتیں مل چکی ہیں جن کی وہ چھان بین کررہا ہے...... ہاں ہاں شکایات درست ہیں بڑا چاپلوس قسم کا آدمی ہے میرا دوست...... رشوت لئے بغیر کوئی کام نہیں کرتا...... میری بات تو سنو، آفیسر کے گھر افیم کا پیکٹ ڈالنے کے فوراً بعد میں تو چلا آؤں گا لیکن میرا دوست پولیس کی مدد سے وہ پیکٹ برآمد کر کے اُس آفیسر کو...... باقی کہنے کی ضرورت نہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، تم سمجھ گئی نا ارے ناسمجھ، آفیسر پکڑا جائے گا افیم رکھنے کے جرم میں...... ہاں چلتا ہوں اب...... تم بالکل نہ گھبرانا۔

ابھی وہ اپنے گھر سے دو قدم بھی نہ چلا تھا کہ ایک گلی سے چند سپاہی نمودار ہوئے۔ افیم کا کاروبار کرنے کے جرم میں مزید پوچھ تاچھ کے لئے پولیس سٹیشن لیا گیا...... ادھر اس کا شاطر اور چالاک دوست دوسری گلی سے نمودار ہوا، اپنے ایک ہاتھ میں گل دستہ اور دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھامے اس کے گھر میں داخل ہونے لگا جہاں نائلہ بے صبری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔!!!

.... ●●● ....

انعام

یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں!

اِس جانب لوگوں کا ایک بڑا ہجوم، لوگوں کا پُر زور احتجاج...... بے خوف آوازیں...... ''ہم کیا چاہتے ہیں، جینے کا حق!''

اُس جانب بھی ایک ہجوم، قطار در قطار وردی پوش، ہاتھوں میں بندوق تھامے......!!

اور اِن دونوں سے ذرا دور، ایک خاموش خاموش سے کمرے میں چند لوگ اپنے کام میں مصروف......کاغذات کا ایک انبار......انتظامی سہولیت کے پیشِ نظر مرنے والوں کے مرنے سے پہلے وارثوں کے لئے پیشگی چیک تیار کر رہے ہیں۔!!!

............●●● ....

تجربہ

وہ دونوں خوبصورت تھے بے حد خوبصورت اور ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اُن دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر محسوس ہوتا کہ ایک دوسرے کے بغیر اُن کا جینا مرنا شاید ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے۔ عالیہ کے گلابی گلابی، ملائم ملائم گال، کشمیری سیبوں کی مٹھاس سے بھرپور سُرخ سرخ ہونٹ، بڑی بڑی بادامی آنکھیں، کالی کالی زلفیں اور گورا گورا سڈول جسم اُس کی سندرتا میں اضافہ کرتے تھے، اختر علی بھی قد و قامت اور خدوخال سے مالا مال تھا۔ مضبوط توانا جسم، مخمور آنکھیں اور لمبے گھرے سنہرے بال اُس کی خوبصورتی کا ایک حصہ تھے۔ وہ ایک بڑے سرکاری عہدہ پر فائز تھا، رہنے کے لئے سرکاری گھر، گھومنے پھرنے کے لئے سرکاری کار، گھر اور

گھریلو کام کے لئے سرکاری نوکر، ہر شئے میسر تھی اُن کے لئے اُن کے گھر کے لئے۔ عالیہ خود بھی ایک پرڈوکشن کمپنی سے وابستہ تھی۔ اُن کی شادی ہوئے اب دس برس ہو چکے تھے اور اِن دس برسوں میں شاید ہی ایسا کوئی لمحہ گذرا ہوگا جب اُن دونوں کی محبت، اُن کی شفقت اور اُن کے پیار واعتماد کو کبھی کوئی ٹھیس لگی ہو لیکن اِس بے پناہ پیار ومحبت کی دنیا میں وہ کائنات کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت اولاد سے محروم تھے۔

''دیکھو اختر'' ایک شام عالیہ نے کہا۔ ''تم دوسری شادی کرلو، آخر کوئی تو چاہئے اتنی بڑی جائیداد کو سنبھالنے اور سمیٹنے کے لئے۔''

''میں دوسری شادی نہیں کرسکتا، ایسا ممکن بھی نہیں ہے'' اختر نے کہا

''ایسا کیوں ممکن نہیں، میں تمہیں اجازت دے رہی ہوں ......اور یقین کرو اختر میں اسی طرح تم سے پیار کرتی رہوں گی......''

''عالیہ میں اپنی کمزوری سے واقف ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میں بچہ پیدا نہیں کرسکتا ......لیکن میں کئی روز سے ایک اور بات سوچ رہا ہوں۔''

''کیا سوچ رہے ہو اختر۔''

''تم سے کہتے ہوئے ڈر سا لگ رہا ہے۔''

''ڈر کیوں اور کس بات سے۔''

''تم ......تم گھر کے کسی نوکر یا کسی دوست سے ......کسی کو پتہ نہیں چلے گا اور بدنامی بھی نہ ہوگی ؟!'' اور عالیہ من ہی من میں سوچنے لگی...... ''اب میں اختر کو کیسے بتاؤں کہ میں اس تجربے سے پہلے ہی گزر چکی ہوں!



فرض شناسی

منی آج بھی رو رہی تھی!

''دیکھو منی''۔ ماں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا...... ''تمہارے ابو جان اِن دِنوں بھونچال سے متاثر لوگوں کی دیکھ بھال کرنے میں مصروف ہیں، بہت سارے لوگ بے گھر ہو چکے ہیں، اُن کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے بہت سارے اِنتظام کرنے پڑتے ہیں تیرے ابو تو، ریلیف کمیٹی کے صدر ہیں، راحت کے کاموں سے اُنہیں فرصت تو ملنے دو...... اب سو جاؤ میری اچھی منی!''

منی نے روتی ہوئی نگاہوں سے اپنی ماں کی جانب دیکھا اور اپنے معصوم سے لہجے میں کہا۔ ''امی میں یہ نہیں مان سکتی...... کل تو ابو دو کنستر گھی اور ایک بوری آٹا لائے تھے اور آج وہ چھ نئے نئے کمبل لائے ہیں، لیکن میری گڈیا لانا بھول گئے۔!''

.... ●●● ....

پھر کیا ہے؟

''آپ بہت خوبصورت ہیں۔''

''جی شکریہ''

''آپ کو اپنوں، غیروں یا اجنبیوں سے ملنے جلنے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

''بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''رقص و موسیقی سے کوئی لگاؤ۔''

''جی ہاں کسی حد تک۔''

''شعر و شاعری......''

''عشق و محبت کے بہت سارے اشعار یاد ہیں۔''

''پینے پلانے میں کوئی دلچسپی۔''

''انکار نہیں کرتی۔''

''لینے دینے میں کوئی جھجک۔''

''وقت ہی فیصلہ کرے گا۔''

''تو پھر''

''پھر کیا''

''آج سے آپ ہماری کمپنی کی نئی پی آر او ہیں، یعنی پبلک ریلیشن آفیسر...... ہمارے کئی کام مختلف دفتروں میں مختلف لوگوں کے پاس اٹکے ہوئے ہیں، اب آپ کے آنے سے ہماری ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔!!!''

............●●● ....

تیرا میرا کیا رشتہ؟

سینٹرل کراسنگ سے ذرا دوری پر اُس کا سکوٹر موڑ کاٹتے ہوئے ایک اسکولی بس سے ٹکرا گیا ٹکر اتنی زبردست تھی کہ وہ سڑک پر بہت دور جا گرا۔ بس کا ڈرائیور رُکنے کی بجائے گاڑی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اِدھر سینٹرل کراسنگ پر اُس کی جانب توجہ دیئے بغیر ٹریفک معمول کی طرح بھاگتا رہا، البتہ چند راہ گیر رُک گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ سڑک پر پڑے شخص کے سر سے بے تحاشا خون بہہ رہا ہے۔ دفعتاً ایک آواز آئی ...... "ہاسپٹل ...... ہاسپٹل لے جانے سے شاید اس کی جان بچ سکتی ہے۔" وہ گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑی مشکل سے ایک کار ٹھیک اُن کے سامنے رُک گئی۔ کار کا مالک باہر آیا۔ ایک راہ گیر نے کار مالک سے لفٹ دینے کے لئے استدعا کی تا کہ زخمی شخص کو ہاسپٹل پہنچایا جاسکے۔ کار مالک نے خون سے لت پت نیم مردہ جسم پر ایک نظر ڈالی، پھر اپنی کار کی جانب دیکھا اور خاموشی سے اندر جا بیٹھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میری یہ کار بالکل نئی ہے، حال ہی میں خریدی ہے پورے چھ لاکھ میں ...... زخمی کے سر سے خون بہہ رہا ہے، میں اپنی کار کی سیٹوں کو اُس کے سر سے بہتے ہوئے خون سے رنگنا نہیں چاہتا......!!"

...........●●● ....

لمحوں کی زنجیر

یوں تو وہ خوبصورت تھی، سندر تھی اور جوان بھی لیکن اُس کی مقبولیت اور شہرت کا راز اُس کی آواز میں پوشیدہ تھا۔ اُس کی آواز اُس کے گائے ہوئے نغموں کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ وہ جب گاتی تھی تو محفل میں خاموشی طاری ہوجاتی، اُس کے دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر جب کسی بھی گیت کے بول اُس کے نرم و نازک لبوں پر مسکرانے لگتے تو سُننے والے ایک لذت بھری دُنیا میں گم ہوجاتے، ایک سُرور کی دُنیا میں کھو جاتے، اُس کی آواز میں پاکیزگی تھی، اُس کی اپنی زندگی بڑی پُرسکون تھی، سادگی اور شرافت سے لبریز تھی۔ کوئی بھی بُری عادت نہ تھی اُس میں......نہ تو سگریٹ پیتی تھی اور نہ ہی شراب...... پان یا زردہ سے ذرا بھر بھی دلچسپی نہ تھی، چائے تک بھی نہ پیتی تھی تا کہ اُس کا گلہ ان دیکھی کڑواہٹوں سے پاک و صاف رہے۔ اُس کی زندگی خوبیوں سے مالا مال تھی۔ اُس کی انمول صفت اُس کی آواز تھی اور اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ پُر درد اور پُر سوز بنانا اُس کی زندگی کی پہلی اور آخری تمنا تھی۔

آج صبح اخباروں میں اُس کی موت کی خبر سن کر لوگ حیران و پریشان ہوگئے۔ اُس کی آواز شیدائیوں کے لئے یہ خبر نا قابل یقین تھی۔ یہ ایک گلوکارہ کی نہیں، ایک آواز کی موت تھی...... ڈاکٹروں نے بتایا وہ گلے کے کینسر میں مبتلا تھی......!!!

..........●●● ....

کشمیر کہانی

''درد ہو رہا ہے؟ ڈاکٹر نے پوچھا

''نہیں تو''

''تو پھر خاموش کیوں ہو؟''

''سوچ رہا ہوں ڈاکٹر''

''کیا''

''ڈاکٹر سوچ رہا ہوں کہ انجکشن لگا کر آپ نے میرے جسم کے اس حصے کو بے حِس کر دیا ہے جہاں آپ سرجری کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

''ہاں ہاں''۔

''اِس سرجری کے بعد میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میرا زخم بھی بھر جائے گا میں چل پھر سکوں گا، بول سکوں گا، روٹی روزی کما سکوں گا......لیکن......؟!

''لیکن کیا؟''

''ان کا کیا ہوگا ڈاکٹر جن کے صحت مند جسم کی صحت مند آنکھیں پیلٹ کے مہلک اثرات سے بے نور ہو چکی ہیں۔ بینائی کھو چکی ہیں اور اب عمر بھر خون کے آنسو روتی رہیں گی......ہاں، ڈاکٹر آپ خاموش کیوں ہیں......کچھ بولئے نا......!!



گھر کی بات

گھر کے دروازے سے باہر قدر رکھتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ بٹوہ اس کی جیب میں نہیں ہے اور کل دِن بھر کی ساری بالائی کمائی بٹوے میں ہی رہ گئی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ صبح اپنی پولیس کی وردی پہنتے ہوئے وہ اپنا بٹوہ کل والی پتلون کی جیب سے نکالنا بھول گیا تھا۔ وہ دوبارہ گھر کے اندر لوٹ آیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کا نوٹوں سے بھرا بٹوہ اس کی بیوی مار چکی ہے اور وہ نئے نئے نوٹ گننے میں مصروف ہے۔

''خبردار اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔ میں چوری کے الزام میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔''

''یہ لیجیے۔'' بیوی نے ہنستے ہوئے سوسو کے پانچ نوٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا مجھے رشوت دے رہی ہو۔؟

''ہاں اور معاملہ رفع دفع کیجئے۔ رشوت لے کر معاملہ رفع دفع کرنا آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ تو روز کا معمول ہے۔ آپ ہی کی رشوت کی رقم سے سوسو کے پانچ نوٹ آپ کے......!''

''اور باقی رقم۔ اچھی خاصی رقم تھی بٹوے میں۔''

''باقی رقم میری...... چور کو بھی اس کا حق ملنا چاہئے......اور......ہم!''

''اور کیا۔''

''اور پھر یہ تو گھر کی بات ہے گھر کی بات باہر نہ جائے تو بہتر ہے۔؟!



دیگر منتخب تحریریں

پریم ناتھ پردیسی

ریاست جموں و کشمیر میں ایک نئے مباحثے کا آغاز ہوا ہے...... ریاست جموں و کشمیر میں اُردو کا پہلا افسانہ نگار کون؟ پریم ناتھ پردیسی یا کوئی اور؟ مجھے یقین ہے کہ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے قلم کار اس تعلق سے ضرور اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ فی الحال ہمارے آج کے افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی ہی ہیں۔

1924ء میں جب جموں سے لالہ ملک راج صراف نے اخبار رنبیر کی اشاعت شروع کی تو ریاست کے قلم کاروں کو اپنی علمی اور ادبی صلاحیتیں اُبھارنے کا ایک موقع ملا۔ ان قلم کاروں میں پریم ناتھ سادھو رونق بحیثیت شاعر سرفہرست تھے، رونق کے نام سے اُن کی شعری تخلیقات شائع ہوتی رہیں لیکن بعد میں انہوں نے نثر کی جانب توجہ دی اور پریم ناتھ پردیسی کے نام سے کہانیاں لکھنے لگے۔ پردیسی کے افسانوں کی اہمیت اور انفرادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے افسانے تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد بھی مشہور و معروف اور معیاری جرائد میں شائع ہوئے اور پسند بھی کیے گئے۔ جب ان کی کہانی ''ٹیکہ ٹبّی'' ماہنامہ ہمایوں (لاہور) کے سالگرہ نمبر (جنوری 1946ء) میں شائع ہوئی تو اسے بہترین کہانی قرار دیا گیا۔ پردیسی صاحب کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور یہ ہیں...... شام وسحر، دنیا ہماری،

بجھتے چراغ۔ پردیسی صاحب نے بچوں کے لئے جو کتابیں تحریر کیں اُن میں چورنگی، چار بیٹے، جان باز بچے، کرنیں اور پوتی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے کئی شاہکار ڈرامے بھی لکھے۔ وہ کئی اخباروں سے بھی منسلک رہے اُن میں ''ہمدرد'' اور ''وتستا'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور کلچرل فرنٹ کے ایک سرگرم کارکن رہے اور کشمیر پیپلز تھیٹر کے ساتھ بھی کافی عرصہ وابستہ رہے۔

پریم ناتھ پردیسی سرینگر کے سادھو خاندان 1909ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ کسٹمز کے ساتھ 1947ء تک منسلک رہے اور پھر جب ریڈیو کشمیر کی تشکیل عمل میں آئی تو وہ ریڈیو کشمیر میں ملازم ہوگئے۔ 1955ء تک ریڈیو میں کام کرتے رہے اور کئی نئے پروگراموں کا آغاز کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ 9/جنوری 1955ء کو ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔

پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی صحیح معنوں میں کی ہے اور کشمیر کی زندگی، تہذیب وتمدن اور معاشرے کو اصلی رنگ وروپ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے اکثر موضوعات کشمیر اور کشمیریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ زندگی کا مشاہدہ ایک انسان کی طرح کرتے ہیں۔

افسانہ: کیچڑ کا دیوتا

پریم ناتھ پردیسی نے یہ کہانی مئی 1946ء میں قلم بند کی تھی اور ماہنامہ ساقی میں شائع ہوئی تھی۔ پردیسی خود اس کہانی کا ایک کردار ہیں بلکہ وہ یہ ساری کہانی خود ہی سناتے ہیں۔ سفرو، ممسو اور کاہنا اس کے تین اہم کردار ہیں جو جموں کی ایک فیکٹری میں مزدوری کا کام کرتے ہیں اور فیکٹری کے احاطہ میں ہی بال بچوں سمیت رہتے ہیں۔ ممسو کو سرراہ شراب پیتے دیکھا جاتا ہے، شراب پیتے سمے ممسو اپنے منیجر کو ایک کمینی عورت کے ساتھ پکوڑے کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ بات مالک تک جا پہنچتی ہے اور وہ ممسو کو بلا کر اس کی خوب پٹائی کرتا ہے، ممسو کے منہ سے خون

اُگلنے لگتا ہے، ھمسو کی بیوی اور بچے آتے ہیں، وہ منت سماجت کر کے ممسو کو چھڑا کر لے جاتے ہیں
۔ پھر وہ تینوں دوست اپنے مالک کے بارے میں باتیں کرنے لگتے ہیں اور ھمسو کی بیوی نندی
سے کہتے ہیں کہ ان کے بڑے صاحب صرف باتیں کرنے کے لئے تین ہزار کماتے ہیں اور
مزے کرتے ہیں ہم لوگ کماتے ہیں اور اُڑاتے ہیں۔ بڑے صاحب جیسے لوگ شہد کی مکھیوں کی
طرح ساری عمر جوڑتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ ایسی باتیں سن سن کر نندی کو لگتا ہے کہ وہ ایک
ملکہ ہے، کیچڑ کے دیوتا کی میلی اور پھولی ہوئی ملکہ ممسو اپنی بیوی سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ پئے گا
ضرور لیکن فیکٹری کے پھاٹک سے باہر نہیں ...... اندر ...... پھاٹک کے باہر بہت بڑی دنیا ہے،
بہت بڑے لوگ ہیں...... شام ہوتے ہی فیکٹری کے مالک اور منیجر اُن دعوتوں میں شرکت
کرنے کے لئے پھاٹک سے باہر آتے ہیں جہاں کھانے پینے کے علاوہ راگ رنگ کا بھی
انتظام ہوتا ہے......!!

افسانے کے ایک سین کا ڈرامائی انداز:

فیکٹری......

منیجر کا دفتر......اس کے سامنے ممسو کھڑا ہے۔ کمرے میں فیکٹری کا مالک داخل ہوتا ہے۔

مالک: کل رات نو بجے تو کہاں تھا؟

ممسو: (ڈرتے ہوئے) پکہ ڈنگہ گیا تھا

مالک: وہاں پکوڑے کھا رہا تھا؟

ممسو: جی

مالک: اور مالن سے ٹھٹھا بھی کر رہا تھا...... خاموش کیوں ہو۔ تم نے شراب بھی پی تھی۔ ممسو
خاموشی اختیار کرتا ہے اور مالک اس کے منہ پر طمانچے اور مکے مارنے لگتا ہے اور پھر لاٹھی
برسانے لگتا ہے۔

مالک: بول حرام زادے تو نے شراب پی لی تھی۔

اتنے میں ایک عورت نندی جو ممسو کی بیوی ہے اور جس کا پیٹ پھولا ہوا ہے جیسے موٹے

بجھتے چراغ۔ پردیسی صاحب نے بچوں کے لئے جو کتابیں تحریر کیں اُن میں چورنگی، چار بیٹے، جان باز بچے، کرنیں اور پوتی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے کئی شاہکار ڈرامے بھی لکھے۔ وہ کئی اخباروں سے بھی منسلک رہے اُن میں ''ہمدرد'' اور ''وتستا'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور کلچرل فرنٹ کے ایک سرگرم کارکن رہے اور کشمیر پیپلز تھیٹر کے ساتھ بھی کافی عرصہ وابستہ رہے۔

پریم ناتھ پردیسی سرینگر کے سادھو خاندان 1909ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ کسٹمز کے ساتھ 1947ء تک منسلک رہے اور پھر جب ریڈیو کشمیر کی تشکیل عمل میں آئی تو وہ ریڈیو کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ 1955ء تک ریڈیو میں کام کرتے رہے اور کئی نئے پروگراموں کا آغاز کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ 9/جنوری 1955ء کو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی صحیح معنوں میں کی ہے اور کشمیر کی زندگی، تہذیب وتمدن اور معاشرے کو اصلی رنگ وروپ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے اکثر موضوعات کشمیر اور کشمیریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ زندگی کا مشاہدہ ایک انسان کی طرح کرتے ہیں۔

افسانہ: کیچڑ کا دیوتا

پریم ناتھ پردیسی نے یہ کہانی مئی 1946ء میں قلم بند کی تھی اور ماہنامہ ساقی میں شائع ہوئی تھی۔ پردیسی خود اس کہانی کا ایک کردار ہیں بلکہ وہ یہ ساری کہانی خود ہی سناتے ہیں۔ سفرو، ممسو اور کاہنا اس کے تین اہم کردار ہیں جو جموں کی ایک فیکٹری میں مزدوری کا کام کرتے ہیں اور فیکٹری کے احاطہ میں ہی بال بچوں سمیت رہتے ہیں۔ ممسو کو سرراہ شراب پیتے دیکھا جاتا ہے، شراب پیتے سمے ممسو اپنے منیجر کو ایک کمینی عورت کے ساتھ پکوڑے کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ بات مالک تک جا پہنچتی ہے اور وہ ممسو کو بلا کر اس کی خوب پٹائی کرتا ہے، ممسو کے منہ سے خون

اُگلنے لگتا ہے، ھمسو کی بیوی اور بچے آتے ہیں، وہ منت سماجت کر کے ممسو کو چھڑا کر لے جاتے ہیں
۔ پھر وہ تینوں دوست اپنے مالک کے بارے میں باتیں کرنے لگتے ہیں اور ھمسو کی بیوی نندی
سے کہتے ہیں کہ ان کے بڑے صاحب صرف باتیں کرنے کے لئے تین ہزار کماتے ہیں اور
مزے کرتے ہیں ہم لوگ کماتے ہیں اور اُڑاتے ہیں۔ بڑے صاحب جیسے لوگ شہد کی مکھیوں کی
طرح ساری عمر جوڑتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ ایسی باتین سن سن کر نندی کو لگتا ہے کہ وہ ایک
ملکہ ہے، کیچڑ کے دیوتا کی میلی اور پھولی ہوئی ملکہ ممسو اپنی بیوی سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ پیئے گا
ضرور لیکن فیکٹری کے پھاٹک سے باہر نہیں ......اندر...... پھاٹک کے باہر بہت بڑی دنیا ہے،
بہت بڑے لوگ ہیں......شام ہوتے ہی فیکٹری کے مالک اور منیجر اُن دعوتوں میں شرکت
کرنے کے لئے پھاٹک سے باہر آتے ہیں جہاں کھانے پینے کے علاوہ راگ رنگ کا بھی
انتظام ہوتا ہے......!!

افسانے کے ایک سین کا ڈرامائی انداز:

فیکٹری......

منیجر کا دفتر......اس کے سامنے ممسو کھڑا ہے۔ کمرے میں فیکٹری کا مالک داخل ہوتا ہے۔

مالک: کل رات نو بجے تو کہاں تھا؟

ممسو: (ڈرتے ہوئے) پکہ ڈنگہ گیا تھا

مالک: وہاں پکوڑے کھا رہا تھا؟

ممسو: جی

مالک: اور مالن سے ٹھٹھا بھی کر رہا تھا......خاموش کیوں ہو۔ تم نے شراب بھی پی تھی۔ ممسو
خاموشی اختیار کرتا ہے اور مالک اس کے منہ پر طمانچے اور مکے مارنے لگتا ہے اور پھر لاٹھی
برسانے لگتا ہے۔

مالک: بول حرام زادے تو نے شراب پی لی تھی۔

اتنے میں ایک عورت نندی جو ممسو کی بیوی ہے اور جس کا پیٹ پھولا ہوا ہے جیسے موٹے

کھدر کا تنگ کُرتا مشکل سے چھپا سکا تھا بچوں سمیت نمودار ہوتی ہے۔

نندی: اب دیا کرو بابو جی...... بھگوان سوگندھ اب نہیں پڑے گا۔

ممسو، سفر واور کاہنا نندی کے سامنے بیٹھے ہیں۔

ممسو: کل بڑے دنوں بعد پی تھی کل ہی دنگا ہو گیا......

کاہنا: پھر بھی بڑے صاحب نے......

سفرو: (بات کاٹتے ہوئے)...... بڑے صاحب نے تو خوب پٹائی کی

نندی: بڑا صاحب...... رام قسم وہ خود پیتا ہے اور مزے کرتا ہے...... یقین نہ ہو تو جا کر پوچھو...... اس کے گھر میں کام کرنے والی سے......"

پردیسی کے افسانوں میں رنگا رنگ کردار ملتے ہیں۔ ایک باشعور اور ذہین فنکار کی طرح وہ اپنے کرداروں کے ذریعے کشمیر کی حقیقی تصویر کو پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں......!!!

(ماخوذ۔ جموں و کشمیر کے اُردو افسانہ نگار)

...........●●● ....

یہ شام بھی کہاں ہوئی۔ عمر مجید

عمر مجید 1940ء میں شہر سرینگر کے علاقہ سونہ وار میں پیدا ہوئے، آپ کے والدِ محترم بسکو اسکول میں بحیثیت استاد تعینات تھے۔ عمر مجید نے ابتدائی تعلیم بسکو اسکول میں حاصل کی اور پھر بی اے کرنے کے بعد والد محترم کے کہنے پر اسی اسکول میں بحیثیت مدرس تعینات ہوئے۔ عمر مجید کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد 23/دسمبر 2008ء کو انتقال کر گئے۔ عمر مجید کی ادبی یا صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ آفتاب سے ہوا جہاں وہ زندگی کی آخری سانس تک ایک کالم نویس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بسکو اسکول سے بحیثیت ہیڈ ماسٹر سبکدوش ہونے کے بعد اُن کا زیادہ وقت دفتر اخبار آفتاب میں ہی گزرتا تھا...... آفتاب میں اُن کے تحریر کردہ کالم ''خیال اپنا اپنا'' کافی مقبول ہوا۔ وہ آفتاب کے لئے ادب نامہ بھی ترتیب دیتے تھے۔ وہ آفتاب کے لئے کشمیر نامہ بھی لکھتے رہے۔ کشمیر نامہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انہیں کشمیر کی تاریخ سے بے حد دلچسپی تھی۔

عمر مجید کا پہلا افسانہ ''ایک بوڑھا ولر کے کنارے'' 1965ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے ان گنت افسانے قلم بند کئے جو اُن کی وفات تک کشمیر اور بیرون کشمیر سے شائع ہونے والے جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے بھی چند ڈرامے لکھے، ایک ٹی وی سیریل بھی لکھا۔ ''اُجالوں کے گھاؤ'' اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا جو 1967ء میں شائع ہوا۔ ''یہ بستی یہ لوگ'' اور ''درد کا دریا'' کے عنوان سے اُن کے دو ناول شائع

ہوئے، یہ دونوں ناول بالترتیب 1970ء اور 1976ء میں شائع ہوئے......ان کی وفات کے بعد اُن کے افسانوں کا انتخاب ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' کے عنوان سے 2009ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ریاست کے جواں سال قلمکار سلیم سالکؔ نے ترتیب دیا اور اسے میزان پبلی کیشنز نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔

زندگی کی بے شمار تلخیوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی عمر مجید نے امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عمر مجید اپنے افسانوں میں انسانیت کی پاکیزہ روح کے متلاشی نظر آتے ہیں لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ عمر مجید بھی ریاست جموں وکشمیر کے اُن افسانہ نگاروں کے صف میں شامل ہیں جن کی جانب ہمارے ناقدین نے بہت کم توجہ دی۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم مصلحت پسند نہیں تھے، کسی کی بیجا تعریف کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ ایک معتبر استاد تھے اور بنیادی طور پر بے حد شریف تھے، یہ شرافت اُن کے لہجے کی ایک بڑی صفت تھی، اُن کے عادات بھی سادہ تھے، یہ سادگی اُن کی طبیعت میں رچی بسی تھی ......کشمیر کے موجودہ پرآشوب حالات کے پس منظر میں اُنہوں نے کئی افسانے لکھے اُن میں ''گمشدہ جنت'' شہر کا اغوا'' اور ''میری گلی کا غم'' قابل ذکر ہیں۔

عمر مجید اردو اکادمی جموں وکشمیر کے بنیادی رکن تھے۔ اکادمی کا آئین مرتب کرنے میں انہوں نے ایک اہم کام انجام دیا۔

کہانی: یہ شام بھی کہاں ہوئی

یہ بمبئی سے کشمیر آنے والے ایک اوباش سیاح کی کہانی ہے جو کشمیر میں اپنی عیاشی کے ذرائع تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہ کشمیر سے بمبئی جانے والے سلیم کی بھی کہانی ہے ایک طرف یہ شام بھی کہاں ہوئی بمبئی کے بازاروں میں بکنے والے جسموں کی کہانی ہے دوسری جانب کشمیر میں پرانے بوسیدہ پھرن میں اپنے جسموں کو چھپانے والی عورتوں کی بھی کہانی ہے......

کہانی کے ایک حصے کا ڈرامائی انداز:

چنار کے ایک درخت کے سائے میں ایک آدمی کھڑا ہے جس کے چہرے پر ایک کمینی

مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے۔ وہ اپنی حریص نظروں سے اُن عورتوں کو دیکھ رہا ہے جو قریب کے کھیتوں میں کھیتی باڑی میں مصروف ہیں۔ ان میں سلیم کی ماں بھی ہے۔ وہ آدمی پچاس روپے کا نوٹ سلیم کی جانب بڑھاتا ہے۔

سیاح: میں بمبئی کا رہنے والا ہوں اور تمہارے کشمیر گھومنے آیا ہوں۔ جاؤ اور یہ نوٹ اس عورت کو دے دو جس نے نیلا پھرن پہن رکھا ہے۔

لڑکا: وہ تو میری ماں ہے۔

سیاح: یہ تو اور بھی اچھی بات ہے دیکھ تمہاری ماں کا پھرن کتنا پرانا اور بوسیدہ ہے ان روپیوں سے وہ ایک نیا پھرن بنوا سکتی ہے۔

لڑکا نوٹ نہیں لیتا ہے اور کھیت میں جاکر اپنی ماں کو ساری بات سناتا ہے۔ اس دوران لڑکے کا باپ بھی آجاتا ہے...... وہ بھاگتا ہوا سیاح کی جانب آتا ہے اور اس کا گریباں پکڑ کر غصے میں چلاتا ہے:

مرد: لفنگے بدمعاش کمینے ...... اس بچے کی ماں کے پاس صرف ایک ہی پھرن ہے جو گندا ہے اور پرانا بھی...... لیکن اس پھرن کے نیچے اُس نے عزت اور غیرت کا ایک ایسا پھرن پہن رکھا ہے جو بہت قیمتی ہے۔

سیاح تیز تیز قدموں سے بھاگنے لگتا ہے۔

لڑکا: بابا۔

مرد: اب کیا ہے؟

لڑکا: (معصومیت کے ساتھ) بابا وہ پیسے دے رہا تھا ماں کے نئے پھرن کے لئے اور تم نے اُسے بھگا دیا۔

مرد: بیٹا ہم لوگ شریف ہیں۔

لڑکا: بابا یہ شریف کیا ہوتا ہے؟

مرد: شریف ...... شریف آدمی ہوتا ہے جیسے میں ...... تم ...... اپنے گاؤں کے دوسرے

لوگ......!

لڑکا: اور وہ...... کیا وہ شریف نہیں تھا۔

مرد: نہیں وہ معاش تھا۔

لڑکا: اور یہ بدمعاش کیا ہوتا ہے بابا۔

مرد: (آہستہ سے) تم ابھی چھوٹے ہو، معصوم ہو...... بڑے ہوکر خود سمجھ جاؤ گے۔"

شریف آدمی کون ہوتا ہے اور بدمعاش کون......؟

عمر مجید کی وفات سے اُردو اکادمی جموں وکشمیر میں ایک خلا پیدا ہوا ہے۔ اُن کی یاد میں اُردو اکادمی عزت واحترام کے ساتھ انہیں ان کے یوم وفات پر یاد کرتی ہے۔

.... ●●● ....

(ماخوذ...... جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار)

نادم یُگ ۔ دینا ناتھ نادم

میں افسانوں کی دنیا میں نیا نیا آیا تھا اور شاید ایک دو ہی افسانے شائع ہوئے تھے کہ دینا ناتھ نادم سے اُن کے گھر میں ملنے کا موقع ملا، اُن دنوں وہ ایک سرکاری کوارٹر میں قیام پذیر تھے، میری ملاقات کے وقت وہاں غلام رسول سنتوش اور مہیندر رینہ بھی موجود تھے اور بھی دو تین لوگ تھے جن کے چہرے میرے ذہن سے اُتر چکے ہیں، سنتوش نے میرا تعارف کرایا اور نادم صاحب نے ہنستے ہوئے کہا...... ''سرینگر میں آپ کہاں رہتے ہیں، مکان کیسا ہے، بناوٹ نئی یا پرانی طرز کی ہے، کیا آپ اپنے مکان کی کھڑکی سے شنکر آچاریہ کا مندر دیکھ سکتے ہیں، ڈل جھیل آپ کی بستی سے کتنی دوری پر ہے، محلے میں کیسا ماحول ہے، لوگ کیسے ہیں......'' میں ایک ایک بات کا جواب دیتا رہا لیکن سوچ بھی رہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ پوچھنے کا مقصد کیا ہے، کیونکہ عمر میں، میں اُن سب سے چھوٹا تھا اور ادبی حلقوں میں جان پہچان بھی نہ تھی اس لئے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا لیکن مہندر رینہ نے یہ سب جاننے کی وجہ پوچھ ہی ڈالی، نادم صاحب نے سنجیدہ ہو کر کہا:

''حال ہی میں ان کا ایک افسانہ نظر سے گزرا، میگزین کا نام تخلیق تھا، کوئی صاحب ملنے آئے تھے، جاتے سمے وہ اپنا رسالہ لینا بھول گئے، سرینگر کا ایڈریس دیکھ کر افسانہ پڑھنے کا اشتیاق بڑھا، یہ افسانہ پڑھ کر مجھے لگا جیسے افسانہ نگار اپنے ماحول اور اپنے آس پاس سے مطمئن نہیں ایک تشنگی کا احساس اُبھرتا ہے، اس لئے اپنی جان کاری کے لئے یہ سب کچھ پوچھ ڈالا''۔

نادم صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

بعد بہت بار اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان کو مشاعروں میں سنا، ان کے ساتھ بہت ہی محفلوں میں شرکت کی، کئی بار ہندوہائی سکول جا کر اُن سے ملا، جب وہ ڈائریکٹر آڈلٹ ایجوکیشن تھے تب ہی ملتا رہا، کبھی اکیلے اور کبھی اُن کے چاہنے والوں کے ساتھ۔ البتہ جتنی دیر وہ قانون ساز کونسل کے ممبر رہے، اُن سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا، وہ بے حد مصروف رہتے تھے۔

میں نے پہلے بار ایس پی کالج کے کھلے میدان میں منعقد ایک مشاعرے کے دوران اُن کا کلام سنا، کوئی آزاد نظم سنا رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے زور زور سے بادل گرج رہے ہوں، اُن کی گرجدار آواز کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا ہر طرف خاموشی تھی، یہاں تک کہ شمیم احمد شمیم جو مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے، بھی خلاف معمول خاموش تھے۔ اُن کے شعر سنانے کا انداز واقعی جداگانہ تھا، مختلف تھا، ایسا لگتا تھا جیسے الفاظ کا ایک دریا ہے جو آہستہ آہستہ سبک روی کے ساتھ بہتا چلا آرہا ہے۔ نادم صاحب نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک نئے رجحان کی بنیاد ڈالی، ایک نئے ڈکشن کو جنم دیا، نئے اور سنجیدہ موضوعات کو اپنی شاعری میں اُبھارا، نئ ہیئتیں وجود میں لائیں، آزاد نظم، بلیک ورس، سانٹ اور اوپیرا کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترجمانی کی۔ نادم صاحب کو زندگی کے جن تجربات سے گزرنا پڑا وہ تجربات اور مشاہدات اُن کی شاعری کا ایک حصہ بنے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اُن کی شاعری اُن کی ذات تک ہی محدود نہ رہی بلکہ آج بھی ہمارے سماج، ہماری سوسائٹی، ہمارے رہن سہن اور ہماری تہذیب وتمدن کا ایک حصہ نظر آتی ہے اور بقول سوم ناتھ زتشی:

"نادم صاحب کی ہر کوئی تخلیق، بجائے خود ایک اکائی ہے، جمالیات اور پیکر تراشی کا خوبصورت اظہار ہے۔"

نادم صاحب کا لکھا ہوا اوپیرا "بانبر ویمبر زل" بہت مقبول ہوا اور اس کی مقبولیت آج بھی قائم ودائم ہے، یہ اوپیرا روسی زبان میں بھی ترجمہ ہوا اور سویت یونین میں سٹیج بھی کیا گیا۔ ان کے شعری مجموعہ "شہلی کُل" پر ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی ملا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نادم صاحب نے چارسو

سے زائد نظمیں ، غزلیں ، سانیٹ اور ہائیکو وغیرہ تخلیق کئے۔ ان کے شعری تخلیقات آفاقی موضوعات سے جڑی ہوئی ہیں، اُن میں گہرائی ہے اور ٹھہراؤ بھی، ان کے ہاں ذخیرہ والفاظ کا ایک وسیع سمندر ہے، اُن کی نثری تخلیقات میں ان کے تحریر کردہ افسانے جوابی کارڈ اور شینہ پیتو پیتو قابل ذکر ہیں۔

نادم صاحب خیالات میں ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے غلام محمد صادق کے بہت زیادہ قریب رہے۔ وہ بخشی غلام محمد اور ڈی پی در کے بھی قریب رہے۔ غلام رسول سنتوش، اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، مہندر رینہ، علی محمد لون، پی این پشپ، پران کشور، رحمٰن راہی، پی این کاچرو، شمیم احمد شمیم اور موتی لال ساقی اُن کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔

نادم صاحب 18 / مارچ 1916ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے پتا جی پنڈت شنکر کول 23 / مئی 1922ء کو مر گئے، اُس وقت نادم صاحب کی عمر صرف چھ برس تھی۔ اس لئے نادم صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں اُن کی ماں کا بڑا حصہ رہا، وہ پہلے انگریزی، ہندی اور اُردو میں لکھتے رہے لیکن 1946ء، میں اپنی مادری زبان کشمیری کو ہمیشہ کے لئے اپنالیا۔!!!

اپنی ایک نظم ''مے چھم آش پگہ'' (مجھ آشا ہے کل کی) کے بارے میں نادم صاحب کے خیالات:

''یہ نظم مجھے سب سے زیادہ پیاری ہے، اس نظم کا موضوع عالم گیر امن پسندی اور انسان دوستی، اپنے وطن کی حسین وادیوں، مترنم جھرنوں اور محنت کش عوام کی دلگیر مسکراہٹوں، اپنے ماضی کی شاندار، کلچر روایت اور اپنے یہاں کے تصوف خود شناس لٹریچر اور معصوم لوک گیتوں اور لوک سنگیت سے پا چکا ہوں۔ اس لئے امن پسندی اور انسان دوستی اپنی شاعری میں کوئی جدت تصور نہیں کرتا بلکہ اپنی میراث کا اعادہ لیتا ہوں، زندگی کے متعلق میرا ایک بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ یہ دب کر بھی شکست نہیں کھاتی، پیچھے نہیں ہٹتی۔ ہر گام پر بڑھتی جاتی ہے اور بالآخر فتح یاب ہوتی ہے، زندگی کی بے باکی یہ آگ بڑھ کر فاتح بننے کی جدوجہد ہی اس کا سب سے بڑا حسن ہے جو ایک شاعر کے جمالیاتی ذوق کو اُکساتا ہے، رات کی مہیب ترین تاریکی بھی صبح کی امید پر مسکراتی ہے

وہ صبح جبکہ تمام تاریکی کافور ہو جائے گی۔ تمام آلام دور ہو جائیں گے اور تشنہ لب ارمانوں کی پیاس بجھ جائیگی، اس صبح کی امید سے میں بچپن سے واقف ہوں اس کے حسین خدوخال سب میرے جانے پہچانے ہیں، میں نے اس کو کشمیر کے کھیتوں میں دیکھا ہے دریا کے کنارے ہانجیوں کے پژمردہ چہروں پر دیکھا ہے......!!"

نادم صاحب اب اس دنیا میں نہیں لیکن "نادم یگ" اب بھی زندہ ہے......!!!

(ماخوذ۔ کہاں گئے وہ لوگ)

..........●●● ....

ایک خانہ بدوش کی کہانی۔ دیوندر ستیارتھی

مجھے دیوندر ستیارتھی سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ دو ایک بار دلی کے کافی ہاؤس میں اپنے زمانے کے معروف کہانی کار بلراج مینرا اور سریندر پرکاش کے ساتھ اور پھر جموں میں، وہ اکثر جموں آتے رہتے تھے اور مرحوم نذیر حسین سمنانی کے مہمان کی حیثیت سے اُن کے اخبار ''سندیش'' کے گیسٹ روم میں ٹھہرتے تھے۔ یہ گیسٹ روم ان کے اخبار کے دفتر کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں موہن یاور بھی ''سندیش'' سے وابستہ تھے اور ماہنامہ ''سنگم'' ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ستیارتھی جی موہن یاور کے کافی نزدیک تھے۔ جموں میں ستیارتھی جی ''کشمیر ٹائمز'' کے مدیر اعلیٰ وید بھسین جی کے ساتھ بھی نظر آتے تھے۔ ہندی کے مشہور کوی چندر کانت جوشی بھی ان کے دوستوں میں سے تھے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ان دنوں میں نے ایک کہانی ''علیا اور بلبل''، لکھی تھی اور کسی محفل میں پڑھی تھی ستیارتھی جی اس محفل میں موجود تھے۔ میری کہانی انہوں نے پسند کی تھی اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا۔

دیوندر ستیارتھی خانہ بدوش ادیب کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے۔ لوک گیتوں کی تلاش میں وہ واقعی خانہ بدوش بن چکے تھے۔ بستی بستی، شہر شہر گھوم کر انہوں نے ہزاروں لوک گیت اکٹھا کئے تھے۔ لوک گیتوں کی تلاش میں وہ اپنے شہر سے قریب قریب بیس برس دور رہے۔ انہوں نے کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک کا سفر کیا اور اپنے عوام کے سامنے ایک ایسا اثاثہ رکھا جس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جاسکتی۔ یہ لوک گیت ہندوستان اور پاکستان کی تہذیب کی منہ بولتی تصویریں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد تین لاکھ کے قرب ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ انہوں نے ان لوک گیتوں پر مضامین بھی لکھے۔

دیوندر ستیارتھی کا اصل نام دیواندر تھا۔ وہ 26رمئی 1908ء کو پنجاب کے ضلع سنگرو میں پیدا ہوئے۔ 1925ء، میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ڈے اے وی کالج لاہور میں داخلہ لیا، وہاں قریب قریب دو سال پڑھنے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ پہلی کہانی پنجابی میں لکھی، پہلا مضمون لوک گیتوں سے متعلق تھا جو نومبر 1931ء میں اِلہ آباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''ہنس''، میں شائع ہوا۔ ان کی پہلی اُردو کہانی کا نام تھا ''اور بانسری بجتی رہی'' جو ادب لطیف لاہور میں شائع ہوئی۔ (دسمبر 1940ء)

تقسیم ملک کے بعد انہوں نے مستقل طور پر دلی میں رہائش اختیار کی۔ وہ 1948ء سے لے کر 1956ء تک ماہنامہ ''آج کل'' (ہندی) کے مدیر رہے۔

دلی کے قیام کے دوران ایک بار کسی سے کچھ کہے پاکستان چلے گئے اور وہاں چار ماہ ٹھہرنے کے بعد دلّی لوٹ آئے۔

12رفروری 2003ء کو ان کا دلی میں انتقال ہو گیا۔

اُن کو کہانیوں لکھنے کا اپنا ایک انداز تھا۔ ان کی کہانیوں میں لوک گیتوں کی سی کشش ہے، ان کہانیوں میں لوک گیتوں کی روح گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔ ستیارتھی جی کے بارے میں مرحوم ساحرلدھیانوی نے کہا تھا:

''کوئی بھی شاعر خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو ہندوستان کی روح کی پاکیزگی کو پیش کرنے میں ستیارتھی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

اور بقول امرتا پریتم:

''دیوندر ستیارتھی کی ہنسی غمگین ہوتی ہے اور غم کھلا ہوا مسکراتا سا ملتا ہے۔ ستیارتھی دنیا بھر کے لوک گیتوں کو اکٹھا کر کے خود ایک لوک گیت بن گیا ہے۔''

ان کی شائع شدہ تصانیف (اُردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی) کی تعداد 49 ہے۔ اس میں افسانے، ناول، لوک گیت، شاعری، ترجمے، خودنوشت، سفرنامے اور مضامین شامل ہیں۔ کتابوں کی تفصیل یوں ہے:

افسانے مجموعے......۱۴

ناول......۸

سفرنامے......۱

ترجمے......۳

لوک گیت......۱۰

شاعری......۵

خودنوشت......۲

مضامین......۶

ستیارتھی جی کی زندگی پر ہندوستان سے شائع ہونے والے مختلف جرائد میں گوشے شائع ہو چکے ہیں جن کو ادبی حلقوں میں سراہا گیا اور ان گوشوں کے ذریعہ ستیارتھی جی کی ذاتی اور ادبی زندگی کو سمجھنے اور پرکھنے کے مواقع میسر ہوئے۔

معروف ناقد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کہتے ہیں:

''دیوندر ستیارتھی کا پہلا عشق لوک گیت ہے اور دوسرا افسانہ، چنانچہ وہ اپنی زیادہ تر کہانیوں میں لوک گیتوں کا استعمال کرتے ہیں اور اس کے لئے افسانہ کی تکنیک میں بھی شکست وریخت سے نہیں چوکتے۔ان کے افسانوں میں پورا ہندوستان عوامی سطح پر لوک روایتوں کے درمیان ہنستا ،کھیلتا، روتا بلکتا، سوتا جاگتا، گاتا روتا، بھوکا اور پیٹ بھرا، پنگھٹ کی گوریوں، کھیت کی پگڈنڈیوں، شہر کی شاہراؤں، غریبوں کی بدمستیوں اور امیروں کی مدہوشیوں میں صاف نظر آتا ہے۔''

اور بقول دیوندر ستیارتھی:

''میرے نزدیک تخلیق تو دراصل زندگی کا قرض چکانا ہے، کبھی یک مشت، کبھی قسطوں میں ،کبھی سود کے ساتھ اور کبھی بے سود۔''

(ماخوذ۔کہاں گئے یہ لوگ)

............●●● ....

جنت سے نکالی ہوئی حوا......

''کاش جنت میں آدم کا دل بغیر حوا کے ہی بہل جاتا۔ اے حوا تو نے عالم وجود میں آ کر قیامت تک ہم عورتوں پر دکھوں کا پہاڑ توڑ دیا......'' یہ میں نہیں بلکہ محترمہ نفیس بانو شمع لکھتی ہیں، اپنی کتاب ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' میں یہ ایک آپ بیتی ہے۔ شمع صاحبہ دہلی میں رہتی ہیں، وہ شاعری کرتی ہیں لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا، ان کے افسانے اردو کے معیاری اور مقبول رسائل میں شائع ہوتے ہیں، ان کی کہانیاں عام موضوع سے ہٹ کر ہوتی ہیں، شاید زندگی نے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ افسانوں کی صورت میں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھتی ہیں!

ہم کبھی کبھار ایک دوسرے کو خط لکھتے ہیں، میں ان سے ذاتی طور بھی ملا ہوں لیکن بہت ہی مختصر وقفے کے لئے یہ آج سے کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے ان دنوں میرے برادرِ اصغر بشیر شاہ کا بیٹا عرفان شاہ جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور وہ شمع صاحبہ کے مکان کے بالکل قریب رہتا تھا میں جب بھی دلی چلا جاتا تو عرفان سے ملنے ضرور جاتا اور اس وجہ سے دو ایک بار ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ تو ان دنوں بھی خوب لکھ رہی تھیں اور مختلف رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہوتی تھیں لیکن میں سرکاری مصروفیات کی وجہ سے ادبی سرگرمیوں میں بہت کم حصہ لینے لگا تھا، لکھنے پڑھنے کے لئے بھی بہت کم وقت مل جاتا تھا جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ چند لمحوں کے لئے سوچنے لگ گئیں اور پھر کہنے لگیں۔ ''ہاں یاد آیا آپ کی کہانیاں ''بیسویں صدی''

اور ''شاعر'' میں پڑھ چکی ہوں لیکن ان دنوں آپ کا نام کسی رسالے میں نظر نہیں آتا''...... میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ ہم چھوٹے بڑے اُردو ادب کو پیشہ بنا ہی نہیں سکتے، روزگار کے لئے بہر طور الگ مواقعے تلاش کرنا پڑتے ہیں، اس لئے زندگی کی دوڑ میں ذات کے کئی حصے ہو جاتے ہیں اور شخصیت کئی خانوں میں بٹ جاتی ہے......'' لیکن میں یہ سب کچھ اُن سے کہہ نہ سکا!!

''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' جب مارکیٹ میں آئی تو اس پر خوب تبصرے ہوئے، یہ آپ بیتی بے حد پسند کی گئی۔ ہر ایک نے تعریف کی، سرینگر میں یہ کتاب دستیاب نہ ہوئی، میں نے دہلی کے پبلشر کو خط لکھا لیکن کتاب پھر بھی نہ ملی، میں نے شمع صاحبہ کو خط لکھا اُن کی آپ بیتی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چند دنوں کے بعد مجھے یہ کتاب مل گئی، ان الفاظ کے ساتھ...... ''ایک ادبی اور نہایت محترم شخصیت جناب نور شاہؔ کی خدمت میں نذرانہ خلوص'' نفیس بانو شمع، ۱۲ر جنوری ۲۰۰۲ء۔

یہ کتاب پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ یہ ہماری زندگی کا المیہ ہے، یہ ایک ایسے سماج کی تصویر ہے جہاں بظاہر جگمگاہٹ ہے لیکن جس کے باطن میں خود غرضیاں ہیں، بے وفائیاں ہیں، روایتی بندھنوں اور رسم و رواج کی آہنی زنجیریں ہیں، عورت کی بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ ساتھ اس عورت کی تصویر بھی ہے جو اپنے گھر کی چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی۔ اس میں ماں کی ممتا ہے، اپنے ہم وطنوں سے پیار کا اظہار ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شمع صاحبہ نے اپنی آپ بیتی میں عالمانہ لب و لہجہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ ہر ہر سطر میں اُن کی اندر کی آواز کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، اس آپ بیتی میں شمع صاحبہ نے اپنوں اور غیروں سے رشتوں کی ایک بے مثال کہانی کو سنوارا ہے!

کتابوں کا کیا ہے، کتابیں شائع ہوتی ہیں پڑھنے کے لئے، ذہنی پیاس بجھانے کے لئے ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' بھی ان ہی کتابوں میں سے ایک ہے تو پھر میں اپنی ڈائری کے آج کے ورق میں اس کتاب کا تذکرہ کیوں کر رہا ہوں؟ دراصل آپ بیتی کا دوسرا نام سچائی ہے اور سچائی کے اظہار کے لئے سچائی کو اپنانا ضروری ہے۔ نہ صرف ذہنی طور پر بلکہ یہ سچائی یا پاکیزگی

بول چال، آنکھوں کی روشنی اور قلم کی حرکت میں نظر آنی چاہئے۔ نفیس بانو شمع نے جہاں اپنی آپ بیتی میں پیار و محبت، نفرت و رقابت اور جنسی تعلقات کے بارے میں نہایت بے باکی سے اظہار کیا ہے وہیں انہوں نے اپنی فقیرانہ زندگی، روحانی قدروں اور پیر و مرشد سے اپنی عقیدت اور احترام کا بھی کھل کر اعتراف کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں مرد اور عورت کے جائز اور ناجائز رشتوں کا بھی ذکر ہے اور ایک عورت کی لاچارگی، بے بسی، بے حرمتی کے ساتھ ساتھ اس کے احتجاج کی آواز سنائی دیتی ہے!

اپنی ڈائری کا یہ ورق بند کرنے سے پہلے نفیس بانو شمع کی زبانی سارا شگفتہ کی بات بھی سن لیجئے ...... ''پاکستان میں ایک شاعرہ ہوتی ہے، سارہ شگفتہ جس نے اپنی مختصر سی زندگی میں اپنی شاعری سے دھوم مچادی۔ وہ ایک ایسا نصیب لے کر آئی تھی جس میں سُکھ کا کوئی لمحہ نہ تھا وہ جب تک زندہ رہی سلگتی رہی اور اپنے شعروں میں آگ اُگلتی رہی، جنسی بھیڑیئے اس کے جسم کو نوچتے رہے اور پھر خود ہی ایک دن اپنی زندگی کا خاتمہ کرڈالا۔ کئی برس پہلے جب وہ ہندوستان آئی تھی تو اس نے ایک ملاقات میں بتایا کہ میرے پاس ازار بند نام کی کوئی چیز نہیں، اس کے ایک جملے میں اس اذیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کی وہ تمام عمر شکار رہی، اس کی نظم ''میں ننگی چنگی'' جب بھی پڑھتی ہوں تو نہ صرف اس کی بلکہ پوری عورت ذات کی بے بسی اور بے چارگی تازیانے لگاتی محسوس ہوتی ہے...... سوچتی ہوں یہ روایت کب بدلے گی، خاتون قلمکاروں کے تئیں مرد ذات کا نظریہ کب ٹھیک ہوگا۔ آج لکھنے والی جو خواتین شہرت و مقبولیت کی بلندی پر ہیں اور اپنی حیثیت تسلیم کرواچکی ہیں، مرد حضرات ان کی عزت و تعظیم پر مجبور ہیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان ادبی حلقوں میں ایک ادیبہ کو بازاری شئے سمجھا جاتا ہے اور اس سبب ان کا ادبی استحصال بھی ہوتا ہے اس کے لئے ہم خود بھی ذمہ دار ہیں، ہم میں سے کچھ نہ تو شاعرہ ہوتی ہیں اور نہ ہی افسانہ نگار لیکن نام اور شہرت کی ہوس ہوتی ہے، وہ رسالوں میں چھپنا اور مشاعرے پڑھنا چاہتی ہیں، کچھ شاعرات تو ایسی ہیں جو ہندی رسم الخط میں غزلیں لکھ کر لاتی ہیں اور فخر سے پڑھتی ہیں، بعض معتبر شعرا اُن کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ پچھلے بیس پچیس برسوں میں کئی شاعرات مشاعروں کی دنیا میں

آئیں اور غائب ہوگئیں کیونکہ ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہ تھا، ایک طرف تو آدا جعفری، پروین شاکر اور کشور ناہید جیسی شاعرات ہیں جو اپنی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کروا چکی ہیں اور دوسری طرف یہ شاعرات ہیں جنہیں لوگ صرف ''تفریح کا سامان'' سمجھتے ہیں......''!

میں نے اپنی ڈائری میں محترمہ نفیس بانو شمع کے خیالات قلم بند تو کئے لیکن کیا آپ بھی ان کے خیالات سے متفق ہیں......ذرا سوچئے تو!!

(ماخوذ۔ بند کمرے کی کھڑکی سے)

............●●● ....

بول چال، آنکھوں کی روشنی اور قلم کی حرکت میں نظر آنی چاہئے۔ نفیس بانو شمع نے جہاں اپنی آپ بیتی میں پیار و محبت، نفرت و رقابت اور جنسی تعلقات کے بارے میں نہایت بے باکی سے اظہار کیا ہے وہیں انہوں نے اپنی فقیرانہ زندگی، روحانی قدروں اور پیر و مرشد سے اپنی عقیدت اور احترام کا بھی کھل کر اعتراف کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں مرد اور عورت کے جائز اور ناجائز رشتوں کا بھی ذکر ہے اور ایک عورت کی لاچارگی، بے بسی، بے حرمتی کے ساتھ ساتھ اس کے احتجاج کی آواز سنائی دیتی ہے!

اپنی ڈائری کا یہ ورق بند کرنے سے پہلے نفیس بانو شمع کی زبانی سارا شگفتہ کی بات بھی سن لیجئے ...... ''پاکستان میں ایک شاعرہ ہوتی ہے، سارہ شگفتہ جس نے اپنی مختصر سی زندگی میں اپنی شاعری سے دھوم مچادی۔ وہ ایک ایسا نصیب لے کر آئی تھی جس میں سُکھ کا کوئی لمحہ نہ تھا وہ جب تک زندہ رہی سلگتی رہی اور اپنے شعروں میں آگ اُگلتی رہی، جنسی بھیڑیئے اس کے جسم کو نوچتے رہے اور پھر خود ہی ایک دن اپنی زندگی کا خاتمہ کر ڈالا۔ کئی برس پہلے جب وہ ہندوستان آئی تھی تو اس نے ایک ملاقات میں بتایا کہ میرے پاس ازار بند نام کی کوئی چیز نہیں، اس کے ایک جملے میں اس اذیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کی وہ تمام عمر شکار رہی، اس کی نظم ''میں ننگی چنگی'' جب کبھی پڑھتی ہوں تو نہ صرف اس کی بلکہ پوری عورت ذات کی بے بسی اور بے چارگی تازیانے لگاتی محسوس ہوتی ہے...... سوچتی ہوں یہ روایت کب بدلے گی، خاتون قلمکاروں کے تئیں مرد ذات کا نظریہ کب ٹھیک ہوگا۔ آج لکھنے والی جو خواتین شہرت و مقبولیت کی بلندی پر ہیں اور اپنی حیثیت تسلیم کروا چکی ہیں، مرد حضرات ان کی عزت و تعظیم پر مجبور ہیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان ادبی حلقوں میں ایک ادیبہ کو بازاری شئے سمجھا جاتا ہے اور اس سبب ان کا ادبی استحصال بھی ہوتا ہے اس کے لئے ہم خود بھی ذمہ دار ہیں، ہم میں سے کچھ نہ تو شاعرہ ہوتی ہیں اور نہ ہی افسانہ نگار لیکن نام اور شہرت کی ہوس ہوتی ہے، وہ رسالوں میں چھپنا اور مشاعرے پڑھنا چاہتی ہیں، کچھ شاعرات تو ایسی ہیں جو ہندی رسم الخط میں غزلیں لکھ کر لاتی ہیں اور فخر سے پڑھتی ہیں، بعض معتبر شعراء اُن کی سرپرستی فرماتے ہیں۔ پچھلے بیس پچیس برسوں میں کئی شاعرات مشاعروں کی دنیا میں

آئیں اور غائب ہو گئیں کیونکہ ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہ تھا، ایک طرف تو آدا جعفری، پروین شاکر اور کشور ناہید جیسی شاعرات ہیں جو اپنی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کروا چکی ہیں اور دوسری طرف یہ شاعرات ہیں جنہیں لوگ صرف ''تفریح کا سامان'' سمجھتے ہیں......''!

میں نے اپنی ڈائری میں محترمہ نفیس بانو شمع کے خیالات قلم بند تو کئے لیکن کیا آپ بھی ان کے خیالات سے متفق ہیں......ذرا سوچئے تو!!

(ماخوذ۔ بند کمرے کی کھڑکی سے)

..........●●●..........

نور شاہ کی تخلیقات کے حوالے سے

فلک رنگ تاثرات

پروفیسر عبدالقادر سروری

کشمیر کے افسانہ نگاروں میں جنہیں افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔ نور شاہ بہت نمایاں ہیں، ادب اور افسانہ نگاری کا شوق اُنہیں بچپن سے ہی رہا۔ نور شاہ کو کہانیاں لکھنے کا نہ صرف ذوق ہے بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے۔ انہوں نے سینکڑوں کردار پیدا کئے۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں کی طرح اُنہیں مظلوم اور مفلوک انسانوں سے ہمدردی ہے کشمیری عوام کی زندگی اُن کے جذبات، اُن کے رنج وغم، ان کے مسرتوں، تمناؤں اور خواہشات کے کتنے ہی مرقعے ان کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ فرائڈ کے جنسی نظریئے سے وہ متاثر ہیں اور جنسی جذبات کو پیش کرنے میں اُنہیں دلچسپی ہوتی ہے تاہم وہ کھل کر کہنے سے ہچکچاتے ہیں، اس لئے انہیں اکثر بیان کے پیچ وخم کی راہ اختیار کرنا پڑی ہے نور کو کہانی لکھنے پر اتنی دسترس حاصل ہوگئی ہے کہ وہ تکنیک بدل بدل کر لکھتے ہیں۔

......● ......

علی جوار زیدی

نور شاہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ افسانے ذہن میں نہیں بلکہ زندگی کی کھردری سطح پر بکھرے پڑے ہیں، ان کو سلیقے سے چننا اور ضاعی سے واقعات اور محسوسات کو ایک قصے کی روپ میں پیش کرنا نور شاہ کو خوب آتا ہے۔

......● ......

اعجاز صدیقی (ممبئی)

نور شاہ کی تحریروں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔ انداز بیان میں جو شگفتگی رچاؤ اور موسیقی ہے وہ تو کچھ حیات پرور پہاڑی وادیوں کی عظمت و جلال کی دین ہیں اور کچھ اپنے ماحول اور طبقے کی رہین منت۔ نور شاہ بطور کہانی کار مقبول و معروف ہیں۔ نور شاہ کی تحریروں میں شعور و فکر کی اکثر مثالیں ملتی ہیں، زبان اور اسلوب فنکارانہ اور شاعرانہ ہے۔

(ماہنامہ شاعر ممبئی کے ناولٹ نمبر میں شائع ناولٹ ''آؤ سو جائیں'' سے)

...... ● ......

راما نند ساگر (ممبئی)

نور شاہ کی کہانیوں میں ایک ایسی افسانویت ہے جو آج کے افسانوں میں مشکل سے ہی ملتی ہے۔ افسانویت کے علاوہ جس چیز نے متاثر کیا وہ زبان کی سلاست ہے اور وہ انداز بیان جو افسانوں کے لئے موزوں ہے۔

...... ● ......

شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

آپ افسانے خوب لکھتے ہیں، کیا اچھا ہو کہ آپ اپنی محنت اسی صنف پر صرف کریں۔

(شب خون میں شائع افسانوں کے تعلق سے)

...... ● ......

ڈاکٹر برج پریمی (سرینگر)

نور شاہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں، اُن کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس قزح کے رنگ آگئے ہیں اور اسی خصوصیت نے نور شاہ کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی نور شاہ افسانہ بننے کے گر سے بھی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی نور شاہ کی کہانیوں میں صاف نظر آتا ہے۔

......● ......

کیول سوری (دہلی)

نور شاہ کی کہانیاں اُس کے اندر پوشیدہ کہانی کار کی جمالیاتی حِس کو بڑے پُر اثر انداز سے اُجاگر کرتی ہیں۔

......● ......

علی محمد لون (سرینگر)

نور شاہ کی اپنی زندگی اُس کے چہرے کے خدوخال کی طرح ہموار رہی ہے لیکن اُس کی تخلیقات میں بڑے نشیب وفراز ہیں۔ وہ خود شاید جن حالات، ذہنی کیفیات اور انسانی نفسیات کی بھول بھلیوں سے نہیں گزرا اُن سے اپنے کرداروں کو دوچار کر کے معیاری ادب کی تخلیق کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ آغاز خوب ہے اور انجام خوب تر ہونے کی بہت سی توقعات۔

......● ......

رام لعل (لکھنو)

ہر تخلیق میں فن کار کا دل دھڑکتا ہے، اس کی اپنی سانسیں ہوتی ہیں۔ اُس کے اپنے جذبات واحساسات اور جب تخلیق مکمل ہو جاتی ہے تو لوگ اسے اپنے ہی احساسات کا آئینہ کہنے لگتے ہیں اس سے فنکار کی کامیابی کا ثبوت ملتا ہے اور اس کے فن کی ایک نئی سمت معین ہونے لگتی ہے۔ نور شاہ کے قلم سے نکلے ہوئے جواہر پارے دیکھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ اُن کا فن دریا کے ایک نئے دھارے کی طرح اپنا راستہ خود بناتا ہوا دھیرے دھیرے اُس سمندر کی جانب بڑھ رہا ہے جسے ''ادب'' کہتے ہیں۔

......● ......

محترمہ چاندنی (لکھنو)

کشمیر کو دنیا کی جنت کہا گیا ہے، جنت کا احساس کرتے وقت ہم اپنے آپ کو ایک خوبصورت ترین دنیا میں پاتے ہیں۔ نور شاہ کا تعلق کشمیر سے ہے اس لئے انہوں نے اپنی کہانیوں میں ایک جنت کا احساس دلایا ہے۔ نور شاہ کی کہانیوں میں ہمیں جمالیاتی احساس کی بلندیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں جس خوبصورتی سے قدرت کے رنگوں کی آمیزش کر کے حسین اور شاہکار تصویروں کی تخلیق کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی کہانیوں میں ایک طرف چنار و کا وقار، ڈل کی خاموشی اور وادی کی وسعت ہے تو دوسری طرف انہوں نے بڑی مہارت سے جذبات کی عکاسی بھی کی ہے۔ کہانیوں اور افسانوں کی دنیا میں لوگ اپنا مقام بناتے ہیں مگر نور شاہ نے اپنے طرزِ بیان اور اندازِ تحریر سے ایک نئی دنیا بنائی ہے۔ اور یہ دنیا...... بے شک جنت سے کم نہیں۔

......● ......

ویدر راہی (ممبئی)

تمہاری کھڑکی سے جتنا آسمان نظر آرہا ہے اُس میں تمہارے کردار کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، تم بنیادی طور پر کس قدر حساس ہو یہ صاف نظر آرہا ہے جو کچھ تمہارے آس پاس ہو رہا ہے تمہاری نظروں سے بچ نہیں پایا۔ اچھی باتوں کی پذیرائی اور بے انصافی کے خلاف احتجاج بھی ہے۔

......● ......

بشیر شاہ (سرینگر)

نور شاہ کی ڈائری کے اوراق بے حد دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔

......● ......

عمر مجید (سرینگر)

بند کمرے کی کھڑکی برصغیر کی ادبی دنیا کے لئے ایک نئی چیز ہے۔

......● ......

ابنِ اسماعیل (سرینگر)

نور شاہ کی شخصیت کسی بھی تکبر اور انانیت سے دور ہے اور یہی شئے اُن کو نہ صرف اپنے ساتھیوں میں مقبول بنائے ہوئے ہے بلکہ ان کے دشمن بھی اس خوبی کے معترف ہیں شخصیت کا یہ رُخ ان کی تحریروں کو ایک وقار بخشتا ہے۔ ان کی ہر تحریر انسانی، ہمدردی اور درد مندی سے مملو ہوتی ہے۔

......● ......

سلیم سالک (سرینگر)

اکثر تخلیق کاروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ لکھتے لکھتے اُوب جاتے ہیں یا ہوا کا رُخ دیکھ کے بدلتے ہیں۔اس کے برعکس نور شاہ پانچ دہائیوں سے مسلسل اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے تخلیقی سوتوں کو خشک ہونے کی بجائے رومان پرور اور معطر زینت سے سیراب کررکھا ہے اور اپنے ہی مسلک و مذہب پر قائم ودائم رہے۔

...... ● ......

وریندر پٹواری (مصر)

میں سمجھتا ہوں کہ میں خود پر کیوں نہ ناز کروں کیونکہ میں شوق سے نور شاہ کی کہانیوں کو پڑھتا ہوں اور فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اُن کو سمجھتا ہوں۔نور شاہ واقعی کہانیوں کے شہنشاہ ہیں۔

...... ● ......

طارق کابلی (سرینگر)

کتابی عنوان کے حروف قارئیں کو ''ہستی سے نیستی'' کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں سرورق کے لئے رنگوں کا انتخاب خوب ہے نارنجی، سیاہ اور نیلا تینوں رنگ ہستی سے نیستی کے سفر کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ان رنگوں کے پس منظر میں گزشتہ ایام کی کوئی پرائی اور خستہ عمارت کے آثار نظر آتے ہیں اور بوسیدہ عمارت کی سیڑھیاں ایک دروازے کی طرف جاتی ہیں جو نیلے آسمان کی بلندیوں میں پیوست ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کے بعد صرف ایک خلا......زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے...... 'کہاں گئے یہ لوگ سے

...... ● ......

ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر)

جن شخصیات پر قلم اُٹھایا گیا ہے کہاں گئے یہ لوگ میں اُن کے تعلق سے اور باتوں کے علاوہ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ قاری کو کسی شخصیت کی زندگی سے متعلق بنیادی معلومات کے ساتھ ساتھ اُس شخصیت کے فکری وفنی کارگزاری کے تعلق سے بھی مفید جانکاری حاصل ہوتی ہے۔

......● ......

ڈاکٹر پریمی رومانی (جموں)

نورشاہ کی کہانیاں دراصل کشمیر کی کہانیاں ہیں جن میں نہ صرف یہاں کا حسن اور خوبصورتی اُمڈ آئی ہے بلکہ انہوں نے جس خوبصورتی کے ساتھ یہاں کے عوام کے رستے ہوئے درد کا مداوا کیا ہے اس کی داد نہ دینا کورِ ذوقی ہوگی۔

......● ......

ڈاکٹر فرید پربتی (سرینگر)

نورشاہ اردو کے موجودہ ادبی منظرنامے پر گہرے مشاہدات اور پُر اسلوب بیان کے بل بوتے پر توانا اور زندگی آمیز تخلیقات پیش کرنیوالوں میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں وہ جس طرح اپنے افسانوں میں تسلسل اور ترتیب کا خیال رکھتے ہیں اُسی شگفتگی بیان کا بھی بھرپور اہتمام کرتے ہیں۔

......● ......

موہن یاور (جموں)

نورشاہ سراپا نور ہے اور دل کا شاہ یہی وجہ ہے کہ نور کی تحریر میں خلوص کی چاشنی، انسان دوستی کی خوشبو اور کسک پائی جاتی ہے۔ دراصل ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا فن کار ہو سکتا ہے، نور شاہ کی تخلیقات اس لئے جاندار ہوتی ہیں کیونکہ وہ بذاتِ خود ایک اچھا دوست ہے، اچھا محسن ہے، اچھا انسان ہے۔

نور وقت کا عکاس ہے۔ جو دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے یا جو سوچتا ہے سمجھتا ہے۔ اُسے اپنے سیدھے سادھے مگر خوبصورت ڈھنگ سے پیش کر دیتا ہے کہ قاری اس کی تحریر میں ڈوب جاتا ہے اور اُس کے فن کا قائل ہو جاتا ہے۔

نور کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی آپ کی، سب کی کہانیاں لکھتا ہے۔



ڈاکٹر اقبال مہدی (دہلی)

میں نے بند کمرے کی کھڑکی اس طرح کھولی کہ صبح ہوگئی اور کھڑکی کھلی ہی رہی جس خوبصورتی سے آپ نے اپنی ڈائری میں کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کا احاطہ کیا ہے ایک صرف آپ نے کشمیر میں ادب کے لئے بہت اچھا کام کیا ہے بلکہ تمام برصغیر کے سامنے ایک کامیاب تقریر پیش کی ہے۔ یہ کتاب کوئی مقالہ نہیں بلکہ ایک حوالہ ہے ان نوجوانوں کے لئے کہ وہ آگے بڑھیں اور مقالے زعفران میں قلم ڈبو کر تحریر کریں۔



عبدالرحمٰن مخلص (کشمیر)

ادبی ڈائریک لکھنا ایک فن ہے۔اس قسم کی ڈائریاں ماضی کو مجسم کر کے سامنے لا کھڑی کر دیتی ہے۔ جب میں نے نور شاہ کی ادبی ڈائری بند کمرے کی کھڑکی پڑھی تو میں جیسے جوان ہو گیا کیونکہ میرا ماضی مجسم ہو کر میرے سامنے رقص کرنے لگا۔

......●......

جاوید رحمانی (دہلی)

آپ کی کتاب ''بند کمرے کی کھڑکی میرے لئے ایک عجیب تجربے سے کم نہیں، خصوصاً اس نے کہ اس میں وادی کا حسین ماضی قدم قدم جانکتا ہے۔

......●......

عرش صہبانی (جموں

زندگی بذاتِ خود ایک ڈائری ہے جو اپنے اندر مختلف نوعیت کے اوراق سمیٹے ہوئے ہے جن پر کئی رنگ کے واقعات اور حادثات منقش ہوتے ہیں اور جب نور شاہ جیسا کوئی ذی شعور انسان انہیں قارئین تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے تو یہ واقعات اور حادثات صرف ذہنی آسودگی کا باعث نہیں بنتے بلکہ معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور دل میں خواہش رہتی ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔!

......●......

راجہ نذر بونیاری (کشمیر)

آپ کی ڈائری ایک ادبی وتاریخی داستان ہے، مجھے آپ کی یادیں اپنی یادیں لگتی ہیں۔

......●......

اشرف عادل (کشمیر)

قلم سے لڑ رہا ہوں جنگ کرتی
میرے ہاتھوں میں خنجر بولتا ہے

...... ● ......

وحید مسافر (کشمیر)

بند کمرے کی کھڑکی سے متاثر ہو کر

حد برادر تفکر کی بلندی جس نے پائی ہو
انتظار کی تخلیق میں محنت نہیں لگتی

...... ● ......

مبشر رفاعی

ڈائری کے اوراق پڑھ کر روح کو غذا فراہم ہوتی ہے۔

پڑا ہے جب سے تیرا عکس اس میں
یہ آئینہ سنوارتا جا رہا ہے......!

...... ● ......

عشاق کشتواڑی

نور شاہ کی ڈائری ماشاء اللہ تواریخی نوعیت کا درجہ رکھتی ہے۔

...... ● ......

خورشید عالم خان (کشمیر)

ڈائری کے اوراق پر مشتمل ''بند کمرے کی کھڑکی'' کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اشارہ اپنی زندگی کی بجائے دوسروں کو متعارف کراتے ہیں۔ ادیبوں ، فنکاروں اور دوستوں کو اپنی ڈائری میں جگہ دے کر ادب شناسی اور دوستی کا حق ادا کیا ہے لیکن ادباء اور فنکاروں کا انتخاب بھی خوب ہے۔

...... ● ......

NOOR SHAH: FIKR AUR FICTION



مرتب ایک نظر میں

نام : محمد اقبال لون

ولدیت : بشیر احمد لون

پیدائش : رڈبوگ، کپواڑہ، کشمیر

تعلیم : ایم۔اے (اردو)، بی۔ایڈ، ایم۔فل، نیٹ

مشغلہ : تحقیق و تصنیف

مجلس ادارت: ماہنامہ، شیرازہ اُردو......جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی سرینگر

کتابیں :

(۱) فرید پربتی کے شخصی اور ادبی جہات

(۲) نقدِ میر (شعر شور انگیز کے حوالے سے)

(۳) نورشاہ......فکر اور فکشن

زیرِ طبع :

(۱) تفہیم و تعبیر (تحقیقی و تنقیدی مضامین)

سکونت : ۲۱۷، آزاد پورہ، رڈبوگ، کپواڑہ، کشمیر ۱۹۳۲۲۱

ای میل : iqbal.lone93@gmail.com

فون نمبرات : 8803059015, 9419892796



MEEZAN PUBLISHERS & DISTRIBUTORS

Opposite Fire & Emergency Services, Hqrs, Batamaloo, Srinagar, Kmr- 190009

Ph: 0194-2457215, Cell: 9419002212 E-mail:meezanpublishers@gmail.com